نذر سجاد اور ان کے معاصر مرد ناول نگار: اصلاحِ نسواں کے تصورات کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی (اردو)

مقالہ نگار

کوثر پروین

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر، ۲۰۲۳ء

نذر سجاد اور ان کے معاصر مرد ناول نگار: اصلاحِ نسواں کے تصورات کا تقابلی مطالعہ

مقالہ نگار

کوثر پروین

یہ مقالہ

پی۔ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ،۲۰۲۳ء

© کوثر پروین

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: نذر سجاد اور ان کے معاصر مرد ناول نگار: اصلاحِ نسواں کے تصورات کا تقابلی مطالعہ

پیش کار: کوثر پروین رجسٹریشن نمبر: 764/PhD/Urd/F18

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر شفیق انجم ______________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی، ہلال امتیاز (ملٹری) ______________

ریکٹر

تاریخ ______________

اقرار نامہ

میں، کوثر پروین حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی کام ہے۔اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد کی پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

کوثر پروین

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہارِ تشکر	viii
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	**۱**
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۱
ii. بیان مسئلہ	۲
iii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۳
iv. تحقیق کی اہمیت	۳
v. تحدید	۳
vi. مقاصد تحقیق	۴
vii. تحقیقی سوالات	۴
viii. نظری دائرہ کار	۴
ix. پس منظری مطالعہ	۵
x. تحقیقی طریقہ کار	۶
ب۔ عہدِ نذر سجاد میں اصلاح نسواں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظرات	۷

ج۔ نذر سجاد سے قبل اصلاحِ نسواں کی ادبی اور سماجی، سیاسی جہات: پس منظری مطالعہ (ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے خصوصی حوالے سے) ۲۷

حوالہ جات ۴۹

باب دوم: نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں کا تصور: خواتین کی تعلیم کے تناظر میں تقابلی مطالعہ ۵۱

الف۔ خواتین کا حق تعلیم اور ناولوں میں اس کے اظہار کی مختلف صورتیں ۵۱

ب۔ روایتی تعلیم اور اس کے اثرات سے متعلق کہانیاں اور کردار ۵۳

ج۔ جدید تعلیم اور اس کے اثرات سے متعلق کہانیاں اور کردار (بحوالہ ناول: اختر النساء' نجمہ' صبح زندگی' اختری بیگم) ۵۶

حوالہ جات ۷۱

باب سوم: نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں کا تصور: خواتین کی اخلاقی تربیت کے تناظر میں تقابلی مطالعہ ۷۲

الف۔ خواتین کی اخلاقی تربیت اور 'سگھڑ' و 'پھوہڑ' کی اخلاقی جہات ۷۲

ب۔ ناولوں میں خواتین کی اخلاقی تربیت کے پہلو: بیانات، واقعات اور کردار ۷۵

ج۔ اچھے اور برے اخلاق کی وضاحتیں اور صورتحال اور امثلہ (بحوالہ ناول: اختر النساء، آہ مظلوماں، شام زندگی، خواب ہستی، بیوہ، حرماں نصیب اور مذہب و عشق) ۱۰۹

حوالہ جات ۱۲۳

باب چہارم: نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں کا تصور: خواتین کے سماجی کردار کے تناظر میں تقابلی مطالعہ ۱۲۵

الف۔ خواتین کے سماجی کردار کی بحثیں اور ناولوں میں پیش کردہ موقف ۱۲۵

ب۔ روایتی سماج اور خواتین کی سماجی حیثیت و کردار ۱۲۷

ج۔ جدید سماج اور خواتین کی سماجی حیثیت و کردار (بحوالہ ناول: جاں باز، ثریا، شامِ ۱۳۴

زندگی، یاسمین)

حوالہ جات ۱۵۹

باب پنجم: ماحصل / نتائج / سفارشات ۱۶۰

الف۔ماحصل ۱۶۰

ب۔نتائج ۱۶۸

ج۔سفارشات ۱۸۰

کتابیات ۱۸۲

ABSTRACT

Title: **Nazar Sajjad and her contemporary male novelists: Comparitive study of concepts about reform feminism**

The present study is about the comparative analysis of Nazar Sajjad and her contemporary male noveliests. The researcher finds the "Reform feminism" which is an important theme that has been effectively presented in Urdu novels. It involves striving to improve women's rights and opportunities while eliminating gender and social disparities. In present novels, reform feminism is portrayed in various ways. In the present study the researcher tries to find the significance of novels to prominent the women's rights in patriarchal society. These novels typically grant women a constant status, giving them the right to intellectual and physical development. They encompass different aspects of women's lives, such as careers, education, and independence. The principles of reform feminism are presented powerfully through impactful stories in these Urdu novels. These stories are highly influential and effectively highlight the value of women's rights and the path toward social change. These Urdu novels are a significant part of advocating for women's rights and improving their opportunities in society. Nazar Sajjad, as an Urdu novelist, has also explored the theme of reform feminism in his works. In his novels,"Akhtar un nisa begam","Najma", Hurman naseeb","Aah e mazlooman", Surayyah" and mazhab o ishq" she often delves into the struggles, aspirations, and empowerment of women in society. Haider's storytelling often portrays women as strong, independent characters who challenge traditional gender roles and norms. Through her narratives, she highlights the importance of women's education, their right to make choices, and the need for gender equality. The researcher realizes that Nazar Sajjad's novels serve as a medium to advocate for women's rights and emphasize the significance of reform feminism in contemporary society. His works contribute to the ongoing discourse on gender equality. In this study Male Urdu novelists also contribute in the discussion of reform feminism by addressing issues such as women's education, their rights to make choices, and the need for social and economic changes to promote gender equality. Through their storytelling, the researcher did textual analysis. Her aim is to notify the awareness about gender discrimination and the importance of women's empowerment in Pakistani and South Asian societies portrayed by Pakistani. Some notable male Urdu novelists who have touched upon the theme of reform feminism in their works include Deputy Nazeer Ahmad,mirza Hadi ruswa,Rashid Alkhyri ,Mirza Muhammad saeed"and Prem chand who explored gender dynamics and women's issues in his novels and short stories. Rashid alkhyri has collaborated with male authors to co-write novels that address women's rights and societal challenges. The researcher finds the similarities and dissimilarities in their novels by doing comparative analysis of the text. The textual analysis is done by doing line by line analysis of the text. The data is being collected from different books and from multiples research articles. After doing study, the researcher found the author's collaboration to prominent the inequality of women in society. Women not only deprived from social and political but also from domestic rights. The researcher did the comparative analysis to find the contribution of different authors on similar issue. The researcher observed that every author tried hard to enhance forfeiture of women in society

اظہارِ تشکر

میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے گھریلو اور پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ اس قابل بنایا کہ تحقیق کا سفر مکمل کر سکوں۔ اپنے والدین خصوصاً والدہ کی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں سے زندگی کے تمام مشکل مراحل کی طرح تحقیق و جستجو کا یہ سفر مکمل ہوا۔ ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان، صدر شعبہ اردو اور میرے نگران مقالہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر شفیق انجم صاحب جن کا رویہ بحیثیت استاد اور بحیثیت نگران مقالہ ہمارے ساتھ نہایت مشفقانہ تھا۔ ان کے اسی شفیق رویے کے باعث تحقیقی سفر نہ صرف آسان ہوا بلکہ ان کے مفید مشوروں اور رہنمائی کی وجہ سے نہایت احسن طریقے سے پایہ تکمیل کو پہنچا۔ فراہمی کتب و مواد سے لے کر اخلاقی حوصلہ افزائی سے ہر قدم میرا ساتھ دیا، اللہ انھیں اس کارِ خیر کا اجر عطا فرمائے۔ آمین!

شعبہ اردو کے دیگر تمام اساتذہ کرام کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالے کے لیے مطلوبہ مواد کی فراہمی میں میری مدد کی۔ اس کے علاوہ اس تحقیقی کام میں میرے معاون پروفیسر ڈاکٹر امین الدین کی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنے نجی کتب خانے سے مواد کی فراہمی کو ممکن بنایا اور نہایت مفید مشورے بھی دیے۔ میونسپل لائبریری ڈیرہ غازی خان کے لائبریرین محمد فاروق سکھانی نے بھی تحقیقی مواد کی دستیابی کے لیے کھلے دل سے تعاون کیا۔ میں اپنے اہلِ خانہ کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالہ نگاری کے لیے پُر سکون ماحول اور بھرپور تعاون کیا۔

کوثر پروین

سکالر پی ایچ۔ ڈی

باب اول:

موضوع کا تعارف: بنیادی مباحث

الف۔ تمہید:

i۔ موضوع کا تعارف:

نذر سجاد کا شمار اردو کی اولین خواتین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے تخلیقی سفر کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں اس وقت ہوا جب برصغیر پاک و ہند مختلف قسم کی تہذیبی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تبدیلیوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تبدیلی کی یہ تحریک پرانی تہذیبی، تمدنی، سماجی اور اخلاقی اقدار کے نقوش مٹا کر ایک جدید و روشن خیال تہذیبی اور سماجی ڈھانچے کی بنیادیں استوار کرنے میں سرگرم عمل تھی۔ اصلاح نسواں اور آزادی نسواں کی جدوجہد اور اس جدید و روشن خیال سماجی ڈھانچے میں خواتین قلم کاروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن میں ایک اہم نمایاں نام نذر سجاد حیدر کا بھی ہے جنھوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کے سماجی مزاج کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے قلم و قرطاس کے محاذ پر قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ بطور خاص انھوں نے خواتین کی تعلیم، اخلاقی تربیت اور سماجی کردار کو پیش نظر رکھا اور حصول مقصد کے لیے مضامین و کہانیوں کے علاوہ کئی ناول بھی سپرد قلم کیے۔ نذر سجاد کی روشن خیالی، جدت پسندی اور بے باکی نے نہ صرف ان کی تحریروں کو اردو خواں طبقے میں پذیرائی بخشی بلکہ تاریخ میں بھی ان کو خاص اہمیت عطا کی۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب خواتین کے لیے اپنے حقیقی ناموں کے ساتھ قلم و قرطاس سے وآبستہ ہونا ثقافتی اعتبار سے ممنوع تھا۔ خواتین کی تعلیم، اخلاقی تربیت اور سماجی کردار کے حوالے سے اُس زمانے میں علامہ راشد الخیری، مرزا ہادی رسوا، مرزا محمد سعید اور پریم چند نے بھی کہانیاں لکھیں۔ لیکن روشن خیالی کی جو تحریک "مخزن" سے شروع ہوئی اور جو خواتین اس سے وابستہ ہوئیں، ان کا انداز مختلف تھا۔ اسی طرح محمدی بیگم کے رسالے "تہذیبِ نسواں" کا کردار ناقابلِ فراموش ہے، نذر سجاد حیدر نے اولاً انھی رسالوں کے ذریعے اپنی پہچان بنائی اور بنت نذر الباقر کے فرضی نام سے کہانیاں لکھیں۔ بعد میں ان کی شادی سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ ہوئی تو وہ نذر سجاد حیدر کے نام سے لکھتی رہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنی والدہ کے لکھے ان ناولوں کو از سرِ نو مرتب کر کے شائع کرایا ہے۔ ان ناولوں کی تفصل یہ ہے:

۱۔ اختر النسا : ۱۹۱۰

۲- آہ مظلوماں :۱۹۱۱ء

۳۔ جاں باز : ۱۹۱۹ء

۴۔ ثریا: ۱۹۳۰ ء

۵- مذہب اور عشق: ۱۹۳۵ء

۶۔ حرماں نصیب :۱۹۳۸

۷۔ نجمہ: ۱۹۴۲

زیر نظر تحقیق میں نذر سجاد کے ان ناولوں میں پیش کردہ اصلاح نسواں کے تصور اور اس دور کے مرد ناول نگاروں کے ناولوں میں پیش کردہ اصلاحِ نسواں کے تصورات کا تقابلی و تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

مرد ناول نگاروں کے نام اور ان کے ناولوں کے نام پیش خدمت ہیں:

علامہ راشد الخیری (ناول: صبح زندگی(۱۹۰۹ء)۔شام زندگی(۱۹۱۸ء)

مرزاہادی رسوا(ناول: ذات شریف(۱۹۰۱)،اختری بیگم (۱۹۲۴)

مرزا محمد سعید (خواب ہستی(۱۹۰۵ء)- یاسمین(۱۹۳۵ء)

پریم چند(بیوہ(۱۹۲۲ء)۔نرملا(۱۹۲۹ء)۔

ii۔بیان مسئلہ:

نذر سجاد اصلاح نسواں کے حوالے سے خواتین قلم کاروں میں ایک معتبر نام ہے۔عورت کے معاشی، مذہبی اور سماجی حقوق کا بیان ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع ہے انھوں نے اپنے ناولوں میں اس دور کی متوسط طبقہ عورت کی زندگی کے ان پہلوؤں کی بخوبی عکاسی کی ہے۔نذر سجاد حیدر نے اپنے ناولوں میں مذہب کی آڑ میں عورت کا استحصال کرنے والوں کو للکارنے ،عورت کی فلاح و بہبود کے لیے آواز اٹھانے ، خواتین کو معاشی و معاشرتی و تعلیمی سرگرمی میں حصہ لینے اور منازل طے کرنے پر انگیخت کیا ہے۔

نذر سجاد کی ان گراں قدر خدمات اور ان کے سماجی و معاشرتی اثرات کے تجزیہ کی ضرورت تھی تاکہ واضح ہو کہ اس مقصد میں وہ کس حد تک کامیاب ہوئی ہیں،اور بیسویں صدی کے اوائل میں اصلاح نسواں کی تحریک پر ان کی قلمی جدوجہد کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔نیز یہ کہ ان کے معاصر لکھنے والوں کے ہاں یہ موضوعات کس انداز سے پیش ہوئے ہیں اور ان میں اختلافات واشتراکات کی نوعیت کیا ہے۔

iii۔زیر تحقیق موضوع پر ما قبل تحقیق:

نذر سجاد کو اردو کی روشن خیال اور جدت پسند ناول نگار کے طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ناول نگاری میں ان کی خدمات کے حوالے سے متعدد مصنفین نے اپنی تصانیف میں ان کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر بعض نے اختصار کے ساتھ اور بعض نے قدرے طوالت سے اظہار خیال کیا ہے مثلاً نیلم فرزانہ نے اپنی کتاب "اردو ادب کی خواتین ناول نگار" جب کہ " پاکستانی ادبیات میں خواتین کے کردار" مطبوعہ علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی میں نذر سجاد حیدر کی ناول نگاری و دیگر ادبی خدمات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے نذر سجاد کے ناولوں کو مرتب کرتے وقت ایک طویل و مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ البتہ جامعاتی سطح پر ان کے ناولوں پر کوئی تحقیقی مقالہ نہیں لکھا گیا۔ ان کے ناولوں کا اُس دور کے مرد ناول نگاروں کے ناولوں کے ساتھ تقابل پر یہ اولین تحقیقی کام ہو گا۔

iv۔ تحقیق کی اہمیت:

نذر سجاد نے اپنے ناولوں میں ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کی ہے جس پر صدیوں سے مردوں کی اجارہ داری تھی ۔انھوں نے اس سماجی پس منظر کے حامل معاشرے میں جینے والی عورت کی مذہبی، تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور معاشی حیثیت کی تصویر کشی کی ہے ۔انھوں نے اس سماج میں پھیلی جہالت، توہمات پرستی اور غلط رسم ورواج کی بھینٹ چڑھتی عورت کے جذبات و احساسات کی جس انداز سے ترجمانی کی ہے اس نے بیداری شعور نسواں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔نذر سجاد نے اپنے ناولوں میں نہ صرف ان معاشرتی و سماجی برائیوں کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان کے سدِباب کے لیے مناسب حل بھی تجویز کیے ہیں۔اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اصلاح نسواں کے تناظر میں اس روشن خیال اور جدت پسند ادیبہ کی قلمی کاوشوں اور معاشرے پر اس کے اثرات کا تجزیہ اس کے ناولوں کی روشنی میں اور ان کے معاصر مرد ناولوں کے تقابل کے ساتھ کیا جائے۔ زیر نظر مقالہ ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے ایک تحقیقی کاوش ہے۔

v۔ تحدید:

زیر نظر تحقیق نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں اصلاح نسواں کے تناظر میں کی گئی کاوشوں کے تجزیاتی و تقابلی مطالعہ پر مشتمل ہے جس میں نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے موضوع سے متعلق ناولوں کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان ناولوں کی فہرست تعارف میں درج کی گئی ہے۔ فہرست میں شامل ان ناولوں کے علاوہ

منتخب مصنفین کی دیگر تحریریں اور ان کی ادبی خدمات مقالہ ہذا کی تحقیقی حدود سے باہر ہوں گی۔

vi۔ مقاصد تحقیق:

۱۔ نذر سجاد حیدر کے عہد میں اصلاح نسواں کے سماجی تناظرات کو زیرِ بحث لانا۔

۲۔ نذر سجاد حیدر اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاح نسواں کے تصور کی مختلف جہات [تعلیم، اخلاقی تربیت اور سماجی کردار] کا تجزیہ و تقابل کرنا۔

۳۔ اصلاحِ نسواں کے حوالے سے نذر سجاد حیدر کی ناول نگاری کے اختصاصی پہلوؤں کو زیر بحث لانا ۔

vii۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ نذر سجاد کے عہد میں اصلاح نسواں کی تحریک کے سماجی تناظرات کی نوعیت کیا تھی ؟

۲۔ نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں خواتین کی تعلیم ، اخلاقی تربیت اور سماجی کردار تقابلی مطالعہ ؟

۳۔ نذر سجاد کے ناولوں میں اصلاح نسواں کے تصور کے اختصاصی زاویے کیا ہے ؟

viii۔ نظری دائرہ کار:

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں متحدہ ہندوستان میں ایک بڑی بحث یہ رہی ہے کہ ترقی یافتہ قوموں بہ طور خاص حاکم قوم انگریز کی طرح مہذب کیسے بنا جائے۔ سر سید نے تو 'تہذیب الاخلاق' کے پہلے پرچے کی تمہید میں واضح طور پر لکھا کہ: "اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کے سولزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں"۔ اس نقطہ نظر سے جڑی تحریک علی گڑھ کی پوری ایک تاریخ ہے۔ یہ موقف بیسویں صدی میں بھی مختلف جہتوں پھلتا پھولتا اور سماج کی کایا کلپ میں اپنا کردار ادا کرتا رہا۔ مہذب بننے کی اسی بحث کا ایک رخ خواتین کی اصلاح کے متعلق ہے۔ سر سید اگرچہ خود سے خواتین کی تعلیم کے لیے سرگرم نہیں تھے لیکن انہوں نے اصلاح و بہبود نسواں کی ہر کوشش کی حوصلہ افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور سے مولوی ممتاز علی نے جب خواتین کے لیے ایک رسالہ نکالنے کی تجویز پیش کی اور نام کے انتخاب کے لیے سر سید سے مدد مانگی تو انہوں نے 'تہذیب

نسواں' کو احسن سمجھا۔ محمدی بیگم کی ادارت میں اس رسالے نے خواتین کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ زیر نظر تحقیق میں عہد سر سید و مابعد اصلاح نسواں کے تصورات کی تفہیم و علمیاتی حیثیات کے تعین کے لیے سر سید کی تحریروں اور 'تہذیب نسواں' میں شائع ہونے والے مضامین کو بنیاد بنایا جائے گا۔ تاہم مردانہ معاشروں میں عورت کے تصور اور عورت کے حقوق اور اس کے سماجی کردار کے حوالے سے وسیع تر تفہیمات کے لیے جدید مباحث سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ اصلاح و بہبود نسواں کے مردانہ و نسائی تصورات کے توسیعی مطالعے کے لیے صغرا مہدی کے مضامین 'تحریک نسواں کے علمبردار' اور 'اردو ناول میں عورت کی سماجی حیثیت'، فاطمہ حسن کی مرتبہ کتاب 'فیمینزم اور ہم' ڈاکٹر صدف حسن کی کتاب 'ادب نسواں اور معاشرتی تصور' اور ڈاکٹر حمزہ سعید کی کتاب 'اردو ناولوں میں نسائی حیثیت' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

انسانی تہذیب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج کا جب وجود ہوا تو اس وقت تک معاشرتی طبقات کا کوئی تصور انسانی ذہن میں نہیں تھا مگر جیسے جیسے انسانی سماج کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے انسانوں نے مختلف کام شروع کئے۔ مگر بعد میں یہ کام کی مختلف قسموں کو سماج میں انسان کو عزت بخشنے کا ذریعہ بنایا گیا اور یوں انسانی سماج کے طبقات معین کر لیے گئے۔

انسانی سماج کے فروغ کے ساتھ ساتھ سماجی عدم مساوات بڑھتی گئی اور انسانی سماج طبقات کے اعلیٰ اور ادنی درجات میں منقسم ہو کر اپنا توازن کھونے لگا۔ تو سماجی توازن کو برقرار رکھنے کے لیے سیاست کو اپنایا گیا۔ سیاست کی ابتدا کے متعلق ٹامس باس (Thoms Hobbes) اور روسو نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ اسٹیٹ سے پہلے آوارہ مزاج کا دور دور رہ تھا جس طرح بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں اسی طرح جسمانی اعتبار سے طاقت ور اشخاص کمزوروں پر ظلم و ستم کرتے رہتے تھے۔ جیسے جیسے انسانی تہذیب کا فروغ ہوا انسان تکلفات کا عادی ہونے لگا اور ذاتی ملکیت معرض وجود میں آئی اُس نے مساوات کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ امیر اور غریب کی نہ صرف تفریق بلکہ زیر دست کشمکش شروع ہو گئی اور اس کی وجہ سے خود غرضی شروع ہوئی اب امن و چین باقی نہ رہا۔ لوگ آزادی اور مساوات کی برکتوں سے محروم ہو گئے اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے ہر شخص نے اپنی آزادی سماج کے حوالے کر دی یہ مرضیءعامہ سب لوگوں کے مشترکہ مفاد کی حفاظت کرتی تھی قانون اسی مرضی کے اظہار کا نام ہے۔

کسی بھی سماج کا عکاس اس سماج میں پروان چڑھنے والا ادب ہوتا ہے ادب کو سماج کا آئینہ کہا گیا

ہے۔ سماجی تغیرات کا اثر ادب پر لازم ہے کیونکہ ادیب بھی سماج کا حصہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ ادب سماج کے اخلاقی معیار کو برقرار رکھنے معاون ثابت ہوتا ہے۔ ادب سماج کے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے ادب سماج کا نقاد بھی ہے اور ایک روشن مستقبل کی امید بھی۔ ناول بھی ادب ہی کی ایک صنف ہے اور یہ انسانی زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر زاویے سے ایک دور کی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ۔ناول کے وسیع اور طویل کنوئس میں جس طرح زندگی اور سماج سمٹ آتا ہے۔ شاید کسی اور دوسری صنف میں اس طرح کے امکانات نہیں۔ لارنس نے بھی کہا تھا: "ناول صرف فنکار ہی نہیں بلکہ زندگی کے تجربوں کو پڑھنا ہے ایک اعلان ہے ۔ ایک اندرونی تصویر ہے ۔ مشرقی ناول نگاری میں بھی سماج اوراس کے اخلاقی، سماجی، معاشی اور ثقافتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں برصغیر کی خواتین اردو ناول نگار بھی پیش پیش رہی ہیں۔

بیسویں صدی کا آغاز برصغیر پاک وہند کے لیے نئے چیلنجز کی نوید تھا جن سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس دور کے مختلف قلم کاروں نے اپنی خدمات پیش کیں جن میں نذر سجاد پیش پیش نظر آتی ہیں۔ اولاً انھوں نے محمدی بیگم کے ساتھ مل کر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور بعد میں سجاد حیدر یلدرم کے ساتھ اپنے قلمی جہاد کو آگے بڑھایا۔ بیسویں صدی کے اوائل کے کم و بیش سب ہی ادبی پرچوں میں ان کی تحریریں شائع ہوئیں اور اپنے عہد کی خواتین کی آواز بن گئیں۔ اس مقالے میں بیسویں صدی کے اوائل کے اس منظر نامے کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نذر سجاد حیدر کے اصلاحی رویوں کو اس عہد کے مجموعی سماجی، ثقافتی اور ادبی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

x۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق کا موضوع اصلاح نسواں کے تناظر میں نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ ہے لہذا تاریخی طریقہ تحقیق کے تحت موضوع کے متعلق مطبوعات کی جمع آوری، ترتیب، مطالعہ اور تجزیہ کیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذات میں نذر سجاد حیدر کی ناول نگاری اور ان کے معاصر مرد ناول نگاروں کے ناولوں اور ان کے اسلوب و منہج اور افکار و خیالات وغیرہ کے متعلق مضامین کتب و رسائل کا مطالعہ کیا گیا ہے جن تک رسائی کے لیے لائبریری سے رجوع کے علاوہ انٹرنیٹ اور دیگر معاون ماخذات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ڈیوڈ ڈیمروش کی کتاب 'How to Study World Literature' سے رہنمائی لی گئی ہے۔ تقابل کے لیے ناولوں کے متن کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ ٹیکسٹ ٹو ٹیکسٹ تکنیک کے ذریعے متعلقہ ناولوں میں

اصلاحِ نسواں کے حوالے سے مماثلتوں اور تضادات کی وضاحت کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

ب۔ عہد نذر سجاد میں اصلاحِ نسواں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی تناظرات:

عورت انسان کی نسوانی شکل ہے جو بہت سی وجوہات اور خصوصیات کی وجہ سے انسان کے دوسرے طبقے یعنی مرد سے مختلف ہے یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشرہ اپنے ارتقائی مراحل طے کر کے بقا کی طرف رواں دواں ہے۔ اس اختلاف کی نوعیت جنسی اور صنفی دونوں طرح کی ہے، جنسی امتیاز فطری ہے جبکہ صنفی امتیاز معاشرے میں رائج اونچ نیچ کے معیارات طے کرتے ہیں۔ نازکی، کمزوری، حساسیت، شرم و حیا جیسے معاشرتی رویے عورت سے منسوب کر کے انھیں معاشرے کا طاقتور جزو بننے سے محروم کر دیا جاتا ہے، حال آنکہ مرد و عورت کے مابین صنفی اختلافات کی بنیاد پر ایک جنس کو دوسری جنس پر ترجیح دینا انصاف نہیں بلکہ زیادتی ہے۔

> "نسائیت یا فیمنزم ایک نظریاتی وابستگی بھی ہے اور ایک سیاسی تحریک بھی جو عورتوں کے لیے انصاف کے حصول اور معاشرے سے جنسی / صنفی امتیازات کے خاتمے کے لیے کوشاں ہے"(۱)

نسائیت کو زندگی کا فلسفہ یا فکری نظام کا ایک جزو بھی قرار دیا جا سکتا ہے، اسے ایک سیاسی تحریک کا عملی نمونہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام افکار و رموز کے بر خلاف اسے نہ تو کسی واحد نظریہ کی پشت پناہی حاصل ہے اور نہ ہی اس میں با قاعدہ منظم جد و جہد کا وہ تصور نظر آتا ہے جسے با قاعدہ "تحریک" کا نام دیا جا سکے، یہی وجہ ہے کی نسائیت کا ایک نجی تصور ہر فرد کے ذہن میں علیحدہ نقوش کے ساتھ ابھرتا ہے۔ غرض عورت تصور سے حقیقت تک افراط و تفریط کا شکار رہی ہے وہ حسن کی دیوی بنی اور دیوتاؤں کا مرکز نگاہ رہی۔ محبوبہ، ماں، بہن، بیٹی اور بیوی بنی اس کے ساتھ ساتھ کنیز، لونڈی اور طوائف بنی۔ اس تمام حیثیت اور اہمیت کے باوجود مجموعی طور پر اس کا استحصال کیا جاتا رہا اور ظلم و جبر کا شکار ہو کر اسے مرد کے قدموں پر نفرت اور حقارت کا نشانہ بننا پڑا۔

ڈاکٹر عقیلہ جاوید لکھتی ہیں:

> "عورت دنیا کا قدیم ترین اختلافی موضوع ہے۔ بائبل کی "حوا" اور یونانی اساطیر کی "پنڈورا" سے آج تک متعدد تہذیبوں، مذاہب اور اقوام نے جنم لیا اور اپنے انجام کو پہنچیں لیکن ہر عہد میں مصلحین، مفکرین، مبلغین اور ناقدین نے عورت ذات پر

لکھا لیکن عورت ایک نہ سمجھ آنے والی حقیقت ہے، ایسی حقیقت جسے ہمیشہ تصورات
کی آنکھ سے دیکھا جاتا رہا"[۲]

عورت تصور اور حقیقت کے مابین مختلف تہذیبوں، معاشروں اور روایات میں سفر کرتی ہوئی آج کے دور میں داخل ہو کر اپنی بقاء کے لیے جو تگ و دو کر رہی ہے اس کا یہ تمام تاریخی سفر اور مختلف روپ جو معاشرے اور سماج نے اسے عطا کیئے اور وہ اصل روپ جو حقیقت میں اس کا اپنا ہے جس تک رسائی کی کوشش کی جاتی رہی اور کی جارہی ہے یہ تمام موضوعات اردو ناول کے حوالے سے لیا جاتا رہا اور اسی روشنی میں ناول نگاروں نے اپنے اپنے عہد کی عورت کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے ہاں عورت کے تصور کو دیکھنے سے پہلے تاریخ، سماج، مذہب اور ادب کے آئینے میں عورت کا تصور اور حقیقت جانچنا ضروری ہو جاتا ہے۔ آج کا انسان جس ترقی یافتہ دور میں سانس لے رہا ہے اسکے پیچھے معاشی، سیاسی، ذہنی اور تہذیبی جدوجہد کی ایک لامتناہی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ محققین کے مطابق کرہ ارض پر انسان کم و بیش پانچ لاکھ سال سے آباد ہے۔

"قدیم علمائے تاریخ نے انسانی تہذیب کے تین ادوار متعین کیے، جن میں قدیم ترین
پتھر کا عہد تھا یہ بھی تین زمانوں پر مشتمل ہے جس میں قدیم ترین دور پانچ لاکھ سال
پہلے کا ہے جب کہ پتھر کا یہ زمانہ بلکہ دورانیہ پانچ ہزار سال قبل مسیح تک قائم رہا۔ بعد
ازاں کانسی اور پھر لوہے کا عہد شروع ہوا جو آج تک جاری ہے"[۳]

تاریخ کے اس دورانیے میں کتنی تہذیبیں اور قومیں وجود میں آکر فنا ہو گئیں۔ تاریخی حوالے سے عورت کا سب سے پہلا تصور ناہید، زہرہ، دینیس اور موک سے متعلقہ دیوی عشتار کا ہے جو یہودیت، نصرانیت اور مختلف اقوام کے رسم و رواج، علم و ادب اور اخلاق و عقائد پر برس ہا برس تک شدومد سے اثر انداز رہی ہے۔ آج بھی جب کہ انسان بزعم خود تہذیب و تمدن اور بلوغت کی حدوں سے کہیں آگے نکل چکا ہے مہذب اقوام اس سے متعلقہ عقائد و رسوم کو کسی نہ کسی شکل میں سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ سات ہزار برس پہلے سومیریوں کے سیلاب عظیم (طوفان نوح کی بابلی روایت ہو یا زہرہ و مشتری طوائفوں کا اپنے حسن و صورت سے فرشتوں کا ایمان متزلزل کر کے آسمان پر چلے جانے کی پُر لطف حکایت، مادری تہذیب کی علمبردار قدیم زراعت کاروں کا مذہب ہو یا موجودہ عیسائیت اور ہندوازم عشتار کسی نہ کسی روپ میں ہر جگہ جلوہ گر ہے۔ گویا یہ اولین معبود انسانی کسی دیوتا کی بجائے ایک دیوی تھی، کوئی بائیس ہزار سال قبل عراق کے اولین آباد کاروں کے جانشین زراعت کاری اور امہاتی نظام کے ابتدائی دور سے گزر رہے تھے۔

"عورت چونکہ شروع ہی سے غذائی نباتات جمع کرتی چلی آرہی تھی اس لیے خودرو پودوں کی نگہداشت کرتے کرتے گندم کی افادیت بھی اسی نے معلوم کی اس عورت ہی کے ہاتھوں سب سے پہلے عراق میں زراعت کی ابتداء ہوئی اور عورت ہی نے انسانی زندگی میں تمدنی انقلاب برپا کر دیا چنانچہ زراعت کاری کے ساتھ ساتھ مادری تہذیب کا بھی آغاز ہوا"(۴)

اس مادری نظام میں عورت زندگی کے تقریباً تمام شعبوں پر حاوی تھی اس لیے زراعت کاروں نے اپنی تہذیب کا منبع بھی کسی غیر مرئی مونث ہستی کو قرار دیا۔ اس دور کا سادہ لوح انسان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ صرف مادہ یا مونث کے بطن ہی سے ہر ذی روح کی پیدائش کا یکساں اور لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ عورت کی سماجی بہتری نے ایک ایسی دیوی کا تصور پیش کیا۔ جس کے زیر اثر پوری کائنات تھی۔

"دنیا کی پوری دیومالا میں صرف عشتار ہی مطلق العنان اور آزاد دیوی ہے باقی جتنی بھی نامور دیویاں ہیں وہ یا تو اپنے خاوندوں کا محض پر تو تھیں یا پھر ان کو عشتار کی سی مقبولیت اور اقتدار نصیب نہ ہوا تھا"(۵)

قدیم عقائد میں عشتار یا مہاماتا کی تعریف ان لفظوں میں ہوتی ہے کہ عشتار تمام دیوتاؤں اور پوری مخلوق کی ماں ہے وہ مادر مہرباں ہے اور خالق اول۔ وہ خاتون ارض ہے اور ملکہ افلاک- بیارستان کی دیوی ہے اور کوہساروں کی رانی، ملکہ سحر اور خاتون فردوس ہے۔ قوس قزح اس کا مرصع گلوریہ ہے اور برق لہراتا کوڑا زمینوں، فضاؤں اور برف پوش پہاڑوں پر اس کی عمل داری ی علامت ہے۔ زمینوں، آسمانوں کے فیصلے وہی کرتی ہے۔ دعاؤں کو سنتی اور معروضات پر غور کرتی ہے۔ وہ غمگسار اور ہمدرد ہے۔ گناہگاروں اور بدکرداروں کو صحیح راستہ دکھاتی ہے۔ امن وامان قائم رکھے ہوئے ہے اور مسافروں کی نگہبان ہے۔ بیوی کے بارے میں سومیریوں کا تصور بہت دلکش اور اعلی وارفع ہے۔ وہ بیوی سے جن اوصاف کی توقع رکھتے ہیں اس میں اس کا دلکش، شفیق، جاذب، خوش گفتار، شستہ اور مقدس ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنسی تعلقات کے ضمن میں وہ آزاد خیال تھے۔

"جنسی تعلقات کی ایک اور نوعیت بھی تھی اس پر کوئی قدغن نہیں تھی اور وہ تھی مذہبی عصمت فروشی۔ یہ مذہبی عصمت فروشی یا مقدس حرام کاری مندروں میں ہوتی تھی"(۶)

اس کے باوجود سومیری معاشرہ جنسی کج روی کا شکار نہ تھا۔ سومیریوں کے ہاں عورت کے بارے میں نہایت اعلیٰ، پاکیزہ، شفقت سے بھرپور خاتون خانہ کا دل آویز لطیف تصور بھی موجود تھا۔ لیکن گھریلو عورت کے تقدس کی پامالی کی سزائیں سخت نہیں تھیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عورت کی بد چلنی زیادہ سنگین سمجھی جانے لگی اور اس کی پاداش میں وہ مرد کی نسبت زیادہ زیر عتاب آئی مثلاً ارنمو ہے کے قوانین کے مطابق اگر کسی شخص کی بیوی (بن سنور کر) کسی اور آدمی کے ساتھ چلی جائے اور اس کی شریک بستر ہو جائے تو وہ (حکام) اس کو قتل کر دیں گے مگر مرد کو چھوڑ دیا جائے گا۔ سومیر کی ریاست کے تیسرے سومیری شاہی خاندان (۲۰۰۴ / ۲۱۱۲ق م) کے بانی ارنمو (۲۱۱۲ / ۲۰۹۵ق م) کا جو مجموعہ قوانین ملا ہے اس سے زنا کے بارے میں سومیریوں کے انداز فکر، طرز عمل اور سزاؤں کی نوعیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ عصمت فروشی قدیم عراقیوں کے نزدیک تقدیس کا درجہ رکھتی تھی اور مندروں کی کسبی یا طوائف ہونا سومیریوں کے نزدیک کوئی ذلت آمیز یا قابل اعتراض بات نہ تھی۔ سومیری مندروں میں نہ صرف دیوداسیاں بلکہ طوائفیں بھی بڑی تعداد میں رہتی تھیں۔ یہ مقدس طوائفیں تھیں جو دراصل مندر سے وابستہ دیوداسیوں کا ہی ایک طبقہ تھیں۔

مصر میں قدیم روایات کے تحت تخت کی وارث شاہی خاندان کی عورت ہوا کرتی تھی۔ مصر میں فراعین کے عہد تک عورت ہی سلطنت کی ملکہ اور عبادت میں مہاپروہت ہوتی تھی۔ یہ نظام آج بھی بنگلہ دیش اور ہند میں آباد کھاسی قوم میں رائج ہے جہاں ماں نہ صرف خاندان کی سربراہ بلکہ جائیداد اور وراثت کی بھی مالکہ ہے۔ اگرچہ وہ وارث ہوتی تھی مگر تخت پر مرد ہی بیٹھتا تھا۔ لہٰذا خود کو جائز حکمران ثابت کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ وارث عورت سے شادی کرے، چاہے وہ اس کی بہن ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے ہر بادشاہ تخت پر بیٹھنے سے پہلے شاہی خاندان کی وارث عورت سے شادی کرتا تھا۔ اس روایت یا قانون کی وجہ سے باپ کو بیٹی یا بھائی کو بہن سے شادی کرنا پڑتی تھی۔ بادشاہ شاہی خاندان کی عورتوں کے علاوہ بھی شادیاں کرتا تھا اس لیے اس کی بیویاں شاہی خاندان والیاں" اور "غیر شاہی خاندان والیوں" میں تقسیم ہوا کرتی تھیں۔ ان بیگمات میں سے کسی ایک کو وہ خاص بیگم کا خطاب دیا کرتا تھا۔ تاریخ کی سب سے پہلی مطلق العنان ملکہ "حطشی پوط" کا تعلق بھی مصر سے تھا، جس کی شادی اپنے سوتیلے بھائی سے ہوئی تھی۔ مصر میں یہ واحد مثال ہے جس نے شوہر کے ہوتے ہوئے بھی خود حکمرانی کی۔ انیس سال تک ان دونوں میاں بیوی نے مل کر حکومت کی لیکن نااہل

شوہر کی حیثیت محض ایک نمائشی اور کٹھ پتلی کی تھی۔ عورتوں کے حقوق کا حصول اور معاشرتی ساخت میں منصفانہ تبدیلی جیسی جدوجہد کے نوعیت دو طرح کی ہو سکتی ہیں:

۱۔فکری / فلسفیانہ

۲۔حرکی / عملی

مغرب میں نسائیت کی جدوجہد کو ایک تحریک کی صورت میں "ویو کنسپٹ" کا نام دے کر پیش کیا گیا اور اس عملی جدوجہد کا اثر اردو ادب سمیت دنیا بھر کے علوم وفنون پر مرتب ہوا۔ اس جدوجہد کی تصوراتی ساخت میں تین امواج کار فرما نظر آتی ہیں۔ موج اول کا دائرہ کار انیسویں صدی کے آغاز سے بیسویں صدی عیسوی کے وسط تک پھیلا ہوا ہے۔اس عرصے میں ملازم خواتین کی مساوی اجرت، جائیداد و ملکیت کے حقوق، بطور بیوی اور ووٹ کی حقدار ہونے جیسے معاشرتی مسائل کے لیے تگ و دو کا سلسلہ نظر آتا ہے۔ موجِ دوم ۱۹۹۶ سے ۱۹۹۸ کے درمیانی عرصہ میں صورت پذیر ہوتی ہے۔اس عملی تگ و دو میں گھریلو مسائل کو سیاسی مسائل کا درجہ دیا جاتا ہے۔یہی وہ دور ہے جس میں کیرل ہاٹش نے "ذاتیات دراصل سیاسیات ہے" کا نعرہ بلند کیا تھا جس کے بعد خواتین میں اس نظریے کو ہوا دی گئی ان کے نجی امور دراصل سیاسی مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ آزادیءنسواں بھی اسی امر کی دین ہے نیز پیدائش، اولاد، تربیت اور بزرگوں کی خدمت جیسے امور کی قدر و قیمت پر سوال اٹھائے گئے۔ ۱۹۹۹ء سے عہدِ حاضر تک تیسری اور منفرد موج نے اس عملی جدوجہد کو مزید تیز کر دیا جس کا احاطہ کرنا کارِ دشوار ہے۔

دوسری جنگِ عظیم تک مغربی معاشرے میں عورت کا گھر سے تلاشِ رزق کی خاطر نکلنا ایک معیوب امر سمجھا جاتا تھا اور مجبوری کے تحت نکلنے والی عورت کو نچلے درجے کی فرد سمجھ کر کم اجرت پر رکھ لیا جاتا تھا۔اس رویے کو برداشت کرنے کے بعد بھی عورت کو مزید کمزور بنانے کے لیے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل ہمہ وقت مستعد نظر آتے تھے۔ ۱۹۴۹ میں فرانسیسی ادیبہ " سائمن ڈی بوا " کی کتاب " The Sceond Sex " منظرِ عام پر آئی تو عورت کے وجود سے متعلق کئی مباحث چھڑ گئے۔ عورت کا وجود قائم بالذات ہے یا اضافی؟ کیا مخالف صنف کی موجودگی سے اس کی صنفی اہمیت وابستہ ہے؟ نسائی وجودیت کیا ہے؟ اگر تذکیر کے بغیر تانیث کا وجود ممکن نہیں تو کیا تذکیر بھی تانیث کے وجود کی محتاج ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ عورت ہی مرد کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے جبکہ مرد کا عورت کی نسبت سے جڑنا اس کی تذلیل سے عبارت کیا

جاتا ہے؟ یہ تمام سوالات وہ ہیں جو سائمن ڈی بوا کے نظریات سے جنم لے کر جنسی اور صنفی اختلاف کو ہوا دینے میں پیش پیش رہے۔

"کبھی کبھی "نسوانی دنیا" کو مردانہ دنیا سے فرق کیا جاتا ہے لیکن ہمیں دوبارہ زور دینا ہو گا کہ عورتوں نے کبھی بھی ایک بند اور خود انحصار معاشرہ تشکیل نہیں دیا۔ وہ ایک گروپ کا لازمی جزو متشکل کرتی ہے جس پر مردوں کی حکمرانی ہے اور جس میں ان کی ماتحت حیثیت ہے۔ وہ محض اپنی یکسانیت کے امر کے تحت ایک مکینیکل یگانگت میں متحد ہیں لیکن ان میں نامیاتی اتحاد کا فقدان ہے"(۷)

عہدِ نذر سجاد سے قبل برصغیر کی سیاسی اور سماجی صورتحال کا مختصر جائزہ:

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد، دہلی جو سکون اور امن کا گہوارہ تھی، اب تباہی اور بربادی کی تصویر تھا۔ بربادی کا عالم یہ تھا کہ اخلاقی، معاشی اور سیاسی قدریں پامال ہو چکی تھیں، کون سی بلا تھی جس نے دلی کا رخ نہ کیا ہو۔ صاحبانِ علم و فن گروہ در گروہ دہلی کو چھوڑ کر ہجرت کرتے جاتے تھے۔ دہلی اب حاکم اقوام کے ظلم اور بربریت کے سائے تلے تھی جہاں کسی آزاد منش انسان کا سانس لینا مشکل تھا۔ انسانی اقدار کی یہ پامالی دہلی کی خواتین کے لیے زیادہ نقصادن دہ ثابت ہوئی۔ پہلے ہی خواتین کی اصلاحی اور سماجی حیثیت کوئی خاطر خواہ نہیں تھی لیکن اب سقوطِ دہلی کے بعد رہی سہی قدر بھی کھوئی گئی تھی۔ ان مخدوش حالات کا نقشہ بہت سے مورخ اور شعراء حضرات نے بہت پہلے کھینچ دکھایا ہے لیکن خواتین کی قدروں کی پامالی پر شاذ و نادر ہی بات کی گئی ہے۔ ادب میں خواتین کے حقوق کی پامالی پر ادبا نے جو لکھا وہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ ادیب زمانے کا نباض ہوتا ہے نیز اادیب کی کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔ وہ اپنے خاندان میں کچھ اور ہوتا ہے اور جہاں وہ کام کرتا ہے وہاں اس کی حیثیت مختلف ہوتی ہے یعنی بیک وقت ایک فرد باپ یا بھائی بھی ہو سکتا ہے اور کسی دفتر کا کلرک یا افسر بھی۔ ایک ادیب کی دوہری ذمہ داری ہوتی ہے۔ وہ ان رشتوں کو نبھاتے ہوئے اپنے فن کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

"ادیب کے اظہار کی دنیا اس کے گرد و پیش ہی کی دنیا ہوتی ہے۔ اس کے ادب کا خام مواد وہیں سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ادب کا تانا بانا اپنے گرد و پیش سے الگ رہ کر تیار ہی نہیں کر سکتا۔"(۸)

ادب میں ہر دور کے سماجی حالات کسی نہ کسی شکل میں منعکس ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ادیب اپنے عہد کے سماجی عوامل سے متاثر نہ ہو۔ اس کے تمام تجربات اور مشاہدات شعوری یا غیر شعوری طور پر انھیں عوامل کے آئینہ دار یا پروردہ ہوتے ہیں۔ ادب اپنی بنیادی حیثیت میں انفرادی نہیں سماجی ہے. جیسے سماج کے بہت سے عمل افراد کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں، لیکن اپنی نوعیت میں سماجی ہوتے ہیں۔ اس طرح ادب کا ایک اہم پہلو اس کا سماجی مواد اور موضوع ہے۔ ادیب چونکہ سماج کا ایک رکن ہوتا ہے، اس لئے اس کا مطالعہ ایک سماجی انسان کی حیثیت سے کیا جانا چاہیے۔ بظاہر اس کی زندگی ایک فرد کی زندگی ہوتی ہے، مگر وہ اپنے سماج کا ایک نمائندہ بلکہ ممتاز نمائندہ ہوتا ہے۔ اس وقت کی دہلی کے بارے میں ڈاکٹر ملک حسن اختر یوں رقم طراز ہیں:

"ہر طرف افراتفری کا عالم تھا اور بدانتظامی نے اپنا تسلط جمالیا تھا۔ شرفا دہلی کو چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور جو وہاں کسی وجہ سے قیام کرنے پر مجبور تھے ان کے چہرے پر غم والم کی سیاہی دکھائی دیتی تھی۔ امراء حصول اقتدار کے لیے دست و گریبان تھے اور بادشاہ ان کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گیا تھا۔ وہ جب چاہے اسے بدل دیتے تھے۔ ایسے حالات میں شعر وادب کے آسمان پر اگر غم کے بادل چھائے ہوئے نظر آتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ادب سوسائٹی کے جذبات کا عکاس ہوتا ہے۔ جب خالق اور اس کا ماحول غم زدہ ہو تو خلیق بھی غم انگیز بن جاتی ہے۔"(۹)

بیرونی حملہ آوروں کی تخت و تاراج اور اندرونی نظام کی شکست وریخت نے اہل ہند کو بالکل کمزور کر دیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی اقتدار کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ اس خانہ جنگی کے طویل عرصے میں مغلوں کے سیاسی نظام کا تانا بانا بکھر چکا تھا۔ مغل شہزادوں کی باہمی اقتدار کے لیے لڑائیاں، درباری سازشیں، امرا اور وزرا کی ریشہ دوانیاں اور اکھاڑ پچھاڑ کا ایک لامتناہی سلسلہ مدت سے جاری تھا۔ جس کے تباہ کن اثرات زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کیے جا رہے تھے۔ داخلی انتشار اور عسکری کمزوری نے بیرونی حملوں کے لیے راہ ہموار کر دی تھی اور بیرونی حملہ آوروں کی یلغار اور اندرونی شورشوں اور بغاوتوں نے دارالحکومت کے علاوہ اس کے ارد گرد کے علاقوں، شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں بھی تباہی و بربادی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم کر دیا تھا۔ اس مسلسل اور لامتناہی کشت وخون کی گرم بازاری نے ہندوستان کے معاشرتی نظام کی بنیادیں ہلا

دیں۔ بدامنی اور بے اطمینانی کے باعث قصبات اور دیہات قتل و غارت اور لوٹ مار کا نشانہ بنے ہوئے تھے جس سے ملک کی اقتصادی صورت حال مخدوش ہو کر رہ گئی اور شاہی خزانوں پر بھی اس کا ناگوار اثر پڑا۔"شاہی خزانہ بالکل خالی ہو گیا اور حکمرانوں کے لیے اپنی معمولی سپاہی کو بھی تنخواہ ادا کرنی مشکل ہو گئی ہے خواہ سپاہیوں نے فاقوں سے تنگ آ کر اپنے ہتھیار بیچنے شروع کر دیے۔ جب اس پر بھی پیٹ کی آگ نہ بجھی تو خودکشی یا لوٹ مار کا طریق اختیار کیا جس سے ملک کے حالات اور بھی دگر گوں ہو گئے۔ اس صورت حال کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار لکھتے ہیں:

> "شورش و بدامنی اور امراء کی تہی دامنی کے باعث دوسرے اہل فن اور اہل ادب سب ہی بے روزگاری کا شکار ہو رہے تھے۔ قحط سالی اور اناج کی گرانی نے انھیں قوت لایموت سے بھی مایوس کر دیا اور وہ اب فین ہونے کے باوجود در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے"(۱۰)

سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی نے مل کر لوگوں کے محاسن اخلاق کو گھن لگا دیا اور معاشرتی نظام کی جڑیں کھوکھلی کر کے اسے منتشر اور پراگندہ کر دیا۔ خود غرضی نفس پرستی، بدخوئی، ریاکاری، جھوٹ، مکر، دنا، نفرت، حقارت، بغض، عداوت، حسد، رقابت کے سفلی جذبات ہر فرد کے دل میں گھر کر چکے تھے۔ خال خال ہی کوئی اس وبائے عام سے بچا ہو گا۔ ورنہ ہر شخص اپنی غرض اور خواہش نفس کی تکمیل تسکین کے لیے سرگرداں تھا۔ اس طرز عمل سے اجتماعی زندگی بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ ایوان شاہی میں سیاسی گروہ بندیوں، سازشوں اور ریشہ دوانیوں نے بادشاہوں، امیروں اور ان کے حواریوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن بنا دیا تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی تخریب اور بربادی کے درپے رہتا تھا۔ بیرونی و اندرونی حملہ آوروں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور تباہی و بربادی اہل ہند کا مقدر بن گئی تھی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> "حملہ آوروں کی یلغاروں نے اس صورت حال پر اور بھی ستم ڈھایا قتل و غارت گری اور ملک و املاک کی تباہی و بربادی نے انسانی زندگی کی بے قدری کو عام کر کے ہر شے کو موہوم، بے حیثیت اور ناپائیدار بنا دیا۔ ہر شخص کے دل میں خوف و ہراس، بے دلی و بے اطمینانی، قنوطیت و یاس نے جگہ بنالی تھی اور حیات و کائنات کے بارے میں منفی رجحانات لوگوں میں عام پھیل گئے تھے۔"(۱۱)

ایک بحث انگیز حقیقت بھی ہے کہ اگرچہ ہندوستان پر آہستہ آہستہ انگریز اپنی گرفت مضبوط کر رہے تھے مگر اس زمانے کے شعراء اس غیر ملکی تسلط کے خلاف کوئی جد وجہد کرتے نظر نہیں آتے، ان کی تخلیقات جذبہ حب الوطنی سے عاری ہیں، عشق و عاشقی کے موضوعات کو بیان کر کے اپنے اور لوگوں کے اذہان کو حظ پہنچانے میں مصروف تھے۔ اس عہد کے شعراء اور ادباء نے اس زمانے کی سیاسی زندگی کو موضوع نہیں بنایا۔ اگرچہ ان کے شہر آشوب تباہی کی کہانی سناتے ہیں جو ان کے اضطراب کو ظاہر کرتی ہے مگر یہ سب اس وقت کی معاشی بدحالی کا دکھ ہے۔ سیاسی غلامی کا غم اس میں شامل نہیں ہے۔ کہیں کہیں استعارات اور کنایوں میں سیاسی بدحالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ زندگی کے سیاسی، اقتصادی، اخلاقی، تہذیبی اور اسی نظام کو کڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں اقتصادی نظام کی بہتری اور معاشرے کی خوشحالی کے لیے سیاسی استحکام اور امن و امان کی بحالی از حد ضروری تھی۔ برصغیر کے ہر سمجھدار اور دور اندیش حکمرا ننے زراعت کی ترقی اور زمینوں کے بندوبست پر خاص توجہ دی تاکہ ملک کے لوگ خوش حال رہیں اور شاہی خزانہ بھی معمور رہے۔ لیکن زوال پزیر مغل شہزادوں کے عہد میں زراعت پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔

عہدِ سجاد سے قبل برصغیر میں اصلاحِ نسواں کے تناظرات:

اصلاحِ نسواں کی تحریک میں انگریزوں کا حصہ:

ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلی بار ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری قبول کی لیکن کمپنی کے افسران نے تعلیم کو مردوں تک ہی محدود رکھا اور تعلیمِ نسواں سے اجتناب کیا گیا کیوں کہ ان کی دانست میں ہندوستانی معاشرہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہے یا اسے معیوب سمجھتا ہے۔ لہٰذا تعلیم نسواں کو ایک شجرِ ممنوعہ کی طرح چھوڑ دیا گیا حتیٰ کہ مقامی اسکول برائے طالبات کو بھی مالی امداد سے محروم رکھا گیا۔ ۱۸۱۹ء میں اس کارِ خیر کا آغاز ہندوستان میں مشنریوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس طرح ۱۸۱۳ سے ۱۸۳۷ء کا زمانہ کمپنی کے زیرِ اثر علاقوں میں مشنری سرگرمیوں کا زمانہ ہے۔ گویا کہ ایک تحریک کا آغاز ہوا جس کے تحت لڑکیوں کے لیے الگ سکول قائم کیے گئے، تعلیمِ نسواں کے ساتھ ساتھ اصلاحِ نسواں کی اشاعت اور فروغ میں روز افزوں ترقی کی گئی۔

۱۸۴۲ میں ایک تنظیم (Ladies Society for Native Female Education) کا قیام عمل میں آیا جس کی سربراہی لیڈی امہرسٹ کے سپرد کی گئی، اس تنظیم کی زیر نگرانی ۱۳۰ اسکول برائے طالبات

چلائے گئے۔اس تنظیم کے ذریعے ہندوستانی خواتین کے لیے سکول بنائے گئے، یتیم خانے کھولے گئے اور اعلی اور متوسط طبقوں کے خاندانوں میں زنانہ تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔اس کوششِ بسیار کے باوجود تعلیمِ نسواں کی رفتار تیز نہ ہو سکی۔اس سست رفتاری کی ایک وجہ نجی اور مقامی سکولوں کی کمی کے ساتھ ساتھ اصلاحِ نسواں کے شعور کی کمی تھی۔اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ انھیں خطرہ تھا کہ ان کی بچیاں تبدیلیءمذہب کا شکار نہ ہو جائیں۔ دیسی باشندوں میں لڑکیوں کے سکول قائم کرنے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف توجہ دلانے کے لیے علاقے کے چیف سول افسروں کو بھی اس قسم کی ہدایات بھیجی جائیں۔لارڈ ڈلہوزی نے عورتوں کی تعلیم کو اہمیت دی اور حکومت کے ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی،اس کے احکامات کا اجراء ۱۱ اپریل ۱۸۵۰ ہوا جس کا اقتباس درج ذیل ہے:

"عورتوں کو قطعی جہالت اور ناواقفیت میں پلنے بڑھنے دیا جاتا ہے لیکن اس رواج کو مذہب نہ تو لازمی قرار دیتا ہے اور نہ ہی اس کی توثیق کرتا ہے۔گورنر جنرل ان کاؤنسل درخواست کرتے ہیں کہ کاؤنسل آف ایجوکیشن کو مطلع کر دیا جائے کہ اب عورتوں کی تعلیم کی سرپرستی کو بھی وہ اپنے فرائض میں شامل سمجھے،جہاں کہیں بھی دیسی باشندوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اسکول بنانے کی خواہش نظر آئے وہاں اس کا فرض ہو گا کہ ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ اسکولوں کی کارکردگی معیار سے گرنے نہ پائے۔ان اداروں کی ہمت افزائی کے لیے تمام ذریعوں کو بروئے کار لانے کی ہدایت کی جائے"(۱۲)

لارڈ ڈلہوزی دراصل تعلیم نسواں اور اصلاحِ نسواں کا بہت بڑا حامی تھا اور وہ تعلیمِ نسواں کے لیے منظم کوشش اور جامع منصوبہ بندی کا قائل تھا چناچہ ان کے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بورڈ آف ڈائریکٹر نے ۱۸۵۴ء میں تعلیمِ نسواں کے متعلق نہ صرف حکومتی پالیسی واضح کی بلکہ اس سلسلے میں کی گئی کاوشوں کو سراہا گیا۔ الغرض روشن اور وسیع نظریات کے حامل انگریزوں نے اصلاحِ نسواں کے فروغ میں متاثر کن کام کیا۔بنگالی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے انجمن اطفال نے نمایاں کام کیا یہ انجمن کلکتہ میں ۱۸۲۰ ءمیں قائم ہوئی تھی اسے ڈیوڈ ہیرے نے بھرپور مالی امداد دی جس کے بل پر انجمن نے اصلاحِ نسواں کی تمام دشواریوں کو دور کر کے تعلیم کے میدان میں بھی قابلِ قدر کام کیا اور تعلیم نسواں کو ایک تحریک کی شکل دی۔اسی طرح بمبئی میں پروفیسر پاٹون (جو الفنٹن کالج کے پرنسپل بھی تھے) نے سٹوڈنٹس

لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی، اس سوسائٹی کے زیرِ اہتمام لڑکیوں کے لیے کئی سکولوں کی بنیاد رکھی اور ان سکولوں کی مالی معاونت بھی کی۔ ہندوستان کی سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی کو انگریزوں کے زیرِ تسلط نظامِ حکومت نے یکسر بدل کے رکھ دیا۔ مغربی تعلیم سے پھوٹنے والی مغربی افکار کی روشنی نے ہندوستانی وعوام کے سیاسی شعور کو اور اجلا کر دیا، اس کے علاوہ بہت سے نظریات و خیالات جیسے انسانی ہمدردی، آزادی، برابری، جمہوریت اور اقتدارِ اعلی نے ہندوستانی ذہن کو اور جِلا بخشی، یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ انگریزی تعلیم اور مغربی افکار نے ہندوستانی اقدار کے لیے نشاۃ الثانیہ کا کام کیا ہے، سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کا رجحان زور پکڑنے لگا، جو جمود برسوں سے طاری تھا وہ آہستہ آہستہ اک نئی تبدیلی میں بدلنے لگا۔ ہندوستان کے افراد دنیا کی مختلف تحریکوں، انقلابوں اور ان کے اثرات سے متاثر ہونے لگا جو اک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ہندوؤں میں اصلاحِ نسواں کی تحریک:

اس فکر کی روشنی ہندوؤں پر بھی یکساں اثرات مرتب کر رہی تھی جس کے نتیجے میں برہمو سماج نے ہندوستانی معاشرے میں عورت کو ایک نیا مقام دلوانے کی ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کیا، اس سلسلے میں راجہ رام موہن رائے کا نام سرِفہرست ہے۔ اس کے علاوہ کیشپ چندر سین اور دیگر ہندو رہنماؤں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی لامتناہی کاوشوں سے اس مہم کی شاخیں سارے ملک میں پھیل گئیں، اس مہم نے عورتوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آزادیٔ رائے اور آزادیٔ افکار پر بھی کام کیا جس کے نتیجے میں عورتیں گھر کی چار دیواری سے نکل کر سکولوں کے علاوہ جلسوں میں بھی شرکت کر سکتی تھیں نیز انھیں تقریروں کے ذریعے اپنے خیالات بیان کرنے کی آزادی بھی دی گئی۔ آریہ سماج میں سوامی دیانند نے عورتوں کی تعلیم اور اصلاح کی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد بھی عورت کو جہالت اور تنگ نظری کی قید سے آزاد کرانا تھا۔ سوامی دیانند کی قیادت میں ایک منظم تحریک کا آغاز کیا گیا جس کے تحت اسکول قائم ہوئے اور ان سکولوں کے لیے نصابِ تعلیم ویدک کلچر سے لیا گیا۔ آریہ سماج کے لوگ پردے کے خلاف تھے اس لیے عورتوں کو اداروں میں کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سیمیں ثمر فضل لکھتی ہیں:

> "۱۸۷۹ء میں قائم ہونے والی تھیوسی فیکل سوسائٹی نے مسز اینیبیسنٹ کی سربراہی میں تعلیمِ نسواں پر خصوصی کام کیا۔ مسز بیسینٹ عورتوں کو قومی دھارے سے جدا رکھنے کے یکسر مخالف تھی، مرد و عورت کے یکساں بنیادوں پر کام کرنے میں ہی

ہندوستان کی بقا مضمر ہے۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان مساوات تعلیم و تربیت ہی سے قائم کی جاسکتی ہے، انھوں نے اس تفریق کو جہالت کا نام دیا اور علم کو روشنی کا نام دیا، ہندوستانی عورتوں کے لیے اس کی محبت کی زریں مثال ۱۹۰۴ء میں بنارس میں ہندو لڑکیوں کا مرکزی مدرسہ کا قیام ہے"(۱۳)

سوامی دیانند کی سربراہی میں رام کشن مشن کی تحریک کے قیام کا مقصد غربت، افلاس، جہالت، سماجی ناہمواری، عدم مساوات اور بھوک کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا تھا، ایک بھوکا اور جاہل فرد کسی طرح اپنے معاشرے کی فلاح کے بارے نہیں سوچ سکتا۔ مگن بھائی کرم چند نے گجرات میں لڑکیوں کے لیے اسکول کھولنے کا آغاز کیا اور اس امر کی تکمیل کے لیے مالی مدد بھی کی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان میں سماجی اور سیاسی اصلاحات کے ساتھ اصلاحِ نسواں کی تحریکوں نے بھی زور پکڑا جس سے آگہی اور شعور کی لہر ہندوستانی خواتین میں دوڑ گئی، روز بروز ان خواتین کی تعداد بڑھتی گئی جنھیں ہم آج تک یاد رکھتے ہیں مثلاً مہارانی تپسوی، سورن کمار دیوی، رانی شرنومئی اور رانا بائی ریناڈے ان تمام مشہور ہندو خواتین نے اصلاحِ نسواں کے کارِ خیر کو جلا بخشی۔

"آگرہ میں گوپال سنگھ نے عورتوں کی تعلیم کے لیے کوششِ بسیار کی ان کے ۲۰۰ سیمیناروں میں ۳۸۰۰ خواتین نے حصہ لیا، گوپال سنگھ نے ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز ہونے کی حیثیت سے اس کام میں ذاتی دلچسپی لی اور انھوں نے حکومت کو تعلیمِ نسواں کی اہمیت سے روشناس کرایا اور مالی امداد کی فراہمی یقینی بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ اس طرح رام کشن مشن کی تحریک ملک گیر مقبولیت اختیار کر گئی جس کے نتیجے میں خواتین میں تعلیمی بہتری کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری بیداری بھی اجاگر ہوئی"(۱۴)

مسلمانوں میں اصلاحِ نسواں کی تحریک:

ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اصلاحِ نسواں کی تحریک کا اثر نمایاں دیکھا جاسکتا ہے۔ دیگر اسلامی ممالک میں یہ صورتحال بہتر تھی کیونکہ ان ممالک میں یہ کوششیں کافی عرصہ پہلے سے جاری تھیں اور ان ہی کے اثرات ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی خاصے مقبولِ عام ہوئے۔ ترک عورتوں نے لباس اور آزادی میں جس قدر ترقی حاصل کی ہے اس کے ساتھ ساتھ علمی قابلیت میں بھی نمایاں کامرانی نظر آتی ہے۔ بعض

عورتیں لکھنے پڑھنے میں اس قدر آگے بڑھ گیئں کہ اخباروں میں مضامین لکھتی ہیں اور کتابیں تصنیف کرتی ہیں۔بعض عورتیں اپنے شوہروں کے کاروبار اور جائیداد کے معاملات بھی اپنی دانشمندی سے سنبھالتی ہیں، گورنمنٹ کے قائم کردہ سکولز برائے خواتین میں ٹرکی، فرانسیسی، حساب اور جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم ہوتی ہے اور کچھ سکولز میں موسیقی اور تصویر کشی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ترکی کا ایک مشہور اخبار "امید" وہاں کی تعلیمِ نسواں کی حالت کے بارے لکھتے ہیں:

> "ملک میں بلند طبقہ سے لے کر زمینداروں اور پیشہ وروں تک کے گھروں میں پڑھی لکھی عورتیں کثرت سے موجود ہیں، حکومتِ ترکی کی طرف سے تعلیمِ نسواں کی جانب خصوصی توجہ کی جاتی ہے، ہر علم و فن میں بہت سی مسلمان خواتین مہارت رکھتی ہیں۔ڈاکٹری تو ہزاروں لاکھوں عورتیں نہایت اعلی درجے کی جانتی ہیں، ان مدارس کا شمار مشکل ہے جو عورتوں کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے اور بہت سی خواتین مسلمان معلمہ اور استانیاں ہیں"(۱۵)

مشرقی و مغربی معاشرے میں عورت کے استحصال کی نوعیتیں:

دنیا بھر کے اخبارات و الیکٹرانک میڈیا عورتوں پہ مظالم کے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں، یہ وہ واقعات ہیں جو رپورٹ ہوتے ہیں، ایسے لاتعداد واقعات اور سانحات ہورہے ہیں جو میڈیا کی رسائی سے دور ہیں، ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں کہ روح کانپ جاتی ہے ان واقعات سے ایسا لگتا ہے کہ عورت کی عزت، عصمت اور جان کی کوئی اہمیت نہیں۔ پسماندہ معاشروں میں سے ایک ہمارا معاشرہ بھی ہے جہاں حالت یہ ہے کہ عام زندگی کے معاملات ہوں یا زندگی کے اہم فیصلہ جات ہوں عورت کی رائے مرد کی رائے کے مقابلے میں اپنی حیثیت کھو دیتی ہے، انہیں کسی سماجی، سیاسی اور معاشی شعبے یا ادارے میں کسی قسم کا قائدانہ کردار کی نہ تو اجازت ہے اور نہ ہی مناسب مواقع۔بیٹی کی پیدائش ہوتے ہی سارا خاندان فکر مند ہو جاتا ہے، عدم تحفظ کا احساس ہمہ وقت بیٹی کے ساتھ منسوب رکھا جاتا ہے، بیٹی کو اول دن سے خوف اور دباؤ کے ایک ایسے ماحول میں رکھا جاتا ہے جہاں وہ اپنے آپکو مردوں کے مقابلے میں کم تر سمجھیں، چنانچہ مصر میں اصلاحِ نسواں کا شعور اس وقت کے اخباروں اور رسائل سے بخوبی لگایا جاسکتا، اس حوالے سے رسالہ "خاتون" کے ایک مضمون میں اس طرف اشارا ملتا ہے:

"جب مصطفی کمال پاشا کا انتقال ہوا تو وہاں کی خواتین نے جابجا مجالس کر کے تعزیت کے تار دیے، اور انھوں نے اپنی روسی بہنوں کی طرز پر انجمن علمی قائم کی جو تعلیمِ نسواں کی ترقی کے وسائل مہیا کرے گی۔ اس انجمن کی سیکرٹری "فاطمہ راشدہ" ہیں جو مصر کے مشہور فلسفی "علامہ فرید وجدی" کی بیوی ہیں"(۱۶)

عورت کو اس انداز سے مرد کے تصرف میں دے دیا گیا کہ وہ بلا شرکت غیرے اپنے تمام اختیارات میں حاکم کی حیثیت سے عورت کو جس طرح چاہے اپنی خواہشات کے مطابق استعمال کرے عورت کی ذاتی اناء، حیثیت اور احساسات کے احترام کا شائبہ تک نہ تھا عورت گو کہ معاشرہ میں آزادی کی نعمت سے محروم تھی ہی لیکن گھر کی چار دیواری میں بھی اسے ایک غلام کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا گیا منو کا ضابطہ قانون اس کی عکاسی اس طرح کرتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں مصر کی یونیورسٹی میں نہ صرف عورتوں کے داخلے کو تسلیم کیا گیا بلکہ وہاں خواتین کے لیے استانیوں کی پوسٹیں بھی مقرر کی گئیں، ایک جائزے کے مطابق مصر میں کل مدارس کی تعداد ۳۵۷ تھی جن میں ۴۲۲ لڑکوں کے لیے اور ۱۳۱ لڑکیوں کے لیے اور ۱۸۲ دونوں کے واسطے مشترک تھے۔ ان مدارس میں ۵۴۷۵ مدرس تعلیم دیتے تھے اور طلبا کی کل تعداد ۱۱۳۴۳ تھی جن میں ۸۸۲۹۱ لڑکے اور باقی سب لڑکیاں تھیں۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی ممالک کی ان تحریکوں کا اثر خاطر خواہ حد تک ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی تعلیمی و اصلاحی تحریک پر پڑا۔ ملکی اور عالمی سطح پر ان اصلاحی تحریکوں نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کو وہ ماحول فراہم کیا جس نے ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کی قوت کو مزید جلا بخشی۔ ہندوستانی عورتوں کو مزید فعال کرنے لے لیے زنانہ اجلاس، کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور دردمندانہ اپیلیں کی گئیں تاکہ ان خواتین کی ذہنی بیداری کو ممکن بنایا جاسکے، ان اپیلوں میں سے نمونے کے لیے ایک اپیل درج کی جاتی ہے:

"اے میری معزز بہنوں کیا تم نے اپنی اپنی حالت پر غور نہیں کیا کہ ہمیں کیسی زندگی میسر ہو رہی ہے، ہم کیسے جہالت کے اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں اور نکلنے کی ذرا کوشش نہیں کرتے، پیاری بہنو! اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم صرف امورِ خانہ داری کو بری بھلی طرح قبول کریں، انگلینڈ کی لیڈیز کیسی اچھی عزت پا رہی ہیں اور صرف علم کی بدولت۔ اب ہمیں چاہیے کہ ظاہری نمائش، زیور اور کپڑوں کی محبت دل سے نکال کر علم کی محبت سے وابستہ ہو جائیں"(۱۷)

انیسویں صدی کی تیسری دہائی کا عرصہ خصوصی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سیاسی اور معاشرتی طور پر بہت مشکل ثابت ہوا۔اس وقت مسلمانوں کے پاس اقتدار تھا نہ اختیار، صرف ذلت اور پستی تھی جو مسلمانوں کا مقدر بن چکی تھی، تن آسانی اور فراغت کا دور ختم ہو چکا تھا۔نئے معاشرتی فریم کی زینت بننے کے لیے تن دہی سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔اس اندوہ ناک صورتحال کا سیاہ پہلو یہ تھا کہ مسلمانوں نے جدید تعلیم کی طرف سے ایک مدت تک آنکھیں بند رکھیں۔ان پر فتن حالات میں سر سید کی شخصیت کسی نعمت سے کم نہ تھی، سر سید نے جدید تعلیم کی تحریک کا آغاز کیا اس وقت صرف روائتی مدرسے اور مقامی مکتب موجود تھے جن کی فضا پر مذہبی رنگ غالب تھا لیکن سر سید نے مغربی جدید تعلیم کی ضرورت کا احساس کر لیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ قومی ترقی کا کوئی منصوبہ اس وقت تک شرمندہء تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کہ مغربی علوم پر پوری دسترس حاصل نہ ہو یہی وجہ ہے کہ ان کی کاوشوں نے مسلمانوں کی ذہنی فضا بدلنے میں راہ ہموار کی۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب مسلمان مردوں کا یہ حال تھا تو عورتوں کے حالات کس حد تک نا گفتہ بہ ہوں گے۔اس وقت کی نسائی صورتحال کو ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنی ایک کتاب میں واضح کیا ہے:

> "تعلیم کا یہ حال تھا کہ اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا ذکر ہی کیا خواندگی برائے نام تھی اور پھر عورتوں میں تو تعلیم بہت ہی کم تھی۔ سر سید احمد کے زمانے میں تعلیم عورتوں کے لیے غیر ضروری تھی بلکہ نامناسب سمجھی جاتی تھی اور بہت ہی کم گھرانوں میں پڑھی لکھی خواتین موجود تھیں، عورتوں کی اکثریت جاہل تھی اور معاشی نظام میں ان کی حیثیت بڑی حد تک عضوِ معطل کی سی تھی"(۱۸)

عورت کی سماجی و معاشی زندگی سے بارہ سالہ لڑکی سے شادی کرنی چاہئے چوبیس سالہ شخص آٹھ برس کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے، اس ضابطے کے تحت عورتوں کے ساتھ کم عمری ہی سے ظلم و بربریت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ہندو مذہب اب بھی میں بیوہ شادی نہیں کر سکتی۔لہذا کم عمری میں بیوہ ہونے والی لڑکیاں تاحیات بے آسرا اور کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جاتی ہیں ایک عربی مصنف ہندوستان کی اس حالت کا تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ وہاں ایک اور اہم نقصان دہ بات بھی ہے وہ یہ کہ وہاں کم عمری میں شادیاں کر دی جاتی ہیں پانچ چھ سال کی عمر میں ہی ان کو دلہن بنا دیا جاتا ہے اعداد و شمار کے مطابق وہاں چھبیس ملین بیوائیں موجود ہیں اور سب سے بری عادت ان کی یہ کہ بیوہ ہمیشہ بیوہ رہتی ہے۔شادی نہیں کر سکتی۔ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان بیواؤں میں پندرہ ہزار کے قریب معصوم بچیاں اور چار لاکھ کے قریب نوجوان لڑکیاں ہیں

جن کی عمریں پندرہ سال سے زائد نہیں۔ ان حالات کی بڑی وجہ انگریزی تعلیم کو مطلقاً حرام سمجھا جانا تھا اس سے بچنے کے لیے عذر اور حیلے پیش کیے جاتے تھے لیکن ظاہری حالات اس قدر مخدوش ہو چکے تھے کہ تن پر کپڑا اور منہ میں نوالہ نہیں تھا۔ نواب محسن الملک لکھتے ہیں:

"بعض سیدانیاں ایسی تھیں کہ جن کے بدن پر ثابت کپڑا نہ تھا اس کے باوجود تعلیم سے نفرت، علم سے بیگانگی، فقر و فاقہ میں مست اور اپنی حالتِ زار پر قانع۔ نتیجتاً علم کا نام تک باقی نہیں رہا اور اب تو ایسی افسوسناک حالت ہے کہ اگر ان کو تعلیم کی فہمائش کیجاوے تو ہزاروں عذر اور حیلے پیش کیے جاویں"(۱۹)

سرسید کی مساعیٔ جمیلہ کا ذکر کرنے سے پہلے واضح ہو کہ اس وقت تعلیمی اور اصلاحی حالت کا روپ کیا تھا، ایسے میں دور رس نگاہوں کا ان حالات کو بدلنے کے لیے عورتوں سے پہلے مردوں کی ذہنی آبیاری کرنا ایک فطری عمل تھا اور اس سے اس بات کا رد بھی ممکن ہے کہ سرسید تعلیمِ نسواں کے مخالف تھے، یعنی وہ اس بات کا ادراک رکھتے تھے کہ عورتوں کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مردوں کی ذہنی اور فکری اصلاح کی جائے تاکہ تمام رکاوٹیں اس امر کی زائل ہو جائیں۔ سرسید ہرگز تعلیمِ نسواں کے مخالف نہ تھے، وہ تعلیمِ نسواں کو وقت کی بہت بڑی ضرورت سمجھتے تھے۔ سرسید نے جب مغربی تعلیم کی افادیت مسلمانوں کو سمجھانی چاہی تو چاروں جانب سے مخالفت کا غلغلہ بلند ہوا وہ صحیح اندازہ نہ کر سکے کہ سرسید کو کیسی کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیسی کیسی آفت اٹھانا پڑی ہے اور اب بھی مغربی تعلیم کے دشمن ستانے اور پریشان کرنے سے باز نہیں آتے، ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ تعلیمِ نسواں کے مسئلے کو چھیڑا جاتا، اس وقت عورتوں کی تعلیم پر زور دینے کے یہ معنی ہوتے کہ دیدہ و دانستہ ہزاروں آفتوں کو مول لیا جاتا اور جان بوجھ کر مردوں کو تعلیم کے مفید مطلب اغراض کو خاک میں ملا دیا جاتا۔ خواتین کی اصلاح اور تعلیم کے لیے سرسید کا خیال نواب محسن الملک نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

"پہلا فرض تھا کہ پہلے مردوں کی تعلیم اور خیالات کی اصلاح کا انتظام کیا جاتا چنانچہ یہ سمجھ کر کہ مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں، تو وہ اپنے آپ تعلیمِ نسوں کا انتظام کریں گے، بغیر تعلیمِ نسواں کے زندگی مہمل رہے گی مسلمان ہمیشہ اس اعلی اور مہذب زندگی کی برکات سے محروم رہیں گے"(۲۰)

انھیں اس بات کا ادراک تھا کہ جب تک مرد تعلیم یافتہ نہ ہوں گے عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی مثال پیش نہیں کی جاسکتی کہ مرد تعلیم یافتہ نہ ہو اور خواتین پڑھ لکھ جائیں۔ اس وقت جدید تعلیم سے بہرور مردوں کے لیے پڑھی لکھی خواتین کی کمی محسوس ہونے لگی تھی، تعلیم یافتہ مردوں کی ازدواجی زندگی اس تعلیمی فرق سے ناخوشگوار ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں ہر ایک تعلیم یافتہ نوجوان شادی سے پہلے یہ پر لطف خواب دیکھتا ہے کہ اس کی شریکِ رنج وراحت اس کے برابر کی یا اس سے کچھ ہی کم تعلیم یافتہ ہو وہ گھر کی ملکہ ہے جس کی سلطنت میں قدم رکھتے ہی وہ اپنی تکالیف بھول جانا چاہیے، مگر شادی ہونے کے بعد واقعات سامنے آتے ہیں اور وہ بدنصیب یہ دیکھتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونا تو درکنار جہالت کے لحاظ سے گھر کی خادمہ اور ملکہ میں سوائے لباس اور صورت کے کوئی واضح فرق نمایاں نہیں۔ اس مسئلہ پر اردو ادب کے مشہور ادیب سجاد حیدر یلدرم نے ایک خوبصورت مضمون لکھا جو مئی ۱۸۹۹ میں "معارف" میں شائع ہوا، لکھتے ہیں:

> "عورتوں کی تعلیم سے جس قدر بے پروائی کی جارہی ہے اس کی وجہ میری سمجھ سے بالاتر ہے، انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اس موجودہ غفلت سے سخت نالاں ہیں اور والدین ہیں کہ اس کی پروانہیں کرتے"(۲۱)

اصلاحِ نسواں کے لیے سجاد حیدر یلدرم نے ہندوستانی مسلمان عورتوں کی زندگی کے جن خاص پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ان میں سے ایک مسلم خواتین یا لڑکیوں کی تعلیم تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز مین جب شیخ عبداللہ نے مسلمان عورتوں کی تعلیمی تحریک شروع کی تو سجاد حیدر نے بھی اس کام میں بھرپور حصہ لیا۔ ۱۹۰۴ میں جب شیخ عبداللہ نے تعلیم کے فروغ کے لیے ایک رسالہ جاری کیا تو اس کا نام "خاتون" سجاد حیدر ہی نے تجویز کیا اور بعد میں بھی اس تحریک اور اس رسالہ کی سرپرستی کرتے رہے، ان کے اس دور کے طبع زاد یا ترکی سے ماخوذ افسانوں اور ناولوں کا ایک اہم موضوع عورتوں کے مسائل اور ان کی تعلیم ہے۔ الغرض ان خیالت اور حالات نے تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں کو حد درجہ متاثر کیا، نتیجتاً مسلمانوں کا ایک طبقہ عورتوں کو جدید انگریزی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے عملی کاوشوں میں لگ گیا تو دوسری طرف ایک گروہ جس میں فنکار، ادیب اور ناول نگار شامل تھے اس حوالے سے اپنی تحریروں سے بیداری کا پیغام دینے میں مصروف ہو گئے کیوں کہ غدر کے بعد مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ نہ صرف تعلیم حاصل کرنا تھا

بلکہ تعلیم سے بیزاری کو دور کرنا بھی تھا۔۱۸۸۶ء میں سر سید کے قائم کردہ ادارے "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس "کی ایک شاخ تعلیمِ نسواں کے لیے مختص کی گئی اور اس کے سیکرٹری شیخ عبداللہ تھے۔

۱۹۰۶ میں شیخ عبداللہ نے لڑکیوں کے لیے ایک سکول بھی علی گڑھ میں قائم کیا، رجعت پسند عناصر نے ان کی اس کاوش کا اور تحریک کا بہت مذاق اڑایا اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے، انھوں نے ان مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن جلد ہی انھیں بیگم بھوپال کی حمایت حاصل ہوگئی۔ تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے ہندوستان کے مختلف حصے میں انفرادی کوشش بھی جاری تھیں چونکہ اس وقت مسلمان لڑکیوں کے لئے اسکول کی شدید کمی تھی۔ کیوں کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو ان اسکولوں میں جو عیسائیوں کی مشنریوں کے زیر اثر چلائے جارہے تھے بھیجنا قطعی پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ انہیں بے پردگی اور تبدیل مذہب کا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ لہذا مسلمانوں کی اولین کوشش رہی کہ جگہ جگہ مسلمان لڑکیوں کے لئے الگ اسکول کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ اپنے مذہبی روایات کے مطابق جدید تعلیم حاصل کر سکیں۔ چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر شیخ عبداللہ نے علیگڑھ میں بیگم بھوپال نے بھوپال میں اور نظام حیدرآباد کی اجازت سے حیدرآباد میں لڑکیوں کے اسکول قائم کئے گئے۔ حیدر آباد میں لڑکیوں کا ایک اسکول ۱۹۰۷ میں پردے کے انتظام کے ساتھ قائم کیا گیا جس میں پانچ سال سے زیادہ عمر والی لڑکیوں کو اردو فارسی انگریزی، حساب موسیقی، سوزن کاری، سادہ کاری اور گل کاری، اصول انتظام خانہ داری کے متعلق پردہ میں تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم کا وقت دن کے پونے گیارہ بجے سے عصر تک تھا۔ ہر ہفتہ اتوار اور جمعہ کو پڑھتی رہتی تھی مگر یہ اسکول صرف مخصوص اعلیٰ خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کھولا گیا۔

چنانچہ تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے جہاں مسلمانوں کے ایک گروپ نے عملی طور پر قدم اٹھایا تو دوسری طرف مسلمانوں کے دوسرے گروپ نے تعلیم نسواں سے عام بیزاری او بے حسی کو دور کرنے کے لئے اپنی تحریروں سے ایک تحریک شروع کی۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو سر سید کی تعلیمی تحریک سے یا تو منسلک تھے یا اس کے حامی تھے۔ ان میں خاص طور پر نذیر احمد، حالی، شبلی، محسن الملک اور پھر ان کے بعد شیر الدین مغربی ہمایوں، محمدی بیگم اور والدہ سلیمان کے نام لیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں سے عورتوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کی کوشش کی، ایک طرف تو انہیں اکتسابی تعلیم کے شوق کو بڑھانے کے لئے نئے نئے علوم سیکھنے کی ترغیب دی تو دوسری طرف ان کے اندر پیوستہ سماجی و معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، ان لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں عورتوں کو یہ ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی کر تعلیم ہی وہ

حربہ ہے جس سے انسان ساری برائیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ تعلیم انسانی ذہن کو بالیدگی اور عقل کو روشنی عطا کرتی ہے، ان مصنفین نے اپنی تحریروں کے ذریعہ یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ تعلیم کسی مخصوص طبقہ اور مخصوص جنس کے لئے نہیں بلکہ یہ سب کے لئے یکساں ہے عورتیں اس کی زیادہ ضرورت مند ہیں کیونکہ عورت ہماری آئندہ نسلوں کی تہذیب و ترقی کا معیار ہے تعلیمی اصلاح کی ان کوششوں کی وجہ سے خود ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلم خواتین کا ایک گروہ پیدا ہوا جس نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے گرانقدر کارنامے انجام دیا اور اپنی تصنیف و تالیف سے خواتین میں بیداری، آزادی اور اصلاح کی ایک لہر سی دوڑادی، ان روشن خیال اور تعلیم یافتہ مسلم خواتین کے تذکرے کے بغیر ہندوستان کی تعلیمی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

بھوپال کی ملکہ سلطان جہاں بیگم کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا جس طرح سرسید نے مردوں کی تعلیم کے لئے تحریک چلاتی اسی طرح سلطان جہاں بیگم نے بھی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے نہ صرف اپنی تحریر اور تقریر سے ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش کی بلکہ ان تمام تحریکوں کی سرپرستی کی اور مالی امداد بہم پہنچائی۔ ان کی پیدائش ۱۸۵۶ میں بھوپال میں ہوئی۔ اردو، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی، وہ نہایت ہی روشن خیال اور ترقی پسند خاتون تھیں۔ انہوں نے تین مدرسے قائم کئے اور ایک کتب خانہ حمیدیہ قائم کیا جس میں تمام زبانوں کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ ہندوستانی خواتین خصوصاً مسلم خواتین کی تعلیم سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے ۱۹۰۷ء میں اپنی ایک تقریر کے دوران عورتوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کراتے ہوئے کہا تھا

> "اس وقت تم بالکل ظلمات میں گھری ہوئی ہو اے خاتونو! کوشش کرو اور اپنے آپ کو اس سے نکالو کیونکہ ظلمات سے نکلنے کے بعد ہی آب حیات ملتا ہے۔ اب وہ زمانہ تمہارے لئے بھی آگیا ہے کہ آب حیوان جس سے مراد چشمہ علم ہے اپنی کوششوں سے حاصل کرلو"(۲۲)

ممتاز علی نے (جنہوں نے دیوبند سے تعلیم حاصل کی تھی اور سرسید کی شخصیت سے متاثر ہو کر انگریزی زبان بھی سیکھ چکے تھے) تعلیم نسواں کی تحریک کو فروغ دینے میں پیش پیش ہو گئے۔ اور اپنے خیالات کو عورتوں تک پہنچانے کے لئے ایک رسالہ "تہذیب نسواں" جاری کیا۔ ممتاز علی نے مسلمان عورتوں کی زبوں حالی اور ان کی ذہنی غلامی کو دور کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کی وہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات پر یقین رکھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ محض جسمانی بناوٹ کی وجہ سے مرد عورت پر غالب نہیں ہو سکتا لہذا انہوں

نے ایک سے زائد شادی کی بھی مخالفت کی اس حیثیت سے وہ چراغ علی کے ہم خیال تھے وہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے اور اسے ایک تاریخی ضرورت تصور کرتے تھے اور وہ عورتوں کو بھی تعلیمی مواقع فراہم کرنے پر یقین کرتے تھے۔ انہوں نے اس خیال کی پر زور مخالفت کی کہ تعلیم سے عورت میں خراب ہو جاتی ہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ اعلی تعلیم کی بدولت عورتیں اپنی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر بنا سکتی ہیں اور وہ مرد کی صحیح معنوں میں شریک حیات بن سکتی ہیں تعلیم یافتہ مائیں ہی آنے والی نسلوں کو بہتر مستقبل عطا کر سکتی ہیں ممتاز حسین کی سب سے بڑی مشہور کتاب حقوق نسواں ہے، جو ۱۸۹۸ء میں لاہور میں شائع ہوئی۔ اپنی اس تصنیف میں انہوں نے عورتوں کے حقوق کے متعلق تفصیلی طور پر جائزہ لیا ہے اور ان تمام سوالات اور اندیشوں کا منطقی طور پر جواب دینے کی کوشش کی جن کا اظہار قدامت پسند مسلمان عورتوں کے متعلق کرتے رہے ہیں۔ مولانا آزاد بھی تعلیم نسواں کے حامی تھے۔ انہوں نے اس کی اہمیت اور ضرورت پر بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کئی مضامین لکھے۔ انہوں نے "علیگڑھ منتھلی" میں ایک مضمون ۱۹۰۳ء میں شائع کیا جس کا عنوان تھا، تعلیم نسواں ہماری قوم میں کیونکر ہو سکتی ہے۔ اس میں انہوں نے ان سماجی رکاوٹوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی، جو تعلیم نسواں کی راہ میں حائل تھیں۔ لکھنو کانفرنس میں تعلیم نسواں ایسوسی ایشن قائم ہوئی تھی میں کے مندرجہ ذیل اغراض ومقاصد تھے:

اول: اور بڑا مقصد یہ تھا کہ تعلیم نسواں سے پوری ہمدردی پیدا کی جائے اور اور ملک میں تعلیم نسواں کے موافق خیالات پھیلائے جائیں اور جاہلانہ مخالفت رفع کی جائے اور مخالفین کے اعتراضات کی معقول طور پر تردید کی جائے۔

دوم: بالفعل حسب ریزولیشن جلر تعلیم نسواں سیکشن منعقدہ لکھنو علی گڑھ میں ایک سینٹرل نارمل اسکول استانیوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے اور اس کے لیے کافی سرمایہ بہم پہنچایا جائے۔

سوم: ہر ممبر کو لازم ہو گا کہ وہ اپنے خاندان اور برادری اور دوستوں کی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوئی عملی صورت پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اگر کانفرنس کے جلسہ میں شریک ہو تو اس کوشش کے نتیجے سے ایسوسی ایشن کے ممبروں کو اطلاع دے ورنہ ایک مختصر پورٹ اپنی کارکردگی کی ماہ دسمبر میں سکریٹری شعبہ تعلیم نسواں کے پاس بھیجدیا کرے۔

چہارم: ہر ممبر کا فرض ہے کہ وہ سینڈل نارمل اسکول کے استحکام اور تکمیل کے لئے پوری کوشش کرے۔

1919 میں لاہور میں بھی ایک انجمن خاتون اسلام کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مسلمان بہنوں کا آپس میں رابطہ اتحاد پیدا کرنا اور میل جول بڑھانا۔ قومی ہمدردی کا شوق ان کے دل میں پیدا کرنا اور اس کے فوائد و نتائج سب مسلمان بہنوں کے ذہن نشین کرنا۔ مسلمان بہنوں کو تعلیم کی ضرورت اور فوائد سے آگاہ کرنا او علم کی ترغیب دینا۔

ج۔ عہدِ نذر سجاد سے قبل اصلاحِ نسواں کی ادبی و سماجی جہات: پس منظری مطالعہ (ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے خصوصی حوالے سے):

عورت کا ایک پہلو اتنا توانا ہے کہ کسی بھی گھر کی عورت کے کردار کی جھلک گھر کے دیگر افراد میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ عورت بطور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی گھر میں اساسی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس اہمیت کو پس پشت ڈالتے ہوئے اردو ادب کے ابتدائی دور میں عورت کا تصور بالکل روایتی تھا۔ یعنی وہ ایک نمائشی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ سراپا حسن تھی۔ اسے اگر پیدا کیا گیا تو محض اس لیے کہ وہ مردوں کا دل بہلائے اور ان کے عیش و عشرت اور شہوانی خواہشات کی تکمیل کا باعث ہو سکے۔ گویا عورت کی تخلیق کا دوسرا سبب ممکن ہی نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عہد میں عورت جائے خود کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی اور نہ ہی اس کی اپنی کوئی حیثیت تھی۔ معاشرتی اقدار میں سجاوٹ، بناوٹ اور ظاہر پن اتنا رچ بس گیا تھا کہ عورت مرد کے نزدیک ایک خوبصورت مجسمہ تھی۔ جس سے وہ لطف اندوز تو ہوتا تھا لیکن اس کے باطن میں جھانکنے یا اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا نہ تو اسے ارمان تھا اور نہ احساس۔ عورت کی ظاہری نمود و نمائش سے متاثر ہو کر اس نے اسے اپنے ادب میں جگہ دی۔ عورت کے جذبات و احساسات کی ترجمانی نہ وہ کر سکتا تھا اور نہ یہ اس کا مقصد تھا۔ ابتدائی اردو شاعری سراپا نگاری سے عبارت تھی، جس میں عورت محبوبہ کے روپ میں سامنے آتی ہے اور داستانوں میں اسے مافوق الفطرت ہستی کے روپ میں پیش کیا۔ یہاں عورت یہ تو ملکہ تھی یا شہزادی۔ اگر وہ کنیز یا محبوبہ بھی تھی تو اتنی حسین و جمیل کہ مرد اسے دیکھتے ہی دھڑا دھڑ اگر کر بے ہوش ہو جاتے۔ مثلاً رجب علی بیگ سرور نے "فسانہ عجائب" میں شہزادی انجمن آراء کا یوں نقشہ کھینچا ہے:

> "مالک عفت و عصمت انجمن آراء یہاں کی شہزادی تھی۔ شہرۂ جمال بے مثال اس حور طلعت پری خصال کا از شرق تا غرق اور جنوب سے شمال تک، زبان زدِ خلق خدا تھا اور ایک جہان حسن کا بیان سن کر نادیدہ اس کا مبتلا تھا۔ آج تک چشم و گوش چرخ کج رفتار نے بال ایں گردش لیل و نہار ایسی صورت دیکھی نہ سنی تھی۔ مرقع دہر سے

وہ تصویر چنی تھی۔ بہت سے شاہ اور شہریار اس کے وادی طلب میں قدم رکھ کر
تھوڑے عرصے میں آوارہ دشت ادبار، پتھروں سر مار مار، مصرع رورو اقلیم عدم ہو
گئے "۔ (۲۳)

مختصر داستانوں میں عورت کا جو تصور تھا، وہ حسین نازنیوں کا تھا۔ جو سراپا نور ہی نور اور قیامت ہی قیامت ہوا کرتی تھی۔ بین بجاتی ہوئی، ہولی گاتی ہوئی، دھیان تالوں پر دھرے، پھول دامن و گریباں میں بھرے ہوئے، آکر وہاں جلوہ گر ہوئی، جہاں وہ جوگ سادھے تنبیہ کر رہا تھا۔ یک بیک پازیب کے گھنگھروں کی جھنکار، بین کے تاروں کی آواز، گانے کی لے سے ملی ہوئی، سن کر بے قرار ہوا۔ اس نے جو نہی آنکھیں کھول دیں، ایسی شکل نظر آئی کہ ایک ہی نظارے سے اس کا سب دھیان گیان جاتا رہا۔ کاظم علی جو ان "شکنتلا" میں یوں سراپا نگاری کرتے ہیں:

"برسوں میں جیب کی جتنی پونجی جمع کی تھی، اس کے نازو غمزے کی فوج نے سب کی
سب ایک ہی دم لوٹ لی۔ پھر تو غش کھاتا ہوا، اٹھ کر پروانہ وار اس شمع روح کے گرد
پھرنے لگا"۔ (۲۴)

اردو شاعری میں بھی شعراء نے عورت کی اصل شکل کو مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ یہاں عورت محبوبہ اور طوائف کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ یوں اردو شعر و ادب میں عورت ایک بے وفا کنچنی اور مرد کے لیے عیش کوشی اور نفسانی لذت کے اہم ترین وسیلے کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔ اوسط درجے کی شریف گھرانے کی عورت کا ذکر اس لیے بھی کہیں نہیں ملتا کہ اس زمانے میں عورت کا نام لینا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جس کا بڑا سبب پردے کی شدت تھی۔ جو عورت کی آزادی میں بری طرح حائل تھا اور کسی شاعر و ادیب کو پردے کی آڑ میں جھانکنے کی جرأت کبھی نہ ہوئی۔ جب کہ ہندی اور سنسکرت شاعری میں عورت کا جو تصور ابھرتا ہے، وہ بہت انوکھا ہے۔ کیوں کہ کم از کم شاعری کی حد تک ان کے خیالات و احساسات، اخلاقیات اور روحانیت کے حامل رہے ہیں۔ ہندو کلچر میں سب سے پہلے عورت ذات کے لیے ایسے پاکیزہ اور اعلیٰ احساسات کو جنم دیا کہ اس کے فیض سے عورت سیتا، پارہتی اور ساوتری کی طرح زندہ ہے۔ ان نسوانی کرداروں کو تخلیق کر کے سنسکرت اور ہندی شاعری نے ہندوستان کی نسوانی آبادی کو کیا بنا دیا ہے۔ وہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "مہابھارت میں ایک جگہ کہا گیا ہے کہ بیوی محبت کرنے میں ماں ہے اور ساتھ دینے میں بہن اور خدمت

کرنے میں بیٹی اور بستر پر بیسوا ہے۔ بر صغیر میں اردو ناول کی ابتداء انگریزی نظام حکومت کے تسلط کے بعد سے ہوتی ہے۔

خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد، جب ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی تو اس کا نمایاں اثر ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ اس دور کے ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں نے ادب کو نئی زندگی اور نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اردو کہانی جو ایک مدت تک داستانوں کی رنگین رومانی اور تخیلی دنیا میں سانس لے رہی تھی۔ مولوی نذیر احمد کی رہبری میں حقیقت کی دنیا میں داخل ہوئی اور ناول کے نام سے جانی پہچانی جانے لگی۔ اس طرح ناول جو انگریزی لفظ ہے، انگریزی زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا۔ اردو میں اس فن کو مستقل حیثیت دینے میں انگریزوں کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بدلے ہوئے ماحول میں ادیبوں اور فن کاروں نے زندگی کے مطالبے اور تقاضے کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ داستانوں کی پر کشش اور مبالغے سے بھری ہوئی پُر تکلف، رومان پرور زندگی کی جگہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کے پس منظر میں انسانی زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول کا آغاز ان سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی رہین منت ہے۔ جن سے انیسویں صدی کے اختتام پر ہندوستانی معاشرہ دوچار تھا۔ سرسید نے بعض سیاسی اور معاشی مصلحتوں کی بناء پر جو پیروی مغرب پر زور دیا تھا وہ رجحان بھی ادب میں جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ وطن پرستی کی وجہ سے اکبر الہ آبادی کی مغرب بے زاری اور مشرق پرستی بھی جاری رہی۔ اقبال، چکبست اور کئی دوسرے شاعروں کی قومیت اور وطن پرستی بھی ایک اہم ادبی رجحان بنتی جا رہی تھی۔ سیاسی بیداری کی بدولت اقلیت پسندی بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی نئی اور پرانی اقدار کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ یہ تمام رجحانات ناول میں پوری طرح نظر آتے ہیں۔

۱۸۵۷ء سے پہلے تک اردو ادب میں داستانوں کا دور رہا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ادب کی سرپرستی درباروں میں ہوتی تھی اور داستانیں بادشاہوں اور امراء کی فرمائش پر لکھی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی داستان "سب رس" ۱۶۳۵ء میں منظر عام پر آئی۔ جس کے مصنف اسد اللہ وجہی تھے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی نثر کا پہلا شاہکار ہے کیوں کہ اس سے پہلے جو نثری تصانیف ملتی ہیں وہ مذہبی نوعیت کی تھیں۔ غرض یہ کہ وجہی کے ہاں عورت کے جلاپے کی تصویر کشی میں جو حقیقت آرائی ہے وہ صرف داستانوی نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے۔ عورت ان کے معاشرے میں بھی کم عقل سمجھی جاتی تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جذبات کے

دھارے میں بہہ کر بہت جلد فیصلہ کرتی تھی۔ جس کی مثال "سب رس" کی شہزادی حسن ہے جو رقامت کے زیر اثر بغیر سوچے سمجھے اپنے محبوب کو قید کر دیتی ہے اور آخر میں اپنے فیصلے پر پشیمان ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی عورتوں کی بھی نشان دہی کی ہے، جن میں مکر بھرے ہوئے ہیں۔ ان عورتوں کو قہر الٰہی بتایا گیا ہے جو دوسروں کے ہنستے بستے گھر اجاڑنے کا باعث ہیں۔ جس کی مثال "سب رس کا کردار "غیر" ہے۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۰ء تک فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی جانے والی داستانوں کی تعداد پانچ ہیں جس میں غلام احمد دہلوی کی شبت کنشت" (۱۸۰۱ء) محمد عوض زریں کی نوطرز مرصع (۱۸۰۲ء) انشاء اللہ خاں انشاء کی "رانی کیتکی کی کہانی" اور کنور اودھے بان کی کہانی (۱۸۰۳ء) انشاء اللہ خان کی ہی سلک گوہر" اور حکیم شجاع محمد بخش مہجور کی "گلشن نو بہار" ۱۸۰۵ء شامل ہیں۔ داستانوں کی اس تمام فضا میں ہندوستانی عورت کے سارے رنگ موجود ہیں۔

عورت کے وہ تمام رنگ جن کی تخلیق میں صدیوں کی روایات اور رسوم کی چھاپ موجود ہے۔ مثلاً بیٹی کے پیدا ہونے پر سوگ کی کیفیت، شوہر بطور مجازی خدا، عورت کا شوہر اور بچوں کے ساتھ مشروط زندگی کا تصور، پُر سکون گھریلو ماحول کے لیے ہمیشہ عورت سے قربانی کی توقع۔ عورت سے سلیقہ مندی، گھر داری، مہمان داری اور تمام گھر کی خواہشات کو مقدم رکھتے ہوئے اپنی ذات کی نفی کر دینے کی امید رکھنا ہندوستانی ناری کا وہ فرض اولین ہے جسے عورت کے حسن میں زمین و آسمان ایک کر دینے والا داستان گو بھی نہیں بھول پاتا۔ چوں کہ یہ داستانیں مردوں نے مردوں کے لیے تخلیق کی تھیں اس لیے جن جذبات کا تعلق مرد کی ہوس پرستی یا تعیش پسندی سے ہوتا، اسے زیادہ چسکے لے کر بیان کیا جاتا۔ ہندوستان کے طرز معاشرت میں مرد و عورت آزادی کے ساتھ ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے تھے۔ اس لیے ان داستانوں میں عشق کے ہوش ربا مناظر، حسن کے حصول کی جدوجہد کے مشکل مراحل اور آخر کار عشق کی فتح کے ایسے قصے سنائے جاتے جن میں لذت کے ساماں ہوتے۔ دوسری طرف ان داستانوں میں عورت سے بڑے بڑے کام بھی لیے گئے ہیں مثلاً وہ رسم و رواج، مذہب اور قوم پرستی کی محافظ بھی بنی ہے۔ اس کے طعنے جنگوں کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ بعض اوقات مرد صرف عورت کو متاثر کرنے کے لیے مہم جو بنتے ہیں اور ایسے بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیتے ہیں جو دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ داستانوں میں عورت کا منفی اور مثبت دونوں پہلو سامنے آتے ہیں۔ کہیں یہ حقیقت سے قریب ہے اور کہیں محض افسانہ۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے قریب قریب داستانوں کا زمانہ اختتام پذیر ہوا اور تخیل کی جگہ حقائق نے لے لی۔ سائنسی اور صنعتی

دور میں داستانوں کو قصہ پارینہ بنا کر ناول یعنی جدید قصے کی آبیاری کی گئی۔ ادب میں تانیثی تحریک کے عوامل ماضی میں گزشتہ صدی تک چلے گئے ہیں۔

بالخصوص انیسویں صدی جو سائنسی و تکنیکی اعتبار سے گذشتہ تمام صدیوں پر بھاری تھی، اس عمل کو مناسب راہ فراہم کرتی ہے۔ حصول روز گار اور حصول زر میں مسابقت کا دور شروع ہوا، خاندانی شیرازہ بندی بکھرنے لگی اور بڑی تیزی کے ساتھ عدم حفظی تنہائی اور غیر یقینی کے احساس نے معاشرے کے ہر حصے میں جڑیں پیوست کر لیں۔ ایک وسیع پیمانے پر اخلاقی بحران بھی وجود میں آیا جس کے باعث باہمی رواداری کے بشری اثاثے کو سب سے زیادہ قیمت چکانا پڑی۔ اس فریم میں عورت جو کئی قسم کی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی نا انصافیوں کی بہت پہلے سے شکار چلی آرہی تھی ایک بالکل نئے انسانی مسئلے سے دوچار ہوتی ہے۔ خاندانی شیرازہ بندی کی شکست کے ساتھ ہی اس کی انفرادیت اور حیثیت کا سوال ایک دم ابھر آیا۔ مرداساس معاشرے کی ادارہ بندیاں عورت کی آزادی کے حق میں نہیں تھیں، آزادی کے مسئلے کے پہلو بہ پہلو تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی صورت حالات میں اسے ایک زندہ اور فعال عضویت کے طور پر قبول کرنے کا سوال بھی کم اہم نہ تھا۔ ایک علاحدہ صنف یا جنس کے نام پر اس کا مسلسل استحصال ہوتا رہا۔ اس استحصال میں جذباتی اور جنسی استحصال کے علاوہ سرے سے اس کی ذات اور اس کے فرد کارد بھی شامل تھا۔ اسے بالجبر دوسرے درجے کی مخلوق بن کر رہنا پڑا اور وہ آہستہ آہستہ ایک استعمال میں آنے والی شئے یا محض ایک آلہ کار بن کر رہ گئی اور وہ بھی ایک ایسا آلہ کار جسے مرد کے تئیں ہمیشہ وفادار بن کر رہنا ہے۔ مرد نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے اسے تابع مہمل بنالیا اور وہ ایک مستقل نفسیاتی عارضے کا شکار ہو گئی۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت کی نہ ذات نہ آواز۔ اس آواز کو عالم انسانیت نے پوری بلندی کے ساتھ اس وقت محسوس کیا جب انگلینڈ میں خواتین پر مشتمل تھی جو موجود معاشرے میں عورت کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لئے کوشاں تھی۔ (۱۸۶۶ء) Women's Suffrage کے نام سے باقاعدہ جدوجہد شروع ہوئی۔

یہ ان کا سب سے پہلا مطالبہ عورتوں کے حق رائے دہی سے متعلق تھا۔ یہ بھی بالآخر نامشکور ثابت ہوئی۔ ۱۸۶۷ء کے ریفارم بل کے تحت معنی ورکنگ طبقے کے بہت سے اراکین کو شامل کرنے کے بعد رائے دہندگان کی تعداد تقریباً دوگنی ہوئی۔ اور ۱۸۸۳ء میں ان تمام مردوں کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہو گیا جن کی عمر ۲۱ برس کی تھی۔ اس بل کے تحت محض وہ فرد اس حق سے محروم قرار دیے گئے جو دماغی طور پر معطل اور جرائم پیشہ قیدی وغیرہ تھے کتنی بڑی آئرنی ہے کہ عورت بھی اسی درجے کی ایک فریق تھی۔ عورتوں نے

ہمت نہیں ہاری۔ اس محرومی کے بعد ملک بھر میں (National Union of Women's Suffrage Societies(NUWSS جیسی تنظیموں کا جیسے ایک سیلاب اٹھ آیا۔ تقریباً ۳۰ برس کی طویل جدوجہد کے بعد ۱۹۱۸ء میں ۳۰ سالہ خواتین کو رائے دہی کا حق دے دیا گیا اور ۱۹۳۸ء میں ایک بل کے ذریعے رائے دہندہ کی عمر ۲۱ اور پھر ۱۹۶۹ء میں کم کر کے ۱۸ سال کر دی گئی۔ اس طرح ملک کے تمام شہری اس حق سے مستفیض ہو گئے۔ انیسویں صدی کے اواخر تک عورتیں حق رائے دہندگی اور دوسرے لفظوں میں عملی سیاست سے محروم تھیں۔

معاصر حالات میں عملی سیاست سے محرومی کے معنی گھریلو فرائض کی انجام دہی، افزائش نسل اور بچوں کی تربیت و نگہداشت۔ یہ کام ان خواتین کے حق میں زائد تھے جن کا بیشتر وقت ملازمت کی نذر ہو جاتا تھا۔ انہیں حالات کے پیش نظر Mrs. Emmeline Pankhurst نے ویمنز سوشل اینڈ پولٹیکل یونین (۱۹۰۳) کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کے ذریعے حقوق نسواں کے حصول کی مہم میں کافی شدت پیدا ہو گئی۔ عورتوں نے مراعات کے بجائے حقوق کے حصول پر اصرار کیا اور مرد کی اس بالادستی کے خلاف پر زور احتجاج کیا جسے عورت کی مخصوص درجہ بندی پر اصرار تھا۔ عسکری تعلیم بھی دی جاتی ہے جس کا مقصد عوام کو خواتین کے سیاسی و سماجی مسائل کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اس مہم میں نوجوان لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔

۱۸۸۲ء Married Woman's Property Act پاس ہونے کے بعد عورتوں کے مطالبات پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا اور انہیں بعد از جنگ حق رائے دہندگی تفویض ہونے کے بعد خواتین کو ذاتی ملکیت کی خرید و فروخت کا بھی میں حاصل ہو گیا۔ مساوات کی کوششوں کی راہ میں جہد کے حامیوں اور خیر خواہوں میں کئی ادیب بھی تھے۔ ۱۹۰۸ میں سیلی ہیملٹن Women's Writers Sufferage League نے (۱۹۵۲-۱۸۷۲ء) قائم کی جس کے اراکین میں صحافی، ڈراما نگار اور کئی دانش ور تھے۔ الزابتھ رابنس نے اے ریمنڈ سے Vote E نام کا ڈراما سٹیج کیا، جو کافی مقبول ہوا۔ عسکری خواتین یعنی Sufferagists اور ان کے مسائل کو کئی اہم ادیبوں، صحافیوں اور رسائل نے اپنا موضوع بنایا۔ اس ضمن میں Nights and Days ور جینا ولف Am Veronica، ایچ۔ جی۔ ویلز اور Press Cuttings برناڈ شاہ وغیرہ جیسی تصنیفات نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ جین کھرسٹ اور ای پیتھک لارنس نے تانیثی تحریک اور اس کے مطالبات، مقاصد اور اقدامات پر کئی مضامین قلم بند کیے۔

اسی طور پر صنف داری اخلاقیات کے مطابق ورجینا وولف نہ صرف ایک ناول نگار بلکہ ایک قابل قدر صحافی اور نقاد بھی تھیں۔ ان کا مقالہ بعنوان (A Room of Ones Own ۱۹۲۹ء) تانیثی ادبی تحریک اور تنقید کی تاریخ میں اولین مقالوں میں شمار کیا جاتا ہے جو مختلف تقریروں کا جامع ہے۔ اس کا موضوع عورت اور فکشن تھا۔ ولف نے پوری دیانتداری، نفعیت اور دانشمندی کے ساتھ عورت کے تئیں موجود و جاری ناانصافیوں اور منفی استحصال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ تعلیمی، معاشرتی اور اقتصادی سطح پر ایک عورت کی پسماندگی کے اسباب سوسائٹی کے اندر ہی تلاش کرتی ہے، وولف کے نزدیک جیسا کہ وہ خود اپنے آپ کو ثابت کر چکی ہے عورت عقلی، فکری اور تخلیقی سطح پر بھی کم تر یا کمزور بھی ہوں تو بھی ان کو لکھنا چاہیے۔ ورجینا وولف کا کہنا ہے کہ عورتوں کو کبھی وہ مراعات اور وہ ماحول میسر ہی نہیں آئے کہ وہ پورے شد و مد اور اعتماد کے ساتھ خود کو ادب کے لیے وقف کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادیباؤں کو احتجاجاً خودکشی بھی کرنی پڑی۔ بعض محض عورت قرار دیے جانے اور ان پر ایک خاص حد متعین کیے جانے کی وجہ سے ذہنی امراض کا شکار ہو گئیں۔ بعض نے لکھنا ہی ترک کر دیا۔ عورت اسی وقت بہترین ادب تخلیق کر سکتی ہے جب اسے اپنا ایک نجی کمرہ مہیا کر دیا جائے جہاں وہ تن بہ تنہا پوری مرکزیت کے ساتھ تخلیقی کام انجام دے سکے۔ اس صورت حال کو وہ ایک آئرنی سے تعبیر کرتی ہیں کہ عورت کو ایسی خلوت و عزلت نصیب نہیں ہے جہاں وہ آزادی کے ساتھ سانس لے سکے، سوچ سکے اور تخلیق کر سکے۔ ورجنیا ولف ادبی تاریخ ماضیہ کی بعض اہم ادیباؤں اور ان کی تصنیفات کو خراج عقیدت پیش کرتی ہے۔ بالخصوص ان میں اے۔ بہن۔ ڈی۔ آسبورن، شامل ہے۔ آسٹن، ایملی اور اپنی برونے اسے خواتین کے لیے ایک بہترین اظہار قرار دیا ہے۔

عورت نہ صرف عمدہ ناولوں کے ذریعے بلکہ شاعری میں بھی اپنے جوہر کا استعمال کر کے برابری کے دعوے کو صحیح ثابت کر سکتی ہے۔ ورجنیا ولف نے قاری کو بھی پدری نظام کا پروردہ بتایا ہے کہ اسی طور پر اس کی زہنیت، عادتوں اور پسند و ناپسند کے معیاروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ خاتون ادیباؤں سے ایک قسم کی، اسی طرح وہ توقعات جو مرد خاص قسم کے ادب کی توقع کرتا ہے اور مرد سے دوسرے کرداروں سے وابستہ کی جاتی ہیں نسوانی کرداروں سے تعلیمی مختلف ہوتی ہیں۔ حالات جب اتنے مشروط ہوں تو نسوانی ادب بھی مشروط ہی ہو گا۔ وولف کہتی ہیں کہ: اب تک جو ادب خواتین نے تصنیف کیا ہے اس پر مشروط کا جبر ہے۔ یعنی یہ وہ نہیں ہے جو وہ لکھنا چاہتی تھیں بلکہ وہ جو مشروط حالات کے جبر یا قاری کی توقعات کے جبر نے لکھوایا اور بقول وولف قاری نے ہمیشہ اسے منفی نقطہ نظری سے دیکھا اور پڑھا۔ اس سے بھی ایک تکلیف دہ صورت یہ ہے کہ بعض

خواتین نے غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود لکھنا ہی ترک کر دیا۔ وولف تذکیر و تانیث کے اس تصور کے منافی ہیں جس سے وحدت اور ہم آہنگی کے بجائے نفاق اور دوئی کو تحریک ملتی ہے۔ وہ ہر اس علاحدگی پسند تصور کے خلاف ہیں جس کے تحت مرد و زن کی خصوصیات کو دو مختلف خانوں میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور علی العموم اس قسم کی درجہ بندی چند مروج اور موجود اصولوں کے تحت ہی کی جاتی ہے۔

تانیثی تحریک اپنی پیش تر صورتوں میں صنفی مساوات کی دعویدار ہے۔ اس کے بنیاد گزاروں میں میری وال سٹون کرافٹ (۱۷۹۷-۱۷۵۹) جو کہ میری فیملی کی ماں تھی، کا نام رورت ہے۔ وال سٹون کرافٹ کی تصنیف A Vindication of the Rights of the Women (1792) اس معنی میں پہلی تانیثی کتاب سمجھی جاتی ہے کہ مصنفہ نے اسے ایڈمنڈ برک کی تصنیف (۱۷۹۰) A Vindication of the Rights of the Man کے جواب میں قلم بند کی تھی۔ برک نے مردوں کے حقوق پر اصرار کیا تھا اور عورتوں پر انی بالا دستی کے چلن کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ وال سٹون کرافٹ نے نہ صرف یہ کہ عورت کو سامان عیش ماننے سے انکار کیا بلکہ جنسی و صنفی تصور توفق کو غیر فطری اور غیر منطقی ٹھہرایا۔ حقوق کے ضمن میں اس کا اصرار مساوات کے اس ڈھانچے پر تھا، جسے مرد و عورت پر بغیر از تخصیص بلند و پست منطبق کیا جا سکے۔ مرد اساس ادارہ بندی پر یہ پہلی ضرب تھی۔ تانیثی تحریک کا نقش اول ایک خاتون کا مرہون قلم ہے جب کہ نقش دوم نتیجہ ہے جان اسٹوارٹ مل جس نے انیسویں صدی کے اواخر میں ایک مقالہ بہ عنوان محکومی نسواں On the Subjugation of Woman لکھا، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے مل نے دو متناقض پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی سعی کی تھی۔ عورت بہ حیثیت ایک مطیع، مغلوب اور تابعدار صنف کے اور اس کے مقابلے میں مرد جو تقریباً ہر شعبہ حیات و فکر میں بحیثیت ایک مطاع، غالب اور آمر صنف ہے۔ ۔ نتیجتاً معاشرے میں مرد جہاں سر گرم اور اپنے وجود کی خود تصدیق ہے، خود گر ہے، خود نگر ہے۔ وہاں عورت محض ایک دست نگر ہے جسے نہ تو انا شخصیت کو خود بنانے کا حق ہے اور نہ انفرادیت کی تشکیل و تکمیل میں وہ آزاد ہے۔ تاہم مل سیاسی سطح پر عورت کے حق کے لئے اپنی آواز بلند نہیں کر سکا کیوں کہ سیاسی صورت حالات عورت کے حق میں نہ تھی۔ سیاسی و سماجی اعتبار سے انیسویں صدی کے اواخر میں خواتین کے حقوق کی آواز بڑی قوت کے ساتھ پورے ملک میں پھیل کر اپنا اثر نمایاں کرنے لگی تھی۔ تشکیل اور نفاذ کا نظام جس میں سماجی اور اقتصادی برابری کی ضمانت دی گئی۔ ان خواتین کا اصرار سیاسی مساوات پر بھی تھا۔ نیز مردوں کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کے مطالبات بھی انہوں نے کیے جو عورت کو صدیوں سے نا اہل جھتی

رہی ہے اور خود اس ذہنیت کی تشکیل میں صدیاں صرف ہوتی ہیں۔ اس تحریک کے نمائندوں میں محض عورتیں ہی نہیں تھیں بلکہ ایسے مردوں کی بھی خاصی تعداد تھی جن کا تعلق سرگرم سیاست اور صحافت سے تھا یا وہ خود ادیب اور فن کار تھے۔ اب تانیثی تریک محض چند آرٹیکز اور خواتین کے حق میں لکھی ہوئی اکاذکا تصنیفات ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کی گونج مجلس قانون ساز سے لے کر کافی ہاؤسوں، پارکوں بنکڑوں اور گھروں گھر سنائی دینے لگی۔

آخر کار انگلستان میں ۱۹۷۵ میں ایک ایکٹ کے تحت ان تمام امتیازات کو غیر قانونی ٹھہرایا گیا جو صنف و جنس کے لحاظ سے روزگار اور گھر دار میں بالخصوص اور ترقی کے مواقع میں بالعموم روا رکھے جاتے تھے۔ اس نئی تحریک نے عورت کو جنسی شئے بنا کر پیش کرنے والوں پر بھی سخت دار کیے۔ بالخصوص اشتہاری کمپنیوں، ان کے ڈائریکٹروں اور خود ماڈلز کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ عورت کو جو مفعول و مجہول محض بنا کر رکھا جاتا ہے اس کے خلاف بھی پرزور احتجاج کیا گیا بلکہ جابجا مزمت کی گئی۔ جنسی تخصیص و تشخص کے برخلاف ان کا مطالبہ انہیں محض انسان سمجھنے کا تھا۔ جس طرح ایک عام سماجی فرد اپنی شخصیت کی آزادنہ تشکیل کرتا ہے اور آزادی اظہار سے بہرہ ور ہوتا ہے اسی طرح ایک عورت کو بلا تخصیص جنس اپنی شخصیت آپ بنانے کی آزادی ہونی چاہیے۔ مروج نظام اخلاق و تہذیب پر یہ ایک کاری ضرب تھی۔ اس طرح تانیث درج ذیل مروج کلیوں کے رو سے عبارت ہے کہ: عورت بمقابلہ مرد کے ایک کمزور اور نازک جنس ہے۔ عورت اور مرد کے مابین ایسی مخصوص حیاتیاتی عضویت کی تفریق ہے جس کی بنیاد پر انہیں رسائل و جرائد نے دو علیحدہ خانوں اور درجوں میں رکھا جانا ضروری سمجھا ہے۔ مروج صنفی تقسیم کے مطابق مرد و عورت کی کارکردگی جتنی کہ پیشہ ورانہ کارکردگی کے دو نمایاں درجات ہیں۔ اگر مرد کا درجہ اول ہے تو عورت کا دوم۔ اسی نسبت سے وہ دوسرے درجے کی شہری ہوئی اور اس کی ملازمتیں، پیشے اور کام بھی مخصوص بلکہ جسمانی اشتہاری طرز کے ہیں یعنی جذباتی، احساسی اور احساساتی عمل میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

عورت ایک قابل رحم اور مجہور صنف ہے اور اسے ہمیشہ مردوں کے دست شفقت اور چاہ کی ضرورت ہے۔ مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی سطحوں پر مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کے درجے مختلف ہیں وہ کہیں تفریح، کہیں ملکیت اور کہیں گھر دھی ہے گویا وہ ایک Commodity ہے اور تابعداری جس کی تقدیر ہے۔ ادب میں تانیثیت اور تانیثی تنقید کو پروان چڑھانے میں اس فضا نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ڈیم ریب کا ویسٹ نے ایک ایسی عورت کو بار بار اپنے فن اور آرٹیکلز میں جگہ دی جو بلاخوفی کے ساتھ ذاتی حقوق اور

سیاسی و سماجی آزادی کو بروئے کار لاتی ہے اور آزادی کا ایک واضح تصور رکھتی ہے۔ اس کی غیر مری ہیر وئنوں بلکہ اس کے افسانوی فن کو محض اس باعث مناسب وقعت نہیں مل سکی کہ اس کے تصورات تحفظ اور مکر سے خالی تھے اور ان میں اپنے عہد کے عمومی تناظر میں ضرورت سے زیادہ روشن خیالی اور دانش کی جھلک ملتی تھی۔ اس نے آزادی رائے کے حق کو ایک بشری حق پر محمول کر کے کہیں بہا کو اپنا آلہ بنایا کہیں لڑکی پر رنگ آمیزی کی، کہیں واشگافی کے ساتھ مسلمہ نظام قدر و عمل کو صدمہ پہنچایا۔ اس بنا پر ادبی نقادوں نے اسے در خور اعتنا نہیں سمجھا۔ ۱۹۸۰ء کے ارد گرد اسی کے تانیثی رجحان کے علاوہ افسانوی فن اور بالخصوص اس کی ہیر وئنوں کا نئے تناظر میں محاکمہ کیا گیا۔ یہ ایک بڑا دلچسپ اور توجہ طلب تضاد ہے کہ ۱۹۱۱ میں جب وہ عورت کے لیے شدت کے ساتھ لکھ رہی تھی۔

بہر حال قبل از غدر ایسی کوششوں کے بہت سے نشانات ملتے ہیں۔ ان نشانات میں مولوی کریم الدین صاحب کی تصنیف عورتوں کی تعلیم پر نہایت نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایشیا اور افریقہ کی مشہور عورتوں کا تذکرہ بھی تذکرۃ النسا کے نام سے کتاب ۱۸۵۴ میں شائع کیا۔ اسی دور میں خاص عورتوں کے لیے ایک دیسی اخبار بھی شائع کیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں ملک میں ان مدارس سے اور ان کی تعلیم سے انتہائی نفرت بھی پائی جاتی تھی۔ اس زنانہ بائبل اور میڈیکل مشن کے ماتحت ایک نارمل اسکول قائم ہوا جس میں عیسائیوں کو استانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شاہ کے مشہور تعلیمی فرمان کی رو سے گورنمنٹ نے ایسے ذاتی اسکولوں کو جو عمارتوں، اُستادوں اور کتابوں سے متعلق احکام کی میل منظور کریں امداد دے کر ہمت دلائی گھر نہ ہی تعلیم اس میں شامل نہ تھی۔ گورنمنٹ کی طرف سے تعلیمات کے محکمے قائم ہوئے اور فضا سلیم عورتوں کا تذکرہ بھی تذکرۃ النسا کے نام سے شملہ میں شائع کیا۔ اسی دور میں خاص عورتوں کے لئے ایک دیسی اخبار بھی شائع ہوتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں ملک میں ان مدارس سے اور متذکرہ مداری|سے نفرت ان کی تعلیم سے انتہائی نفرت بھی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ سید نے منجملہ اسباب بغاوت ہند ایک کے باقاعدہ طریقے جاری ہوئے۔ ایک اہم ہدایت کے ذریعے یہ منشا سبب ان مدرسوں کو قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں: ظاہر کیا گیا کہ عورتوں کی تعلیم میں خاصی دلچسپی لی جائے۔ اء میں گورنمنٹ نے یہ ہدایت جاری کی کہ مدرسوں میں قومی اور ملکی امداد کی زیادہ ضرورت ہے، اگر وہ نہ مل سکے تو بہتر ہے کالیکول جاری نہ کئے جائیں۔ اس زمانے میں لڑکیوں کے صرف در گورنمنٹ پرائمری اسکول بنائے جاتے ہیں لیکن امدادی اسکول ۱۹ اور غیر امدادی آزاد سکول اتھے۔ کلکتے کی مشنری ایجنسیوں کو دو ہزار روپے ماہوار تعلیمی کام سب یقین جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں

اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہو جائیں یہ بات حد سے زیادہ ہندوستانیوں کو ناگوار تھی۔ بعض اضلاع میں اس کا نمونہ قائم ہو گیا تھا۔

جو علوم اس زمانے میں عورتوں کے لئے مفید تھے وہی اس زمانہ میں بھی مفید ہیں۔ یہ علوم صرف دینیات اور اخلاق کے لئے تھے۔ اس زمانے کی لڑکیاں قرآن شریف پڑھتی تھیں، اس کا ترجمہ پڑھتی تھیں نماز وروزہ کے مسائل کی کتابیں پڑھتی تھیں، جس نے تعلیم میں زیادہ ترقی کی اور فارسی سیکھ لی اس کو قصص الانبیاء حکایات الاولیا اور اس قسم کی اخلاق کی کتابیں اور مثنوی مولانا روم رحمتہ اللہ علیہ کی بعض حکایات پڑھائی جاتی تھیں جس زمانے میں مشکوۃ شریف کا ترجمہ اردو میں نہ ہوا تھا اور لڑکیوں نے حدیث پڑھنے کا شوق کیا تھا ان کو شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کا ترجمہ مشکوۃ شریف پڑھایا جاتا تھا۔ اخیر زمانے میں اردو ترجمہ مشکوۃ شریف اور اُردو ترجمہ حصن حصین یعنی ظفر جلیل زیادہ تر تدریس میں داخل تھا بعض لڑکیاں ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاء یعنی فوائد الفواد اپنے شوق سے پڑھتی تھیں۔ صرف ایک عورت سے میں واقف ہوں جس نے تزک جہانگیری اپنے باپ سے پڑھی تھی مگر اس کی ہمجولیاں کہتی تھیں کہ اس سے کیا فائدہ ہے کوئی اور خدا اور رسول کی کتاب پڑھو۔ یہی عمدہ طریقہ تعلیم کا تھا جس سے لڑکیوں کے دل میں نیکی، خدا ترسی، رحم، محبت اور اخلاق پیدا ہوتا تھا اور یہی تعلیم ان کے دین و دنیا دونوں کی بھلائی کے لئے کافی تھی۔

سرور الملک کہتے ہیں کہ میری والدہ مغفورہ نہایت عابدہ، زاہدہ اور ضروری مسائل دین سے واقف تھیں اور قرآن مجید مع ترجمہ شاہ عبد القادر رحمتہ اللہ علیہ پڑھی ہوئی تھیں۔ استادان کے سید حسن بہنوئی سر سید احمد خاں مرحوم کے تھے۔ ان صاحب نے اپنے رشتہ کی کل مستورات کو قرآن مجید اور کچھ حدیث کی والی کتابیں مع ترجمہ پڑھی تھیں۔ ان کے گھر میں کہنے کی اکثر یا کیا نہ ہو جائیں ان سے پڑھا کرتی تھیں۔

مسلم یونیورسٹی کے انفارمیشن بیورو سے اطلاعات شائع کی گئیں کہ ابھی تک ڈگری کا سرکی عظیم کا معقول انتظام نہیں دینی مضامین کے لئے معلمات نہیں ملیں۔ بلکہ ان کی تعلیم مرد پروفیسروں کے ذریعے دی جاتی تھی۔ اس صورت حال کی اصلاح میں ایک قانونی دشواری حائل تھی اور وہ یہ کہ ایکٹ کی رو سے یونیورسٹی اس کی مجاز نہ تھی کہ علیحدہ کالج قائم کر سکے یا ان کا باضابطہ الحاق کر سکے۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لئے ڈاکٹر ضیاء الدین نے اسمبلی میں ایک ترمیمی بل پیش کیا۔ اگرچہ مسلم لیگ پارٹی کے اسمبلی سے باہر آجانے کی وجہ سے اس ترمیمی بل کی قسمت خطرے میں پڑ گئی تھی تاہم ڈاکٹر صاحب کے ذاتی اثر و سوخ کی بدولت یہ بل ان کی غیر حاضری میں تمام منزلوں سے کامیابی کے ساتھ گزر کر منظور ہو گیا اور اس کا نفاذ بھی عمل میں آگیا۔

اس ترمیم کی رو سے یونیورسٹی کو جداگانہ کالجوں کے قیام اور ان کے الحاق کا حق مل گیا۔ اس ترمیم کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ اب یونیورسٹی ایک جداگانہ زنانہ ڈگری کالج قائم کر سکتی ہے۔ چنانچہ کالج کی اسکیم تیار ہوئی اور اس کے ضروری مراحل سے گزرنے کے بعد انتظامی کمیٹی کے ممبران کا انتخاب عمل میں آگیا۔ انٹر کالج میں بھی سائنس کے درجے کھولے گئے تاکہ ان کی طالبات شعبۂ ڈاکٹری میں داخلہ لے سکیں اس مقصد کے لئے گورنمنٹ کی جانب سے پانچ ہزار اور یونیورسٹی کی جانب سے پانچ ہزار روپۓ منظور کئے گئے ہیں۔ ۱۲ء میں مسلم گرلز انٹر میڈیٹ کالج کو ایک مکمل زمانہ ڈگری کالج کی حیثیت دی گئی۔ پہلے ڈگری کلاس کی طالبات کو یونیورسٹی کے مختلف شعبہ ہائے تعلیم کی نگرانی میں تعلیم دی جاتی تھی لیکن اب زنانہ ڈگری کالج ایک مستقل ادارے کے طور پر قائم ہو گیا۔ جس کی انتظامیہ کمیٹی میں ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ، بیگم شادانی اور مسز ممتاز حسن پرسنل اسسٹنٹ فنانس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا شامل ہوئیں۔

مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں:

یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاعری کی طرح ناول بھی دلی اور لکھنو ہی سے متعلق رہا۔ اردو کے اولین ناول نگار نذیر احمد دلّی سے اور سرشار لکھنو سے تعلق رکھتے ہیں۔ نذیر احمد اور سرشار نے پہلی مرتبہ اس صنف سے متعارف کروایا اور ابتدائی دور کے ناول نگاروں نے اسے پروان چڑھایا۔ تاریخی اعتبار سے ان میں نذیر احمد کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے اردو میں سب سے پہلے ایک ایسی تخلیق پیش کی جس پر ناول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ یہ تخلیق "مراۃ العروس" ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھی گئی۔ ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶ - ۱۹۱۲ء) نے اردو ناول نگاری کو بعض ایسی صحت مند اور مستحکم روایات دی ہیں کہ آج بھی اردو ناول نگاری ان سے کسی نہ کسی حد تک فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ان کے ناولوں "مراۃ العروس" (۱۸۶۹ء) "بنات النعش" (۱۸۷۲ء) "توبتہ النصوح" (۱۸۷۴ء) "فسانہ مبتلا" (۱۸۸۵ء) "ابن الوقت (۱۸۸۸ء) ایامی (۱۸۹۱ء) اور " رویائے صادقہ " (۱۸۹۲ء) میں سے کوئی ایک ناول بھی ایسا نہیں ہے جس میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت شعارانہ عکاسی نہ کی گئی ہو۔ بقول ڈاکٹر زینت بشیر:

> "نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار اس عہد کے ہندوستان بالخصوص شمالی ہند کے مسلم متوسط گھرانوں کی مستورات کی نفسیات، ان کے خیالات، نظریات و رجحانات کی منہ بولتی تصویر ہیں اور اس عہد کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں" (۲۵)

اپنی بد سلیقگی، مزاج ناشناسی اور بد اخلاقی کی وجہ سے اس عہد کی عورتیں اپنے شوہروں کے لیے جاذب توجہ نہیں رہی تھی۔ اپنے فرائض سے بیگانگی کا نتیجہ ان کے حق میں عموماتباہ کن ثابت ہوتا۔ چنانچہ ایسی ہی عورتوں کی بدولت طوائف کو معاشرے میں پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا۔ مردوں نے اپنے گھر کے جھگڑوں سے دور اپنے عیش اور تن آسانی کے ذرائع تلاش کر لیے۔ یہ عورتیں دلوں کی تسخیر کے تمام حربوں سے واقف تھیں۔ باپردہ گھریلو ان پڑھ لیکن شریف عورت ان ہتھکنڈوں سے کوسوں دور تھی۔ نذیر احمد نے "فسانہ مبتلا میں ہریالی کا کردار جس انداز میں پیش کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مردوں کے بازاری عورت کی جانب مائل ہونے کی ذمہ داری کسی حد تک عورتوں پر عائد کرتے ہیں۔ متوسط طبقے کی تصویر کشی ان کے طبقاتی شعور کی بھی غمازی کرتی ہے لیکن ان کی اصلاحی کوششوں کا نصب العین بڑی حد تک اسی طبقے کی عورتوں کی اصلاح تھا کیوں کہ سوسائٹی کی تعمیر میں عورتوں کی اہمیت کا انہیں قوی احساس تھا۔" مراۃ العروس" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"خانہ داری بدوں عورت کے ایک دن نہیں چل سکتی، مرد کتنا ہی ہوشیار کیوں نہ ہو، ممکن نہیں کہ عورت کی مدد کے بدون گھر چلا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کے مرنے کو خانہ ویرانی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔"(۲۶)

نذیر احمد سمجھتے تھے کہ عورتوں کی حالت مردوں سے کہیں زیادہ اصلاح طلب ہے۔ اس لیے انہوں نے طبقہ نسواں کی پستی کے اسباب اور اس کے مسائل کو خصوصاً اپنے ناولوں میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ناولوں میں جاگیر داری نظام کی ماری ہوئی عورت کی جیتی جاگتی تصویر ملتی ہے۔ جس کو مرد اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ یہاں ان کے تمام پہلو سامنے آتے ہیں، ان کی آپس کی رنجشوں، اخلاقی پستی، جہالت، ضعیف الاعتقادی، رسم و رواج کی پابندی، مذہب اور ارکان مذہب سے بیگانگی اور اسی قسم کی دوسری برائیوں پر جس کی وجہ سے وہ اچھی مائیں اور سلیقہ شعار بیویاں نہیں بن سکتی تھیں، بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔ جس کی ایک مثال" بنات النعش "کی حسن آراء ہے، جس کے متعلق نذیر احمد لکھتے ہیں:

"کوئی خرابی نہ تھی کہ اس کے مزاج میں نہ ہو اور کوئی بگاڑ نہ تھا اس کی عادتوں میں نہ ہو، مکتب میں گئی تو شرارت، بد مزاجی، بد زبانی، خود پسندی، بے باکی، جنگ جوئی، حسد، دروغ گوئی، بد لحاظی، تنگ چشمی لالچ، بے صبری، ستی، بے ہنری، بد سلیقگی، اپنی قدیم سہلیوں کو ساتھ مدرسہ لے جانے کی عادت"(۲۷)

نذیر احمد نے آج تک ان (سرسید) کی دعوت کو رد نہیں کیا تھا اور انشاء اللہ کرے گا بھی نہیں، اور باوجود یکے نذیر احمد ان کی بعض باتوں میں اختلاف بھی رکھتے ہوں تاہم ان کے دل میں سرسید کی ایسی عظمت ہے کہ اگر نذیر احمد ان کے تمام عقائد سے اتفاق رکھے اور ان کو پیر کی تلاش بھی ہوتی تو وہ ضرور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے۔ لیکن نذیر احمد کو اس کا بھی احساس ہے کہ عورت کو اس سطح تک پہنچانے کی ذمہ داری مردوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے عورت کو اس کی انفرادیت اور بنیادی حقوق سے محروم کر کے اسے اپنے تابع فرمان بنا لیا۔ جس کے نتیجے میں عورتوں میں تعلیم مفقود ہو گئی کیوں کہ مردوں کو اندیشہ تھا کہ وہ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد اپنے حقوق سے واقف ہو کر کہیں مردوں کی برابری کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں۔ دوسری طرف یہ بے بنیاد خدشہ جس کا ذکر "مراۃ العروس" میں یوں کیا گیا:

> "مصیبت تو یہ ہے کہ اکثر لوگ عورتوں کو لکھانے پڑھانے کو عیب اور گناہ خیال کرتے ہیں۔ ان کو اندیشہ یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ لکھنے پڑھنے سے عورتوں کی چار آنکھیں ہو جائیں اور غیر مردوں سے خط و کتابت کرنے اور خدانخواستہ کل کلاں کو ان کی پاک دامنی اور پردہ داری میں کسی قسم کا فتور واقع ہو"(۲۸)

تعلیم کے فقدان کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورتیں توہم پرست اور ضعیف الاعتقادی کا شکار ہو ہو گئیں۔ مراۃ العروس" کی اکبری عرف مزاج دار بہو جو اس عہد کی عورتوں کی حقیقی ترجمان ہے۔ اس کردار کے ذریعے نذیر احمد نے عورتوں کی توہم پرست ذہنیت کی عکاسی کی ہے اور بتایا ہے کہ ٹونے ٹوٹکے کے چکر میں پڑ کر عورتیں کس قدر نقصان اٹھاتی ہیں۔ مزاج دار بہو ایک عیار عورت کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنا گھر بار لٹوا بیٹھتی ہے۔ جہالت کے باعث یہ عورتیں رسم و رواج کی شدت سے پابند تھیں اور صدیوں پرانی روایات سینے سے لگائے بیٹھی تھیں اور امور خانہ داری کا سلیقہ جو ان کے اولین فرائض میں شامل ہے، سرے سے مفقود تھا۔ بے توجہی اور عدم واقفیت سے اس معاملے میں جو ابتری اور انتشار پیدا ہو سکتا ہے، اس سے گھر گھر متاثر تھا۔ سینہ پرونا، کھانا پکانا، گھر کی صفائی وغیرہ ایسے امور ہیں جس کا بار عورت کو ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن نذیر احمد نے اس عہد کے شرفاء کی سوسائٹی کے جو مناظر پیش کیے ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں کو ان ذمہ داریوں کا احساس نہ تھا۔ "فسانہ مبتلا" میں مبتلا کی بیوی غیرت بیگم اس عہد کے متوسط طبقے کی عورتوں کی بہترین نمائندہ ہے۔

> "گھر کی صفائی ستھرائی، ساز و سامان کی درستی، انتظام کی خوشی، یہ چیزیں بھی داخل حسن ہیں اور طبیعت میں سلیقہ ہو تو ہاتھ پانو کے اور غیرت بیگم کے تو زبان ہلانے

سے سب کچھ ہو سکتا تھا مگر اس نے ان چیزوں کی طرف کبھی بھول کر بھی توجہ نہیں کی"[۲۹]

اسی قسم کا ایک کردار " مراۃ العروس" کی اکبری ہے۔ جس کے متعلق نذیر احمد کی یہ رائے ہے کہ اس میں سوائے اس کے کہ وہ ایک شریف خاندان کی بیٹی تھی، تعریف کی اور کوئی بات ہی نہ تھی اور یہ بات اس عہد کی بیشتر شریف زادیوں پر صادق آتی ہے۔ شرفاء کی عورتوں کی اخلاقی پستی کا ایک سبب ان کے گھروں میں نچلے طبقے کی عورتوں کی آمد و رفت بھی تھی۔ جن کی صحبت میں رہ کر شریفوں کی لڑکیاں انہیں کے پست مشاغل اختیار کر لیتی تھیں۔ "توبۃ النصوح" میں نعیمہ ایسی ہی عورت ہے۔ جو رذیلوں کی صحبت میں رہ کر شریفانہ زندگی کے اصل مفہوم سے ناآشنا ہو چکی ہے۔ نذیر احمد عورتوں میں بعض ایسی صفات دیکھنا چاہتے ہیں جن پر گھریلو نظام کی درستی کا انحصار ہے۔ اس ضمن میں وہ تعلیم نسواں کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو اچھی مائیں، اچھی بیٹیاں اور اطاعت شعار بیویاں بنانے کا واحد ذریعہ تعلیم ہے اور عورتوں کی بہترین صلاحیتیں بغیر تعلیم کے مکمل طور پر نہیں ابھر سکتیں۔ لیکن یہ تعلیم ان کے نزدیک صرف مذہبی، اخلاقی اور خانہ داری سے متعلق ہے۔ گویا وہ تو نسواں کا نہایت محدود تصور رکھتے تھے۔ چنانچہ موافقت پیدا کرنے کی بہترین تدبیر نذیر احمد کے خیال کے مطابق یہی ہے کہ جوی اطاعت سے، فرمانبرداری سے، خوشامد سے، جس طرح ممکن ہو، شوہر کو راضی رکھے۔ "مراۃ العروس" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"عورت کا پیدا کرنا صرف مرد کی خوش دلی کے واسطے تھا اور عورت کا فرض ہے مرد کو خوش رکھنا۔ افسوس کہ دنیا میں کس قدر کم عورتیں اس فرض کو ادا کرتی ہیں"[۳۰]

اگرچہ برصغیر کے تاجی نظام میں یہ گنجائش بہت کم تھی کہ خواتین تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کر سکیں پھر بھی اس صدی کے دوران انہوں نے جو ادب تخلیق کیا اسے نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس صدی میں خواتین نے جو ادب تخلیق کیا وہ اردو ادب کے ورثے میں بہت اہم اور باوقار اضافہ ہے۔ اس کے ذریعے سے تخلیقی اظہار کی کچھ ایسی جہتیں سامنے آئی ہیں جن کی وجہ سے ان کا خصوصی مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ اس صدی کی ابتداء سے خواتین نے تعلیمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا۔ لاہور سے محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج) رسالہ تہذیب نسواں نکال رہی تھیں۔ اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا۔ ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ سے ماہنامہ خاتون جاری ہوا۔ یہ رسالہ شیخ محمد عبد اللہ اور ان کی بیگم نے جاری کیا تھا یہ وہی شیخ عبد اللہ اور بیگم عبد اللہ ہیں جو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے اور انہوں نے تعلیم

نسواں کی تحریک کو آگے بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہی کی کوششوں سے ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا پہلا اسکول علی گڑھ میں قائم ہوا۔

خواتین کے رسائل اور خصوصاً ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" کے اجراء کے بعد لکھنے والی خواتین اردو ادب کے منظر نامے میں باضابطہ طور پر داخل ہوئیں۔ یہ رسائل وہ معتبر حوالے ہیں جس سے ابتدائی دور کی خواتین کی تخلیقات اور ان کے فکر و عمل پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ ان رسائل کی لکھاریوں کے نزدیک بیوی کی زندگی کا اصل مقصد شوہر کی خدمت کرتا ہے۔ لیکن نذیر احمد چاہتے ہیں کہ عورتیں شوہروں کی رضا جوئی کو اپنا ایمان سمجھیں اور نفس کشی اور مزاج شناسی کی صفات اپنے اندر پیدا کریں۔ یہ خصوصیت جہاں " توبۃ النصوح" میں نصوح کی بیوی کے اندر ہے وہاں " مراۃ العروس" کی اصغری میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں جس مثالی عورت کا تصور ابھرتا ہے، وہ دراصل مسلمانوں کے متوسط طبقے سے وابستہ ہے۔ جو معاشی اعتبار سے مردوں کی دست نگر اور کسمپرسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ سماجی زندگی میں اسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ فہمیدہ کبیر لکھتی ہیں:

> "عورت کی اصلاح کے معاملے میں نذیر احمد کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا لیکن مذہبی تصورات اور جاگیری دور کے رسوم و روایات کے شکنجے اتنے سخت تھے کہ نذیر احمد کوششوں کے باوجود اپنے آپ کو پوری طرح آزاد نہ کر سکے "[۳۱]

در حقیقت نذیر احمد بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ اس لیے عورت کی اصلاح میں بھی وہ مذہب کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عورت کے حقوق کے قائل تھے مگر صرف اسی حد تک جتنی مذہب اجازت دیتا ہے۔ وہ عورت کو بیوگی کی صورت میں عقد ثانی کا حق دیتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک یہ مناسب نہیں کہ وہ پردے سے باہر آکر مردوں کے دوش بدوش کام کرے۔ عورت کی معاشی آزادی کے لیے وہ اس حد تک قائل ہیں کہ وہ گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے کسی ہنر یا دستکاری کے ذریعے اپنا پیٹ پال سکے۔ عورت کا سب سے بڑا فرض ان کے نزدیک گھرداری ہے۔ جس کے لیے وہ تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ سب سے پہلے دیکھنے کی بات ہے تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے؟ اچھا رویہ ان کے قوائے عقلی ہیں، یہ انتفاع ان کے ذہنوں میں کہاں سے آیا؟۔ آب و ہوا تو وہی ہے جو پہلے تھی لیکن تاریخ بتا رہی ہے کہ اب سے چار سو برس پہلے ہمارے ملک کے گونڈوں اور جھیلوں کی طرح اہل یورپ بھی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بہت سے ملک

ہیں جن کی آب وہوا اسے ملتی جلتی ہے اور وہاں کے باشندے کندہ ناتراش یاہو اور یورپ کو ہے سامان کی تعلیم کا تیر ہے جو یورپ میں کھیل کے ساتھ دی جارہی ہے۔ بقول فہمیدہ کبیر:

" عورت کا سب سے بڑا فرض ان کے (نذیر احمد) نزدیک گھر داری ہے، جس کے لیے وہ تعلیم کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ تعلیم بھی گھر کے اندر ہونی چاہیے، مغربی تعلیم نہیں۔ جس کے لیے پردے سے باہر آنا ضروری تھا۔ نذیر احمد اس محدود تعلیم پر اس لیے بھی زور دیتے ہیں کہ اس سے بچوں کی تربیت میں بھی مدد ملتی ہے۔ سماجی حیثیت سے وہ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ عورت کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر شوہر کی مطیع رہے لیکن عورت کی جس صفت کو وہ سب سے زیادہ سراہتے ہیں وہ اس کی مذہبیت اور دین داری ہے "(۳۲)

مولوی نذیر احمد کا نظریہ اصلاحِ نسواں:

اردو زبان میں کہانی کا سفر تخیلی رومانی اور رنگین وادیوں سے شروع ہوا تھا لیکن انگریزی تعلیم نے اپنا ایک نیا رنگ روپ اختیار کیا اور ناول بن کر نذیر احمد کی رہنمائی میں حقیقت کی دنیا میں قدم رکھا۔ پس تعلیم کے مفید و نا مفید ہونے کا معیار ٹھہرا انسان کی آسائش، انسان کی عافیت تعلیم کی روستا میں ہو گئیں، جو تعلیم انسان کے قوائے عقلی ڈولپ کرے اس کو ہم دنیاوی تعلیم کہیں گے اور جو تعلیم انسان کی تمدنی حالت کی اصلاح کرے، اس کو دینی۔ یہ امر داخل ہدایت ہے کہ اہل یورپ کے قوائے عقلی بڑے زوروں پر ہیں اور ریل اور اسٹیمر اا ور تار برقی اور انواع واقسام کی مشینیں انہیں زوروں کے آثار میں دو چار سیدھی سادھی لین دیکھنے کا اتفاق ہوا، خدا علیم ہے کہ انکا ترکش وساخت سمجھ میں نہیں آتا۔ کیسے ذہن ہوں گے جنہوں نے ان کو ایجاد کیا ہو گا۔ مولوی نذیر احمد نے پہلی بار اپنے عہد کی سیاسی، معاشی، ثقافتی اور اخلاقی تبدیلیوں کو اپنے ناول کا موضوع بنایا اور اردو کے افسانوی ادب میں حقیقت نگاری کی ابتدا کی، ان کی ہر کہانی میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی خصوصاً دلی کے متوسط مسلمان گھرانوں کی زندگی کی بھی عکاسی ملتی ہے، مولوی نذیر احمد نے مار اداری بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانہ مبتلا، ابن الوقت، ایامی / رویائے صادقہ وغیرہ ناولوں کے ذریعہ اپنے عہد کی سماجی حقیقتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ مولوی نذیر احمد کا شمار سرسید کے ان رفقا میں ہوتا ہے جنہوں نے مسلمانوں میں مغربی تعلیم خصوصا انگریزی کی اہمیت کو فروغ دینے میں نہایت ہی اہم خدمات انجام

دیئے ہیں۔ سر سید کے مذہبی نظریات کے اختلاف کے باوجود مولوی نذیر احمد ان کی تعلیمی تحریک کو مسلمانوں کی ترقی کے لیے بے حد ضروری سمجھتے تھے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سائنس اور علوم جدیدہ کے بغیر مسلمانوں کی اصلاح ممکن نہیں۔

یوں تو مولوی نذیر احمد نے عام رواج کے مطابق ابتدائی تعلیم مکتب میں پائی تھی، ان کے والد مولوی سعادت علی نے بھی انہیں مذہبی تعلیم دی اور انہیں عربی اور فارسی پڑھایا کچھ دنوں تک انہوں نے نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر، سے بھی تعلیم حاصل کی لیکن ان کے تبادلہ کے ہر سال بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، اس کے بعد ان کے والد نے انہیں پنجابی کڑے کی مسجد کے امام متولی عبد الخالق کے حوالے کر دیا جہاں ان کی تعلیم تو شاید ہوئی بھی یا نہیں البتہ ان کا وقت ضرور ضائع ہوا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ کے تھے تو ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا، گھر کی ساری ذمہ داریکا بوجھ ان پر پڑ گیا۔ چنانچہ انہوں نے طالب علمی کے زمانے ہی سے ٹیوشن کرنا شروع کر دیا۔ اس زمانہ میں دلی کالج کی بڑی شہرت تھی چونکہ یہاں مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی، سائنسی، اور معلومات عامہ کے متعلق تعلیم دی جاتی تھی جہاں اعلیٰ طبقہ خصوصاً امیروں اور رئیسوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے، مولوی نذیر احمد کی اچانک ملاقات اس کالج کے پرنسپل کارگل سے ہو گئی، وہ ان کی علمی صلاحیت اور دلچسپی سے متاثر ہوا اور اس نے انہی کالج میں داخل ہونے کی اجازت دیدی اور چار روپے ماہوار دینے بھی مقرر کر دیا۔ مولوی نذیر احمد نے باقاعدہ طور پر انگریزی کی کوئی سند یا ڈگری حاصل نہیں کی بلکہ اپنی کوشش اور بے پناہ شوق سے صرف انگریزی بلکہ سنسکرت اور ملنگی زبان میں بھی لیاقت حاصل کی ہے۔ ان کی انگریزی کی صلاحیت میں اس وقت اضافہ ہوا جب وہ ڈپٹی انسپکٹر ہو کر الہ آباد گئے جہاں ان کا قیام انگریزی زبان کے ماہر عبد اللہ خاں امن کے یہاں ہوا انہوں نے نذیر احمد کو انگریزی سیکھنے کی طرف راغب کیا، اس کے علاوہ بعض انگریزی افسران سے بھی نذیر احمد کے تعلقات بہت اچھے تھے خصوصاً سر .Mr Low سے ان کی اچھی رفاقت تھی مسٹر لو سے نذیر احمد ولیم میور اور ان کے داماد مسٹر لو انگریزی میں خط وکتابت کرتے تھے اور ان سے اصلاح لیتے تھے۔

اعظم گڑھ کے قیام کے دوران بھی مولوی سے تعلقات پیدا ہوئے، نذیر احمد ایک انگریز (.Mr Rev. Skelton) سے ملے اور ان سے انگریزی زبان میں توریت سے استفادہ کیا اس طرح مولوی نذیر احمد نے اپنی کوششوں سے انگریزی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ انہوں نے انڈین پینل کورٹ کا ترجمہ "تعزیرات ہند" کے نام کیا۔ ان کی انگریزی دانی اور ترجمہ نگاری کا عام چرچا ہونے لگا، اس کے صلے میں ان کو

ولایت سے ایک گھڑی انعام میں ملی جس پر ان کا نام کندہ تھا یہ تحصیلداری کے عہدے سے ترقی کر کے جب وہ ۱۸۶۳ میں کانور اور پھر گورکھپور آئے تو انہوں نے قانون شہادت کا عالمانہ متن کا ترجمہ کیا یہ یہاں سے تبدیل ہو کر جب اعظم گڑھ آئے تو انہوں نے انگریزی کی ایک کتاب (Colman Heavens) کا ترجمہ "سماوات " کے نام سے کیا ہے جس پر انہیں حکوت برطانیہ کی طرف سے ایک ہزار روپے کا انعام بھی دیا گیا۔ اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں انگریزی تعلیم کی اہمیت کا نہ صرف احساس تھا کہ انہوں مولوی نذیر احمد کی تعلیمی کاوشوں کے اس پس منظر میں جب ان کے تصورات اور خیالات کا تجزیہ کرنے کی حیرت انگیز طور پر قدرت حاصل کرلی جس کے لیے انہیں برطانوی حکومت کی طرف سے اندان نے اس کے حصول کے لئے انتھک کوشش کی اور اپنے بے پناہ شوق اور دیسی سے اس زبان ہیں بھی دیئے گئے اور اعلی مرتبہ بھی ملا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مولوی نذیر احمد اپنے نام کیا تھا کہ اور نظریات پر سختی سے کاربند بھی تھے، وہ مذہبی تعلیم کو بھی اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ مغراب علوم وانکار کو مسلمانوں کے لئے ضروری اور اہم سمجھتے تھے۔ اور اس کی طرف رجوع ہونے کی ترغیب دیتے تھے۔

بشریات کی تاریخ کی روشنی میں یہ تو مطالعہ کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے کہ کسی خاص دور میں یا ماضی میں نسوانی کرداروں کا مطالعہ کس حریک صحیح یا غلط ہو؟ اس کی وجوہ کیا تھیں؟ تنقید نگار کی قدر کی کسوٹی کیا تھی؟ گذشتہ تصورات ہی کی اس نے توثیق کی ہے یا اپنی بصیرت کا بھی استعمال کیا ہے؟ وہ کون سے تعصبات ہیں جو صحیح قدر شناسی کی راہ میں پہلے بھی حائل تھے اور اب بھی ہیں؟ محض نسوانی کرداروں کے تجزیے پر ہی بات ختم نہیں ہوتی بلکہ خواتین ادیبوں کو ایک فرد کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے یا ایک صنف کی حیثیت سے؟ خاتون ادیبہ نے سوسائٹی کے کن مقررہ معیاروں کو من و عن قبول کر کے کوئی تصنیف کی ہے یا ایک عورت ہونے کے ناطے انہی اقدار پر قناعت کرلی ہے جنہیں اس نے روایت کے سلسلے سے پایا ہے۔ تاریخی اور تہذیبی جبر نے ان کی ذات شخصیت اور مجموعاً ان کے کردار Behaviour پر کس قسم کے منفی اثرات قائم کیے ہیں؟ کیوں کہ جب عملی کردار ہی شخصیت اور میلان کی کسوٹی ہے تو ہمارے ان عوامل کا مطالعہ ضروری ہوگا جن کا نتیجہ عورت کی مسخ شدہ شخصیت ہے۔ یہاں ہمیں ایک طرف مارکسی نظریہ تاریخ کی روشنی میں عورت کو ایک علاحدہ باب مہیا کرنا ہوگا کہ اساطیری دور سے لے کر مذہبی ادوار تک اور ارتقا کے مختلف کروں میں محض ایک خاص طبقہ (Class) ہی نہیں ایک مخصوص صنف (Gender) بھی پوری متاثر ہوئی ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ فرائڈ کے اکثر نفسیاتی حقیقی تصورات متوسط طبقے کی اخلاقیات سے مغلوب ہیں۔ اس کے نزدیک مرد ایک مکمل ہستی ہے جب کہ عورت محض ایک آختہ ہے۔"خودبینگ "عورت کی آزادی اور صنفی مساوات کو ایک واہمہ سے تعبیر کرتا ہے۔ بعض تانیثی نقادوں نے مارکس کی جبریت کی تھیوری کا اطلاق طبقہ کے ساتھ صنف پر بھی کیا ہے۔ مارسی تانیثی نقادوں نے مرد اساس معاشرے اور اس کی مختلف ادارہ بندیوں کے رد عمل کے طور پر عورت کی بے گانہ واریت کا مطالعہ کیا ہے کہ کیوں کر دومیدان عمل سے اپنے آپ کو علاحدہ محسوس کرتی ہے؟ اسی طرح مرد ایک مخصوص مقام پر ہی اس کا تعین کیوں کرتا ہے۔ جہاں فردیت اپنی ہلکی سی جھلک دکھاتی ہے وہاں تفکراؤ کی صورت کیوں پیدا ہو جاتی ہے؟ اس معنی میں اوتھلو کی ڈیسنڈی مونا ایک مکمل پر دلی کا نمونہ ہونے کے باوجود علاحدگی کے جبر سے پیدا ہونے والی صورت حالات کا ایک مجہول پیکر ہے۔ اور ہارڈی کی ٹیس [Tess] موجود فی الخارج کو مسلسل صدمہ پہنچانے سے عبارت ہے۔ ٹیس کا کردار مقررہ اخلاقیات کے خلاف ایک باغیانہ اقدام ہے وہ اپنے ضمیر کی آواز پر اپنی شخصیت بنانا اور منوانا چاہتی ہے مگر معاشرتی تحریمات کا جبر ہر بار اسے مسخ کرنے کے درپے ہے۔

بالآخر ایک جبریہ سپردگی اس پر عاید کر دی جاتی ہے اور اس طرح اسے بنی بر مرد سوسائی کی دہلیز پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ ڈیسڈی موتا عبدالریقے کی اخلاقیات کے جبر کا پیکر ہے جب کہ ٹیس وکٹورین عہد کی کافی حد تک تبدیل شدہ اخلاقی صورت حال کا مسخ شدہ پیکر۔ اس لیے وہ تصادم جو ٹیس سے عبارت ہے ڈیسڈی مونا کے یہاں تقریبا پیدا ہے۔ علاحدگی یا بے گانگی سے پیدا ہونے والے مسائل اور کرداروں کی سائیکی کا مطالعہ تحلیل نفسی کے ذریعے کیا گیا ہے۔ نفسیاتی تانیثی نقادوں نے نہ صرف شخصیات کو نخ پایا بلکہ ان ے انکار اور عمل کو بھی نامکمل ٹوٹا پھوٹا یا ادھورا پایا۔ مرد نے نہ تو عورت کو بحیثیت ایک فرد اور ایک نامیاتی ہستی کے طور پر پیش کیا اور نہ عورت نے اسے اظہار کی پوری قدرت عطا کی۔ کیوں کہ خالق اور مخلوق دونوں کا درد مخصوص ہے اور ان کی اپنی حدیں متعین کر دی گئیں ہیں۔ اسی لئے عصمت چھائی جب اسے منیر کی اور پر ایک کہتی ہیں اور مرد ساز مکاریوں کا پردہ فاش کرتی ہے۔ اس ضمن میں ٹیڑھی لکیر کی دشمن کا کردار توجہ طلب ہے۔ جب رشید جہاں، راشد الخیری یا ڈپٹی نذیر احمدی مسخ شدہ اخلاقیات کے برخلاف عورت کی جبریہ حکومی اور جنسی غلامی کو اپنا موضوع بناتی ہیں تو ان کے احتجاج کی لے بعض ساعتوں کے پردے چاک کر دیتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی پت جھڑ کی آواز کی کنیز فاطمہ ہو کہ سیتاہرن کی بیتا مندانی کا کردار اس ہر دو صورت کا مطالعہ لاشعوری محرکات، گرہوں Complexes تحریمات اور سخ شدہ تہذیبی ساختوں کی روشنی میں کیا جانا چاہیے۔ بعض

نقادوں نے افسانوی کرداروں کے علاوہ خاتون ادیبوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے۔ ان کے نفسیاتی مطالعات میں تہذیبی ساختوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ مثلاً دور جیناوولف نے اس مسئلے پر خاصی بحث کی ہے۔ انہوں نے خط مستقیم کے جوڑنے والے دو نقطوں کے علاوہ ایک تیر القطہ بھی بنایا ہے اور وہ ہے قاری، اس طرح تانیثی تنقید کے وضعی مباحث کے درج نشانات ہیں:

- وہ عورت جو مقررہ ضابطوں اور روایتوں پر قائم ہے اور اپنے نسوانی کرداروں اور موجودہ صورت حالات پر قانع۔۔ وہ عورت جو کلیوں کو توڑنے کے درپے ہے اور تاریخی و تہذیبی جبر کے خلاف روبہ جنگ ہے اور جس کے نسوانی کرداروں میں فردیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔
- وہ مرد جس نے عورت کو مرد کے زاویے سے دیکھا ہے۔ یعنی حقیقت نہی کا مرد اساس تصور جس کے تحت مرد کو ذہن میں رکھ کر نسوانی کرداروں کی تخلیق کی جاتی ہے۔
- وہ مرد جس نے اسے ایک فرد کے طور پر دیکھا ہے یا دیکھنے کی سعی کی ہے۔ بعض مرد ادیوں نے اصولی طور پر نہیں بلکہ محض ہم دردی کے طور پر اس کی کردار سازی کی ہے جو خود ایک پدرانہ اور مرد اساس تصور ہے۔ مگر بعض مردوں اور عورتوں نے ان سطحوں سے اوپر اٹھ کر تخلیق و تجزیہ کرنے کی بھی سعی کی ہے۔
- مرد قاری اور عورت قاری کی مخصوص نفسیات، ان کی توقعات اور تعصبات۔

مندرجہ بالا اقتباس سے مولوی نذیر احمد کے تعلیمی نظریات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے، انھیں اپنی قوم کی بدحالی کا بخوبی ااحساس تھا کہ مغربی علوم و افکار اور سائنس کی تعلیم حاصل کیے بغیر قوم کی ترقی ممکن نہیں کیونکہ سائنس کے خزانے انگریزی صندوقوں میں بند تھے اور ان خزانوں تک رسائی صرف انگریزی تعلیم کی کنجی سے ہو سکتی تھی۔ لہٰذا انھوں نے نہ صرف خود انگریزی تعلیم حاصل کی بلکہ مسلمانوں کو بھی اس تعلیم سے بھرپور استفادہ کرنے کی ترغیب دی۔ دراصل مولوی نذیر احمد اپنے عہد کے بہت بڑے مصلح اور مفکر تھے، وہ زندگی کے ہر موڑ پر مسلمانوں کو اپنے خیالات اور تصورات سے آگاہ کرتے تھے۔ ان کے اندر جو قومی جذبہ تھا وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اس صدی کے ربع اول میں جوش، نیاز اور یلدرم وغیرہ کا اصرار عورت کی نازک اندام منی تخصیص پر تھا کہ وہ شمع خانہ ہے یا راحت قلب و جاں کا ساز یا محض ایک رومانی خیال و خواب۔ ان حضرات نے بھی عورت کو محض ایک ٹائپ بنانے کی سعی کی ہے۔ ادبی نقادوں نے خارجی سطح پر موجود تصورات کا اطلاق ادب پر تو کیا مگر اپنے ذہن سے اس بھرم کو نہیں جھٹک سکے جو ایک خاص طبقہ داری اور

صنف داری سوسائٹی کالازمی نتیجہ ہے۔ ادب کا مطالعہ زبان اور روایت کے ساتھ پوری زندگی کے سیاق و تناظر کا مطالعہ ہے۔ اس تناظر میں عورت بحیثیت ایک افسانوی کردار کے بحیثیت ایک مصنفہ کے بھی موجود ہے۔ البتہ تحلیل نفسی اور مارکسیت کے بعض تصورات نے تانیثی تنقید کے تفہیمی دائرے کو کافی حد تک وسیع کیا ہے۔ تانیثی تنقید اپنی اکثر صورتوں میں ایسے ہر مطالعے کے رد کا نام ہے جس کا اصرار مرد وزن جیسے کرداروں کی علاحدہ علاحدہ متعصبانہ تخصیص پر ہے۔

حوالہ جات

۱. عظمٰی فرمان،ڈاکٹر،نسائیت ایک تعارف،مشمولہ:اردو ادب اور تانیثیت،مرتبہ:قاضی عابد ، ڈاکٹر، پورب اکادمی،اسلام آباد،۲۰۱۲ء،ص۵۹

۲. عقیلہ جاوید،ڈاکٹر،اردوناول میں تانیثیت،بہاؤالدین زکریایونی ورسٹی،ملتان،جولائی۲۰۰۵ء،ص۱۹

۳. شرافت حسین شفقت،سید،عورت،مذہب اور حکومت،نسیم بک ڈپولاہور،(سن)،ص۱۵

۴. ابن حنیف،ہزاروں سال پہلے،مکتبہ کارواں،لاہور،۱۹۶۰ء،ص۱۶

۵. ایضاً،ص۱۹-۲۰

۶. ابن حنیف،دنیاکاقدیم ترین ادب،بیکن پبلی کیشنز۔ملتان،۱۹۸۷ء،بارِدوم،ص۶۶۳

۷. سیمون دی بووا،دی سیکنڈ سیکس،مترجم:یاسر جواد،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۳،ص۱۹۷

۸. مبارک علی،ڈاکٹر،قدیم مصری عورت،(سہ ماہی تاریخ)فکشن ہاؤس کاکتابی سلسلہ-۳،۱۹۹۹ء،ص۲۳

۹. ملک حسن اختر،ڈاکٹر،تاریخ ادب اردو،لاہور:ابلاغ۱۹۹۶ء،ص۹۹

۱۰. غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء، ص۱۴۶

۱۱. ایضاً،ص۱۴۷

۱۲. سیمیں ثمر فضل،ڈاکٹر،ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ،اے ون فوٹو آفسیٹ،دہلی،۱۹۹۱ء،ص۸۷-۸۸

۱۳. ایضاً،ص۹۲

۱۴. ایضاً،ص۹۳

۱۵. شیخ یاد علی،مسز،حیدر آباد زنانہ ایسو سی ایشن کا ایک خاص جلسہ،مشمولہ: خاتون،شمارہ نمبر۴،اپریل ۱۹۰۸ء،مطبع فیض عام،علی گڑھ،ص۱۲۶

۱۶. ایضاً،ص۱۲۷

۱۷. نذیر احمد،ڈاکٹر، تعلیم زمانہ، مشمولہ: خاتون، شمارہ نمبر۳،جون۱۹۰۵ء،مطبع فیض عام، علی گڑھ، ص۱۰۰-۱۰۲

۱۸. ابواللیث صدیقی،ڈاکٹر، آج کااردوادب،ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ،۱۹۷۵ء،ص۳۳

۱۹. محسن الملک، نواب، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (دسواں اجلاس) شاہجہاں پور، ۱۸۹۵ء ص ۸۸

۲۰. نذیر احمد، ڈاکٹر، تعلیم زمانہ، مشمولہ: خاتون، شمارہ نمبر ۳، جون ۱۹۰۵ء، مطبع فیض، علی گڑھ، ص ۱۱۶-۱۱۹

۲۱. قمر رئیس، ڈاکٹر، سجاد حیدر یلدرم چند ابتدائی تحریروں کی روشنی میں، مشمولہ: سیمیں فضل، ڈاکٹر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ، اے ون فوٹو آفسیٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۰۸

۲۲. جہاں، سلطان، خطباتِ سلطانی، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۳ء، ص ۸۳

۲۳. رجب علی بیگ، سرور، فسانہ عجائب، مرتبہ: رشید حسن خاں، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۰

۲۴. کاظم علی جوان، شکنتلا، مجلس ترقی ادب، لاہور، بارِ اول، ۱۹۶۳ء، ص ۱۰

۲۵. زینت بشیر، ڈاکٹر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۱

۲۶. نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۸۰۱

۲۷. نذیر احمد، ڈپٹی، بنات النعش، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۶۶

۲۸. نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس، ص ۱۲

۲۹. نذیر احمد، ڈپٹی، فسانہ مبتلا، تعریف پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۰۴

۳۰. نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس، ص ۸۴۳

۳۱. فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، بار اول، ص ۳۵

۳۲. فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور، ص ۳۶

باب دوم:

نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاح نسواں کا تصور:
خواتین کی تعلیم کے تناظر میں تقابلی مطالعہ

الف: خواتین کا حقِ تعلیم اور اردو ناولوں میں اس کے اظہار کی مختلف صورتیں:

بلاشبہ اردو ناول نگاری نے ہر طبقے کی خواتین میں تعلیم کی اہمیت اور اس کے حصول کی خواہش کو مہمیز کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اردو ناول نگاری نے ملک کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکات کا کینوس وسیع کرنے کے لیے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ یہ امر آج تک خوش آیند رہا ہے کہ ابتدائی ناول نگاروں نے اپنی نگارشات و تخلیقات میں عصری تقاضوں کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان عصری تقاضوں میں اولین تقاضا خواتین کی تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ جس طرح تعلیم حاصل کرنا مردوں کے اخلاقی اور سماجی شعور کے لیے ضروری ہے اسی طرح خواتین کی سماجی اور اخلاقی تربیت کے لیے ان کی تعلیم نہایت ضروری ہے جو خواتین کا حق بھی ہے۔ خواتین کی تعلیم کے لیے اٹھائے گئے اقدام کی کیا نوعیت ہونی چاہیے۔ جو جدید انتظام عورتوں کی تعلیم کا اس زمانے میں کیا جاتا ہے خواہ وہ انتظام گورنمنٹ کا ہو اور خواہ اسی طرز کا انتظام کوئی مسلمان یا کوئی انجمن اسلامی اختیار کرے، اس کو پسند نہیں کیا جا سکتا۔ عورتوں کی تعلیم کے لیے مدرسوں کا قائم کرنا اور یورپ کے زنانہ مدرسوں کی تقلید کا ہندوستان کی موجودہ حالت کے کسی طرح مناسب نہیں ہے اور سرسید اس کے سخت مخالف تھے۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ انگلستان میں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مدرسے میں وہ اسی طرح ان میں جمع ہو کر پڑھتی ہیں جس طرح کہ لڑکے جمع ہو کر مدرسوں میں پڑھتے ہیں اور رہتے ہیں۔ اس امر کو سرسید کے اس بیان سے واضح کیا جا سکتا ہے:

> " میں نے بالتخصیص لندن میں بعض اپنے دوستوں کی مہربانی سے ایسے زنانہ مدرسوں کو جہاں اشراف لڑکیاں پڑھتی اور رہتی تھیں، دیکھا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو حالت عمدگی اور طمانیت اور تعلیم و تربیت کی ان مدرسوں میں ہے ہندوستان کو وہاں تک پہنچنے کے لیے ابھی سیکڑوں برس درکار ہیں۔ اگر فرض کرو کہ ایسے مدرسے ہندوستان میں ہوں تو میں ہر اشراف خاندان سے کہوں گا کہ بے شک اپنی لڑکیوں کو یہاں بھیجو لیکن اگر دوستو! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان

میں ابھی ایسا ہونا محالات سے ہے عورتوں کو جس قسم کے علوم پڑھائے جانے کا خیال پیدا ہوا ہے اسکو بھی میں پسند نہیں کرتا کیونکہ نہ وہ ہماری حالت کے مناسب نہیں "(۱)

اردو کے ابتدائی ناول نگاروں نے نہ صرف تعلیم کی اشاعت پر زور دیا بلکہ سماج کی اصلاح کو بھی مدِ نظر رکھا۔اس سماجی پس منظر میں سر سید کے کچھ ساتھیوں نے خواتین کی تعلیم اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا،اور اس مقصد کے لیے انھوں نے قصہ گوئی یا ناول کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔اردو کا پہلا ناول "مراۃالعروس" ہی ڈپٹی نذیر احمد نے خواتین کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لیے لکھا کیونکہ ناول ہی کو وہ صنفِ نثر تصور کیا گیا جس کے استعمال سے عورتوں کی تہذیبی اصلاح اس طور سے ممکن تھی کہ وہ بنا اکتائے اور گھبرائے ایک قصہ کی صورت اسے پڑھ کر اپنی اصلاح کر سکیں۔اس کا جواز اس بات میں مضمر ہے کہ ناپختہ و ناتجربہ کار ذہن ایسے پیچدار مسئلے کی جانب کیونکر متوجہ ہو،یعنی اس کی توجہ حاصل کرنے کے لیے عام فہم اور دلچسپ اظہارِ بیان درکار تھا جو انھیں اس نازک معاملے کو سلجھانے میں مدد دے سکے۔الغرض انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کا دور اس حوالے سے ایک خوشگوار دور ہے جس میں اردو ناول نگاروں نے اپنے ناولوں کے ذریعے تعلیمِ نسواں کے عظیم کام کو سر انجام دینے کے لیے بیڑہ اٹھایا۔نذیر احمد کے بعد حالی، شبلی،افضل الدین،رشیدۃالنساء،عبدالحلیم شرر،صغرا ہمایوں،مرزا عباس حسین ہوش،سید احمد دہلوی،مولوی بشیر الدین اور نذر سجاد حیدر کے نام آبِ زر سے لکھے جاسکتے ہیں۔

اس زمانے میں مولانا نذیر احمد (دہلوی) کی مراۃالعروس،بنات النعش، محصنات،رویائے صادقہ اور ایامی معرکے کی کتابیں تھیں۔ مولانا حالی نے بھی ایک یادگار کتاب مجالس النساء لکھی تھی جو کچھ عرصے تک پنجاب کی درس گاہوں میں داخلِ نصاب رہی اور عرصہ دراز تک خانگی تعلیم میں اس سے بڑا فائدہ پہنچتا رہا۔ مولانا سید احمد دہلوی نے بھی چند کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔نواب شاہجہاں بیگم (خلد مکان) نے ایک ضخیم کتاب "تہذیبِ نسواں و تربیت النساء" کے نام سے خانہ داری، مذہب، حفظ صحت تالیف کی جو عورتوں کے مضامین پر مشتمل تھی۔ اس دور میں متعدد اخبار اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر جاری کیے گئے۔ چنانچہ مولوی سید احمد نے لاہور سے "اخبار نسواں" جاری کیا جس میں پردہ اور مذہبی تعلیم کو اشد ضروری قرار دیا۔ صدر اجلاس محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار نے "شریف بی بی" اور مولوی سید ممتاز علی نواب عماد الملک نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے بھی اپنی تقریر میں وسائل وذرائع تعلیم اور اُستانیوں کی نایابی کا

تذکرہ کیا اور آخر میں رزولیوشن اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ حیدر آباد دکن سے مولوی محب حسین نے رسالہ تعلیم نسواں اور اخبار نسواں کی اشاعت کی۔ ان اخباروں نے اشاعت تعلیم میں سب سے زیادہ امداد پہنچائی۔

مولوی سید احمد نے تصانیف اور اخبارات و رسائل کی ابتدا ایسی کتابوں سے کی جو ممتاز علی اور ان کی رفیقہ حیات دونوں نے زنانہ تعلیم کی اشاعت کے ضمن میں اپنے ناولوں کے ذریعے تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کی کوشش کی، ایک طرف انھیں اکتسابی تعلیم کی طرف شوق دلایا اور دوسری طرف نئے نئے علوم سیکھنے کی جانب رغبت دلائی یعنی ان میں صدیوں سے جاری سماجی اور معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی سعی کی اور انھیں بری عادات کے خلاف جہاد کرنے کے لیے تیار کیا۔ انھیں احساس دلایا کہ یہ تعلیم کسی خاص طبقے یا خاص جنس کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ سب کے لیے برابر ہے، عصرِ حاضر میں عورتوں کو اس تعلیم کی زیادہ ضرورت ہے کیو نکہ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری انہی کے ناتواں کاندھوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان گھرانوں میں ان ناولوں کو بے حد پسند کیا گیا اور ایک واضح حد تک ان ناولوں نے معاشرتی اور سماجی رویوں پر مثبت اثر ڈالا اور زمانے کی اکتسابی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی، اس کامیابی کے سبب ان ناولوں کو خواتین کی تعلیم کے لیے تیار ہونے والے نصاب میں شامل کیا گیا۔

ب۔: روایتی تعلیم اور اس کے اثرات سے متعلق کہانیاں اور کردار:

تاریخِ اُردو ناول نگاری جن خواتین ناول نگاروں کے نام سے روشن ہے اُن میں نذر سجاد حیدر (۱۸۹۶ا۔۱۹۶۷ء) کا نام نمایاں مقام کا حامل ہے۔ تعلیمِ نسواں کی تحریک کے ساتھ ساتھ آزادی کی تحریک میں شدت پیدا ہو چکی تھی اور تخلیق کاروں نے تخیل کو سماجی کروٹوں اور عارضی بندھنوں کی پرکھ کے لیے ایک حربے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ نذر سجاد حیدر اُردو کی خواتین ادیبوں میں سر فہرست نظر آتی ہیں، اس وقت اردو کے کئی بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار منظر عام پر آچکے تھے۔ خواتین بھی شہرت اور اچھے خیالات کے ساتھ ابھر چکی تھیں۔ ان میں سیاسی شعور بھی تھا اور آزادی نسواں کا جذبہ بھی اسی لیے شادی سے پہلے ہی وہ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتیں اور اپنے خیالات کا اظہار بے باکانہ طور سے کرتیں۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

"۱۹۲۳ میں نذر سجاد حیدر نے پردہ ترک کر دیا اور ترکِ موالات کے زمانے میں "کھادی تحریک" میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ یلدرم کے ہمراہ مشرق وسطی کا سفر بھی کیا"(۲)

نذر سجاد حیدر نے اس وقت پردہ ترک کر دیا جب مسلم خواتین اسکی جرات نہیں کر سکتی تھیں، علامہ اقبال انھیں "آقازادی" کہا کرتے تھے یعنی رسول اللہ ﷺ کی اولاد۔ قرۃالعین کی ایک تحریر سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال دونوں نذر سجاد حیدر کی آزاد خیالی سے نالاں تھے۔ اس تعلق سے ان کے ماموں (الن) نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان دونوں کی ناراضی کی وجہ شاید یہ ہو کہ نذر آل رسول ہو کر بے پردہ رہتی ہیں، جب نذر سجاد حیدر علی گڑھ سے لاہور گئیں تھیں تو علامہ اقبال نے انھیں اپنے انارکلی والے مکان پر کھانے کے لیے مدعو کیا تھا۔ اسی زمانے میں انھوں نے پردہ ترک کیا تھا۔ اس لیے علامہ اقبالؒ کے سامنے نہیں گئیں تھیں کہ انہیں افسوس ہو گا۔ قرعۃالعین حیدر نے اپنی ایک کزن کے یہ الفاظ بھی نوٹ کیے ہیں جنہوں نے کہا تھا:

"بڑی اماں میں کتنی ہمت تھی جو اپنے زمانے کے grants کو مستقل Deny کرتی رہتی تھیں"(۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذر سجاد حیدر کس قدر بلند خیال اور بے باک تھیں۔ ان کی آزاد خیالی اور افسانہ نگاری کا دور وہی تھا جب اکبر الہ آبادی کی شاعری کا زمانہ تھا۔ اکبرؔ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اسلامی اصول وعقائد کے پابند تھے۔ جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ نذر سجاد حیدر، بیگم محمد شیریف اور ڈاکٹر ہادی حسن کی اہلیہ جو حیدر آباد کی تھیں بے پردہ گھومتی ہیں تو اکبر کو حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ شاید ایسے ہی کسی موقع پر اکبرؔ نے اپنا مشہور قطعہ کہا ہو گا۔ "بے پردہ نظر آئیں جو کل چند بیبیاں" نذر سجاد حیدر نے اپنے مضامین اور ناولوں میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت اگر تعلیم یافتہ ہو تو اپنے ملک و قوم کی اصلاح میں ہر ممکن اور کارآمد جدوجہد کر سکتی ہے۔ نذر سجاد حیدر نے جس عہد میں اپنا تخلیقی سفر شروع کیا وہ ہندوستان میں سیاسی و تہذیبی تبدیلیوں اور کش مکشوں کا عہد تھا۔ ایک جانب حصول آزادی کا جہاد جاری تھا، دوسری طرف ہندوستان میں سماجی سطح پر دور رس تغیرات رونما ہو رہے تھے۔ فرسودہ روایات سے بغاوت اور انحراف سر اٹھا رہا تھا۔ پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں۔ خصوصاً مسلم خاندانی نظام تعلیم نسواں سے کوسوں دور ہونے کے ساتھ ساتھ پردے کا زبردست حامی تھا۔ نذر سجاد حید

رنسواں اور آزادی نسواں کی تحریک کی ایک فعال اور سر گرم رکن رہ چکی ہیں۔ اس دور کے مختلف رسالوں میں اشاعت پذیر ان کے مضامین ان کی اس جہدِ مسلسل کے آئینہ دار ہیں۔ مضامین کے علاوہ ان کے افسانے اور ناول بھی اس عظیم کوشش اور مقصد کو قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے متعدد افسانوں اور مضامین کے علاوہ کئی ناول لکھے ہیں۔ اختر النسا بیگم، جانباز، آہِ مظلوماں، ثریا، نجمہ اور حرماں نصیب، وغیرہ۔

ہماری ادبی روایت میں علاقائی ثقافتوں کا ایک مضبوط دھارا کارفرما ہے۔ پنجاب، سندھ، خیبر پختونخوا، بلوچستان اور کشمیر کی زبانوں میں بلند پایہ ادبی ذخیرہ ملتا ہے۔ پھر فارسی، عربی اور ہندی زبانوں کے رنگ ہماری قومی ثقافت کو روشن کرتے ہیں۔ فرنگی حکمرانوں کے دور میں انگریزی اور اس کے ذریعے دوسرے یورپی اور عالمی ادب کے متون تک ہمیں رسائی ملی۔ لہٰذا اس روایت میں تقابلی ادب کا ایک خزانہ موجود ہے۔ تقابلی ادب اور علومِ ترجمہ کے علاوہ ادب کے دوسرے فنون اور دوسری اصناف سے باہمی رشتہ کی تفتیش بھی تقابلی ادب کے زمرے میں آتی ہے۔ حسن عسکری کے مضامین بھی تقابلی ادب کے شاہکار ہیں جن کا سیر حاصل مطالعہ بین المضمونی طور پر کیا جاتا ہے۔ مطالعہ کے اسی تناظر میں ادب کو صحیح طور پر زندگی کے عکس اور علوم و فنون کے ایک دوسرے پر اثرات کا نعائنی کیا جاتا ہے۔ سوزن بیسنٹ اپنی کتاب تقابلی ادب: تنقیدی جائزہ میں لکھتے ہیں:

> "انگلستان اور ہندوستان میں جین آسٹن اور ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں شادی بیاہ کے فیصلے اور رسم ورواج اور اندرونِ خانہ قبل و بعد از ازدواج کی سیاست کا تقابل سود مند ہو سکتا ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ اور غالب کے کلام میں موت کے تصور و مقام کا تقابل، علیم بٹلر، کیٹس اور اقبال تہذیبی مصادر و منابع اور اہدافِ کلام کا تقابل کیا جا سکتا ہے۔ ورجینا وولف اور قرۃ العین حیدر کا اسلوبی تقابل اور تلمیحات کا موازنہ کیا جا سکتا ہے"[۴]

انیسویں صدی کے انگریزی اور اردو ناولوں میں عورتوں اور بچوں کے ادب کا تقابل ادبیات کے طلبا و محققین کے لیے نئے اور روشن امکانات پیش کر سکتا ہے، قومی اور تقابلی ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تقابلی ادب کی تدریس و تحقیق اس بحث کو مزید سائنٹیفک دلائل فراہم کر سکتی ہے جبکہ دوسرے ممالک میں اس میدان میں ہونے والی ترقی سے ہماری بحثوں کا نتیجہ خیزی میں سہولت ہو سکتی ہے۔

ج۔ جدید تعلیم اور اس کے اثرات سے متعلق کہانیاں اور کردار (بحوالہ ناول: اختر النساء، نجمہ، صبح زندگی، اختری بیگم)

اختر النسا بیگم:

اختر النساء بیگم (۱۹۱۰) نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول ہے۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ ناول اختر النساء در اصل تعلیم کی افادیت اور احتیاج کو مدِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ ہمارا سماج جس طرح کی توہم پرستی اور فرسودہ قسم کے رسم و رواج کا شکار ہے۔ وہ کس قدر اخلاق باختہ اور مضر ہیں۔ ان تمام چیزوں کی بیخ کنی تعلیم کے ذریعے ہی احسن طور سے ممکن ہے۔ ناول کا مطمح نظر دو گھرانے ہیں۔ ایک گھرانہ جاہلیت کا اعلی نمونہ ہے اور دوسرا گھرانہ امن و سکوں کی عمدہ مثال ہے۔ قرۃ العین حیدر رقمطراز ہیں:

> "امی نے چودہ سال کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اور اصلاحی ناول لکھا۔ جس کی ہیروئن اختر النسا بیگم نے مردوں کے معاشرے کے مظالم کا عقلمندی سے مقابلہ کیا۔ اور آخر میں فتح مند ہوئی عموماً مرد امی کے ان ناولوں میں نہایت دغاباز، ریاکار اور بے ہودہ دکھائے جاتے تھے۔ عورت بے حد فرشتہ صفت ہوتی تھی۔ امی کے سارے ناول ان کے طبقے کے اس پس منظر کی بہت ہی عمدہ عکاسی کرتے تھے جس نے پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے اوپری طبقے کی طرح یورپین تہذیب اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔" (۵)

اختر النساء بیگم اس ناول کی ہیروین ہے اور ناول کے آغاز ہی میں اس کی زندگی کے واقعات کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ اختر النسا بیگم کے والد صاحب کا نام مسٹر رفیع ہے جو عمدہ وکیل ہیں۔ اس کی ماں اعلی تعلیم کی حامل خاتون ہے لیکن ماں کی ناگہانی مرگ سے اختر النسا بیگم ماں کی ممتا اور محبت سے محروم رہ جاتی ہے۔ وہ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کانپور بھیجی جاتی ہے اور اس کے والد ایک دخترِ طوائف سے دوسری شادی کرتے ہیں۔ اختر النسا بیگم ساری عمر سوتیلی ماں کے ناروا سلوک کو برداشت کرتی ہے۔ وہ ایک انتہائی گنوار اور جاہل شخص سے شادی کرتی ہے۔ سسرال میں وہ ظلم وجور کا ہدف بنتی ہے۔ ساس اس کو ستانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتی ہے۔ اور بالآخر بہو اور بیٹے دونوں کو گھر سے بے دخل کر دیتی ہے۔ لیکن اختر النساء آفت کی اس گھڑی میں عقلمندی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ شوہر کی قلیل آمدنی پر زندگی کا پہیہ گھماتی ہے لیکن اس کا شوہر وبائی

مرض میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے۔ اس طرح وہ ایک بے آسرا بیوہ (رانڈ) بن جاتی ہے۔ وہ پھر سے سسرال کا رخ کرتی ہے۔ ساس سسر اس کو اپنے بھائی بھاوج کے سپرد کر کے خود حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے ہیں۔ اور اس کو دھکے مار کر گھر سے نکال دیتے ہیں۔ اب اختر النساء بالکل بے یارو مدد گار ہے۔ اس کا کوئی آسرا نہیں ہوتا لیکن اختر النساء حالات کے سامنے شکست تسلیم نہیں کرتی۔ اس ناول کے تعلیمی تناظرات اجاگر کرنے کے لیے عرضِ حال میں نذر سجاد حیدر لکھتی ہیں:

"تعلیم یافتہ لڑکی کا بد مزاج جاہل سوتیلی ماں کی اطاعت کرنا، اس سمجھدار لڑکی کا صبر و تحمل کے ساتھ سب مصائب برداشت کرنا اور انتقال شوہر کے بعد نہایت محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے قومی خدمت میں عمرِ بیوگی بسر کرنا وغیرہ اس ناول کے مضامین مذکور ہیں۔"(٦)

تعلیم کی کمی سے پیدا ہونے والی جہالتوں کے حوالے سے لکھتی ہیں:

"یہ سب خرابیاں فقط جہالت کی وجہ سے ہیں کیونکہ غیر تعلیم یافتہ بی بی اپنی حقیقی اولاد کو اچھی طرح کیا بالکل نہیں سمجھ سکتی، لیکن جہالت قصور مستورات کا نہیں، یہ ان کی قسمت کے مالکوں بلکہ قوم کی غفلت کا نتیجہ ہے، وہ تعلیمِ نسواں کو اپنے حقیقی فرائض میں شمار نہیں کرتے اور اس کے لیے عام کوشش نہیں کرتے، بعض تو فضول ہی سمجھتے ہیں اور بعض سخت مخالف ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ وہ لوگ پھر بھی ترقی قوم کے خواہاں ہیں حالانکہ یہ ناممکن بات ہے کہ ایک ہاتھ کو بے کار رکھ کر ایک ہاتھ سے کام لیا جائے اور پھر یہ خواہش ہو کہ تمام کاروبار دنیا اس ایک ہی ہاتھ سے انجام پائیں"(٧)

یہی وجہ ہے کہ ہماری قوم نے اب تک کچھ ترقی نہیں کی، جن اقوام میں تعلیمِ نسواں کا رواج ہے وہ اعلیٰ معراجِ ترقی پر پہنچ چکی ہیں۔ جن قوموں اور ملکوں میں تعلیمِ نسواں کی طرف توجہ نہیں ان پر تباہی اور بربادی کی گھٹائیں چھارہی ہیں۔ خدا کا لاکھ شکر کہ تہذیبِ نسواں کی زبردست چیخ و پکار سے یہ غفلت شعار قوم بھی بیدار ہو چکی ہے، اور اب سچے خیر خواہِ قوم اس کی فکر میں ہیں۔ علم کے فوائد پوشیدہ نہیں، فی زمانہ جس قدر گھروں میں علم کی راحت بخش شعاعوں سے دماغِ نسواں منور ہو چکے ہیں۔ ان گھروں کا قابلِ رشک ہونا ثبوت ہے تعلیمِ نسواں کے مفید نتائج کا۔ چنانچہ ایسے ہی دو ایک گھروں کا حال ناول کے پیرائے میں میں نے تہذیبِ نسواں میں لکھنا مناسب جانا تھا۔ اس ناول میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی کا سامنا ایک جاہل اور ستم گر زمانے سے تھا،

تمام مظالم کے باوجود وہ اعلیٰ تربیت یافتہ ہونے کا ثبوت دیتی تھی۔ اور تعلیم حاصل کرنے میں جو مشکلات اس نے برداشت کیں وہ ایک الگ باب ہے۔ اختر کو اس کی سوتیلی ماں سکول جانے سے روکتی ہے تو اختر اپنے والد سے کہتی ہے:

> "ابا جان! مجھے صرف یہ رنج ہے کہ میرے ساتھ والیاں میری ہم جماعت مجھ سے آگے بڑھ جائیں گی اور میں پیچھے رہ جاؤں گی، اور مجھے کسے سے کچھ شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو یہ کہ بیگم صاحبہ اسکول میں مجھے کیوں نہیں جانے دیتیں"(۸)

بیگم صاحبہ کی چوری بیان کرتے ہوئے جو شائستہ اور مہذب زبان اختر نے استعمال کی جس سے اس کے والد اختر کی تعلیمی اور تہذیبی استعداد کے قائل ہو جاتے ہیں، ایک جاہل کے منہ سے سنا ہوا قصہ جب وہ ایک تعلیم یافتہ کی زبانی سنتے ہیں تو جہل اور علم کا فرق دیکھ کر سر دپڑ جاتے ہیں۔ اس وقت صورتحال یہ تھی کہ مردوں کا ایک طبقہ انگریز کی تہذیب کی اندھا دھند تقلید میں خود کو مہذب بنانے کی خاطر اپنی تہذیب، مذہب اور روایات سے کٹ گیا تھا اور وہ عورتوں کی اس قسم کی تعلیم کی حمایت کر رہا تھا جسے حاصل کر کے عورتیں ان انگریز عورتوں کی نقالی میں اپنے فرائض کو بھلا بیٹھی تھیں اور اس کو دیکھ کر لوگ تعلیم نسواں کے خلاف ہو رہے تھے۔ اس لیے انیسویں صدی کے شروع میں بہت سے ناول لکھے گئے ہیں جن کا موضوع عورتوں کی غلط تعلیم ہے اور جس میں مغرب کی اندھا دھند تقلید کی مذمت کی گئی ہے۔ جن میں توازن پر زور دیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ تعلیم نسواں کا یہ تصور غلط اور سماج کے لیے تباہ کن ہے۔ اس ناول میں اختر النساء کے علاوہ اس کی ماں، اس کے خالہ خالو اور خالہ زاد بھائی کو اعلیٰ تعلیم اور تہذیب کا نمونہ دکھایا گیا ہے۔ تعلیم کا جو اثر رویوں اور طرزِ گفتگو پر پڑتا ہے اسے واضح طور پر ایک تعلیم یافتہ اور گنوار خاتون سے لگایا جا سکتا ہے۔ صغریٰ مہدی لکھتی ہیں:

> "نذر سجاد حیدر کے ناول اختر النساء کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے۔ جس میں اختر النساء اسکول میں تعلیم حاصل کرتی ہے مگر سوتیلی ماں کے ظلم کی وجہ سے وہ اس کو مکمل نہیں کر پاتی۔ پھر بیوہ ہو کر تعلیم حاصل کرتی ہے اور نوکری بھی کرتی ہے۔ وہ ناول اس نوٹ پر ختم کرتی ہیں: "ناظرین! یہ ہے تعلیم نسواں کا نتیجہ۔ اختر النساء نے کیا کیا دقتیں برداشت کیں"(۹)

اختر النساء نے سرکاری نوکری ترک کیوں کی۔ اس کی وجہ مصنفہ بتاتی ہیں کہ، بیوگی کے بعد گو اختر کا ٹھکانہ باپ کے گھر نہ رہا تھا۔ لیکن وہ تعلیم یافتہ تھی۔ اس کی زندگی اب بھی اچھی طرح گزر سکتی تھی۔ کچھ نہیں تو اسکول ہی میں کام کر کے یا فراغت سے بسر اوقات کر سکتی تھی۔ مگر اس خیال سے اس قدر مصیبتیں اس نے اپنے سر لیں کہ تعلیم کے مخالف یہ نہ کہیں کہ دیکھو تعلیم کا اثر۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا۔ اس کا کیا اچھا نتیجہ نکلا ہے اور بھی خواتین نے بڑی تعداد میں اس موضوع پر ناول لکھے۔ ایک بات قابل لحاظ ہے کہ ایسے ناولوں کی بھی بڑی تعداد ہے جس میں غلط جدید تعلیم کے برے نتائج کو پیش کیا گیا ہے۔ تعلیمِ نسواں کے معترضین اور ان کے اعتراض کو اس ناول مین اس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے کہ ہر اعتراض کا جواب نہایت اعلی انداز سے دیا گیا ہے۔ اختر النسا کے بیوہ ہونے کے بعد گزر بسر کرنے کے لیے نوکری کرنے پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں وہ انیسویں صدی کے آغاز میں ہونے والی تعلیمِ نسواں کے ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں، اس ذیل میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "وہ اسکول میں ملازمت کر کے با فراغت گزر اوقات کر سکتی تھی مگر اس خیال سے اس قدر مصیبتیں اپنے سر لیے ہوئی تھی کہ تعلیمِ نسواں کے مخالفین یہ نہ کہیں کہ " دیکھو! تعلیم کا اثر"۔ وکیل صاحب نے اپنی لڑکی کو پڑھایا تھا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ ہندوستانی رانڈیں ایک کونے میں پڑ کر ساس سسر کی جوتیوں میں عمر بھر بسر کر دیتی ہیں، یہ علامہ نوکری کرنے نکلی!"(۱۰)

ان تمام اعتراضات کو یہ کہ کر رد کیا جاتا ہے کہ میرے کسی عمل سے تعلیمِ نسواں ایک قبیح فعل نہ ٹھہرے یا میرے ابا جنھوں نے نے مجھے اس تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا ہے وہ اپنے اس فعل پر نادم نہ ہوں۔ مخالفینِ تعلیمِ نسواں کے اس قسم کے اعتراضات کو قابلِ توجہ نہیں تاہم وہ زمانے کی نازک حالت سے ڈرتی ہوئی محض اس لیے مصائب برداشت کر رہی تھی کہ مجھ پر جو گذرتی ہے گذر جائے گی۔ مجھ سے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے نا سمجھ مخالفین تعلیمِ نسواں کو بدنام کریں۔ اس ناول میں تعلیمِ نسواں کو خواتین کی ایک ضرورت بھی کہا گیا ہے اور بے آسرا خواتین کا آسرا بھی بتایا گیا ہے۔ اختر دربدر کی ٹھوکریں کھا کے جب بے یارو مددگار ہو جاتی ہے اور گزر اوقات کی کوئی سبیل نہیں رہتی۔ تب ایک خط کے ذریعے اپنے ابا سے زنانہ اسکول میں نوکری کرنے کی اجازت اس طرح مانگتی ہے:

"عرضِ خدمت ہے کہ جو کوئی بھی آپ سے کچھ کہے، آپ یہی کہ دیں کہ میری اجازت سے میری بیوہ لڑکی زنانہ سکولوں کی نگرانی کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ میں نے خود اسے کام میں لگا دیا ہے تاکہ اس کی زندگی بے کار ضائع نہ ہو اور جس قدر وہ تعلیم حاصل کر چکی ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو فائدہ پہنچائے"(۱۱)

اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس ناول کے کرداروں کی اچھائی اور برائی تعلیم کے وجود سے وابستہ ہے۔ اچھے، سلیقہ مند اور مثبت کردار اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور تمام منفی اور بد طینت کردار جاہل ہیں۔ عالم اور جاہل کا یہ فرق ان کے سماجی اور اخلاقی رویوں پر براہِ راست دکھایا گیا ہے۔ تعلیم یافتہ خاتون گھر کو کس طرح جنت کا نمونہ بنا دیتی ہے، اولاد کی اچھی تربیت کرتی ہے اور گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ امورِ خانہ داری سے بچت کر کے کچھ پیسے بھی جمع کرتی ہے اور فضول خرچی سے گھر کی بنیادیں محفوظ رکھتی ہے تاکہ ایمر جنسی کی صورت میں کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔ اس کے مقابلے میں ایک جاہل اور تعلیم سے عاری خاتون گھر کو فساد اور جھگڑے کی آماجگاہ بنا دیتی ہے، بات بے بات جھگڑنا، فضول خرچی اور ہر وقت کی بے سکونی سے گھر جہنم کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک واضح فرق ہے جو اس ناول میں کرداروں کے ذریعے تعلیم کی افادیت اور جہالت کی تباہ حالی کے درمیان دکھایا گیا ہے۔ ناول میں جب خود اختر النسا کا والد اپنی تعلیم یافتہ بیوی اور جاہل بیوی کے بارے بتاتا ہے تو تعلیم کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اپنی تعلیم یافتہ بیوی کے انصرام کو اس طرح بیان کرتا ہے:

"نہ معلوم والدہ اختر کس طرح انتظام کیا کرتی تھیں کہ اسی چھ سو روپیہ آمدنی میں فیشن ایبل اعلیٰ طریق پر گھر کا انتظام بھی کر لیا کرتی تھیں اور پس انداز بھی کر لیتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے میرے گھر کی نو سالہ زندگی میں اٹھارہ ہزار روپیہ جمع کر لیا تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو پورا اٹھارہ ہزار روپیہ بنک میں موجود تھا"(۱۲)

اسی طرح اپنی جاہل بیوی کے طریق کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"جس وقت میں گرفتارِ بلا ہوا یعنی بیگم گھر میں آئی اور اس وقت بیس ہزار بنک میں تھا اس کے بعد سے اس اس جمع شدہ رقم میں اضافہ ہونا بند ہو گیا کیوں کہ اس روپے کی آمدنی سے پھر میں بیگم کے واسطے زیور اور نقرئی ظروف وغیرہ بنواتا تھا اس کے بعد لڑکیوں کی شادیاں ہو گیئں اور اس مرحومہ کی پیسہ پیسہ کر کے جمع کی ہوئی رقم بیگم کے ہاتھوں شادیوں پر برباد ہو گئی"(۱۳)

اس ناول کا اختتام بھی تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرتے ہوئے کیا ہے، اختر بے چاری تو ایک نہایت مفلس اور نادار شخص کی بیوہ تھی۔ اگر چار حرف نہ پڑھے ہوئے ہوتے تو اس کا بھی نہایت برا حال ہوتا۔ چرخہ کات کر یا ماما گیری کر کے بسر اوقات کرنی پڑتی مگر چونکہ تعلیم یافتہ تھی۔ کس سے کس درجے کو پہنچ گئی۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تمام بیوائیں اسی طرح تعلیم پا کر ترقی حاصل کریں کیونکہ یہ ناممکن سی بات ہے۔ اگر بہتری قوم منظور ہے تو سب سے پہلے جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم نسواں عام کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کا انتظام کر لیا تو سمجھنا چاہیئے کہ تمام قوم سنبھل گئی کیوں کہ بے علم معراجِ ترقی پر پہنچنا ناممکن، خواہ آپ کتنا ہی علم حاصل کر لیں، کبھی آگے نہ بڑھ سکیں گے جب تک کہ دنیا میں اپنی سب سے پہلی رہنما عورتوں کو جن کی گود تمام قوم کا ابتدائی اسکول ہے، چشمہ ءعلم سے سیر اب نہ کریں گے کیوں کہ تمام نیک کاموں میں اور تمام درجات ترقی کی بنیاد علم ہے۔ علم حاصل کیا تو سمجھو ہر سب کچھ پایا۔

رہتا ہے اس سے دائم سر سبز باغِ ہستی
ہے بہرِ مزرع عمر ابرِ بہار نیکی

نجمہ:

اپنے ناول نجمہ (۱۹۳۲ء) میں وہ کہتی ہیں کہ اس زمانے میں لڑکیوں کو مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ مذہبی تعلیم دینا بے حد ضروری ہے ورنہ بہت برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ زبیدہ اور نجمہ اس ناول کے دلچسپ نسوانی کردار ہیں ۔ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ زبیدہ اپنے وطن کی محبت میں سرشار ہے اور مشرقی تہذیب اور روایات کی امین ہے۔ وہ قمر کی رفاقت کے باوجود مغربی تہذیب میں خود کو رنگ نہ سکی۔ یہ صورت حال اس کی زندگی میں مشکلات بھی پیدا کرتی ہے۔ اس کا منگیتر اس سے قطع تعلق کرتا ہے لیکن اپنے شوہر کی بے نیازی اور بے وفائی کے باوجود وہ قمر کی محبت کو دل سے محو کرنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ وہ اب بھی ایک شوہر پرست عورت کی طرح اس کو چاہتی ہے۔ وہ وطن کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیتی ہے اور شادی نہ کرنے کا عہد کر لیتی ہے لیکن آخر کار اسے صبر کا پھل ملتا ہے اور قمر سنبھل کر اس کا ہو جاتا ہے۔ چونکہ " نجمہ " ناول بھی نذر سجاد کا اصلاحی ناول ہے۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بھی یہی محسوس کیا جاتا تھا کہ مغربی تعلیم کا معنی فقط فیشن پرستی ہے۔ " نجمہ " میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کامیاب سعی ہے۔ نذر سجاد کا بنیادی مقصد ایک ایسی حیات ہے جہاں تمام عالم کی بہترین خصوصیات کے ملاپ سے ایک خوشگوار سوسائٹی

تشکیل ہو سکے۔ چونکہ نجمہ ایک تعلیم یافتہ اور آزاد ماحول میں پلنے والی لڑکی ہے اس لیے اس کے بارے میں ایک کردار کچھ یوں بیان کرتا ہے جس سے اس دور کے نفسیاتی رویے ابھر کر سامنے آتے ہیں:

"قدیم طرز کی پابندیوں کی تو میں بھی حامی نہیں لیکن اس قدر آزادی کو بھی میں لڑکیوں کے لیے پسند نہیں کرتی۔ کمسنی میں وہ ناسمجھ ہوتی ہیں۔ کالجوں کی تعلیم، بے پردگی اور بے حد آزادی فطرتاً ہر انسان کو اپنی دلچسپیوں کے لیے ایساماحول بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میری یہ رائے نہیں کہ لڑکیوں کو سخت پردے میں بٹھایا جائے یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ مگر اس امر کا خاص خیال رکھنا لازمی ہے کہ لڑکے لڑکیوں کو مذہبی تعلیم اور اچھی تربیت سب سے پہلے دی جائے"(۱۴)

نجمہ "ناول میں کرداروں کے ذریعے نذر سجاد نے اچھی اور مکمل تعلیم کے ثمرات بیان کیے ہیں مثلاً کانپور کے ایک مسلمان رئیس کے تینوں صاحبزادوں نے تین کوٹھیاں کرائے پر لیں۔ ان تینوں صاحبزادوں کی بیویوں میں پہلے اور تیسرے بیٹے کی بیوی تعلیم سے عاری ہیں جبکہ دوسرے بیٹے کی بیوی خاصی تعلیم یافتہ ہے۔ تعلیم کے اس فرق کو ناول میں بڑے منفرد انداز میں دکھایا گیا ہے: رئیس اعظم کے بڑے صاحبزادے مع اپنے ملازمین کے پہلی کوٹھی روز ولا' میں ٹھاٹ سے فروکش ہیں۔ چونکہ یہ بڑے صاحبزادے "سلطان مرزا" اور ان کی بیگم تعلیم سے نابلد ہیں۔ گھر میں دولت کی ریل پیل ہوتے ہوئے بھی صفائی نام کو نہیں ہے۔ ہر چند کہ بے شمار ملازمین، انائیں، مامائیں وغیرہ چلتی پھرتی شور مچاتی، پان چبا چبا کر برآمدوں اور باغیچے کی روش پر گلکاریاں کرتی نظر آتی تھیں اور سلطان مرزا آرام سے کرسی پر متمکن اور نقرئی پیچوان لگا کر ہر پانچ منٹ کے بعد منہ میں پان کی گلوریاں رکھتے جاتے تھے۔ ادھر زنان خانے میں ابھی بھی سویرا نہیں ہوا ہے۔ بیگم سلطان مرزا بھی غالباً محوِ خواب ہیں۔ بچوں نے بستر ہی میں ناشتہ کر لیا ہے اور تقریباً نو بجے بیگم صاحبہ نے انگڑائی لیکر اپنی ملازمہ کو آواز دی۔ اور دوسرے بیٹے کی بیوی تعلیم یافتہ ہونے کے باعث سلیقہ شعار اور قرینے کی عورت تھی جس کو اپنے گھر کو بہتر طور سے سنبھالنے والی خاتون دکھایا گیا ہے:

"بیگم احسان مرزا ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے گھر کو اپنی دیورانی اور جٹھانی کے مقابلے نہایت قرینے سے سجا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے گھر کا نظام بھی بہتر طور پر روا رکھا ہے۔ بیگم احسان مرزا نہایت خوش سلیقگی اپنی گھرداری کو سنبھالے ہوئی ہیں۔ حالانکہ دوست و احباب ان کے بھی ہیں مگر ان کی

وجہ سے وہ اپنے بچوں اور اپنے گھر کا نظام درہم وبرہم ہونے نہیں دیتیں۔ اس کے علاوہ پانچ وقت کی نماز نہایت پابندی سے ادا کرتی ہیں۔"(۱۵)

الغرض ان تینوں صاحبزادوں کے خاندانوں کی عادات وخصائل اور تعلیم کی کمی اور اس کی تعلیم کی افادیت کے ساتھ نجمہ کا قصہ آگے بڑھتا ہے۔ نجمہ کی نسبت جمیل سے چھوٹ جانے کا باعث بھی اس دور کی تنگ نظری تھی۔ جمیل کے والد نے نجمہ کو اس لیے قبول کرنے سے انکار کیا کہ نجمہ پڑھی لکھی خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بے پردہ اور کالج جانے والی آزاد خیال لڑکی ہے جو اسے اپنے بیٹے کی بہو کی صورت میں کبھی قبول نہیں تھی۔ نذر سجاد عورت کی بے باک رویے اور بے جا فیشن پرستی کو پسند نہ کرتی تھیں۔ تاہم سماجی قدروں اور آزادی کی حدود کے احساس کے ساتھ وہ عورت کے لیے آزادیءاظہار رائے کی داعویدار تھی۔ لیکن روایتی معاشرہ خاتون تو درکنار مرد کو بھی یہ حق دینے کو آمادہ نہ تھا۔ بالخصوص شادی کے فیصلے میں فریقین کی رضامندی کو بے شرمی اور گناہ سمجھا جاتا تھا۔ نتیجتاً حیات تلخ و بے مزہ ہو کر رہ جاتی۔

یہی معاشرتی جبر مرد کو منافقت اور عورت کو سسک سسک کر جینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جمیل کی شخصیت کا دوغلا پن نام نہاد مشرقی شرافت ہی کی دین ہے جس کے اظہار میں شادی تو شکیلہ سے رچالیتا ہے لیکن اپنی محبتوں کا حق دار نجمہ ہی کو بنائے رکھتا ہے۔ یہی رویہ شکیلہ بیگم جیسی صابر شاکر اور رحم دل عورت کو بھی اندیشوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ نواب انجینئر صاحب کی حسین و جمیل، آزاد خیال لڑکی کا شہر سن کر شکیلہ بیگم جمیل اس موقعہ پر بھی خوف زدہ ہو گئی تھیں کیوں کہ وہ اپنے منچلے شوہر کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ کبھی نجمہ کے تھے۔ پھر بیوی کو چاہنے لگے اور اب سمجھ داری کو عمر میں آکر ایک ذلیل ٹائی پسٹ عورت کے پروانہ ہو رہے ہیں اور یہ نواب زادی تو سب سے بہتر ہے۔ یورپ کی تعلیم و تربیت پھر ان دونوں سے کہیں زیادہ حسین و کم سن خدا ہی خیر رکھے۔ شکیلہ شوہر کے اس رویے پر شاکی ہے جو اس کا ہو کر بھی اس کا نہیں۔ ذیل اقتباس عورت کے اسی کرب کی عکاسی ہے۔ نذر سجاد کا یہ ناول بھی ان کے دوسرے ناولوں کی طرح رومانوی انداز میں اصلاح النساء کا درس دیتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مسلمانوں کا ایک طبقہ اپنی روایات کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھا تھا اور دوسرا آزاد روی اور روشن خیالی کی رو میں بہ کر اپنی بھرپور رسمی تہذیبی اقدار سے بھی باغی ہو چکا تھا۔ نتیجتاً دونوں ہی زوال پذیر تھے۔ نذر سجاد شرق و غرب کے بہترین خصائص کا انتخاب اور ملاپ چاہتی ہیں۔ اسے شکیلہ کی گفتگو مصنفہ کے انھی خیالات کی ترجمان ہے۔

> "میری یہ رائے نہیں کہ لڑکیوں کو سخت پردے میں بٹھایا جائے یا اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھا جائے۔ مگر اس امر کا خیال رکھنا لازمی ہے لڑکے لڑکیوں کو مذہبی تعلیم اور اچھی تربیت سب سے پہلے دی جائے"(۱۶)

ایک اور جگہ ناول میں مخلوط ماحول دکھایا گیا ہے۔ سب ڈرائنگ روم میں آئے۔ اتفاق سے بیگم صدیقی کے ایک طرف انجینئر صاحب کی کرسی اور دوسری طرف نوشابہ کی۔ قاعدے کے فرائض بیگم صدیقی کو باری باری دونوں سے باتیں کرنا پڑیں مگر انجیر صاحب بہت خاموش تھے۔ کیپٹن صاحب اپنی عادت کے مطابق ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ پورے دو گھنٹے میز پر صرف کیے گئے اور جب خدا خدا کر کے کہیں کھانا ہوا۔ سب ڈرائنگ روم میں آئے تو کافی کا دور چلا آپس میں ایک دوسرے سے گانے کی فرمائشیں کی گئیں یہ شرق و غرب کے تاریخی و تہذیبی امتزاج کا مرقع ہے۔ جہاں عورت شمعِ بزم بھی نہیں اور عقوبت خانہ بھی نہیں۔ اگرچہ نذر سجاد کو مردوں کی ہمسری کا دعوی ہر گز نہ تھا۔ لیکن مساوی حقوق کی وہ سب سے بڑی دعویدار تھیں۔ اس ناول کا ایک اور کردار نجمہ کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "اگر لڑکیوں کو آزادی دے دی جائے تو اس کے یہی نتیجے رہیں گے۔ نجمہ نے اپنی زندگی حد سے زیادہ آزادی کی ہوس میں اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی۔ نذر سجاد نے مساوی حقوق کی رزم تو ساری عمر لڑی لیکن مسلمان خواتین کی آزادہ روی کی مخالف رہیں۔ نجمہ کے کردار کا بھیانک انجام نذر سجاد کی اسی سوچ کا عکاس ہے کہ روشن خیالی بے راہ روی کا نام نہیں۔ نجمہ اسی روشن خیالی کا شکار ہو کر کامران جیسے غلط مرد سے ناتا جوڑ لیتی ہے جب کہ نجمہ کی حالت یہ ہے کہ بنائے نہ بنے، اب دولھا نہیں چاہیے کافی شرمسار ہوئی، ایک قدیم شریف گھرانے کی خاتون رقص گاہوں میں گئی، غیر محرم کے ساتھ کھلم کھلا گھومتی پھری۔ مگر خدا جانتا ہے میں نے اس کو اپنی آئندہ زندگی کا مالک سمجھ کر ایسا کیا۔ اور یہی معاملات اور افکار تعلیمِ نسواں کے چاند کو گہن لگانے کے لیے کافی تھے۔

صبح زندگی:

علامہ راشد الخیری (۱۸۶۸ء-۱۹۳۶ء) کے اولین ناول "صالحات" اور "منازل السائرہ" کی طرح ہی "صبح زندگی" (۱۹۰۹) بھی اصلاحی و معاشرتی ناول ہے۔ اس ناول میں گھریلو زندگی کی مکمل تصویر پیش کی گئی ہے، یہ اپنی ادبی خوبیوں کے باعث جامعات کے اعلیٰ نصاب میں بھی داخل رہا۔ علامہ راشد الخیری کے زیادہ تر ناولوں کا موضوع عورتوں کی تعلیم ہے۔ مگر انھوں نے عورتوں کی اس تعلیم کی حمایت کی ہے جو صرف گھر کے دائرے میں ہو اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں معاون ہو۔ ان کے کئی ناولوں کا موضوع غلط مغربی تعلیم کے

برے نتائج ہیں۔ یہ کوشش بھی اس لیے کی گئی ہے لوگ تعلیم نسواں کے خلاف نہ ہو جائیں۔ اپنی ناول صبح زندگی کے ایک کردار استانی جی کے منہ سے وہ کہلاتے ہیں: "میں نہیں چاہتی کہ لڑکیاں لکیر کی فقیر بنی رہیں۔ زمانے کا رخ دیکھ کر کام کرو۔ نہ ایسا کہ دوسروں کی ریس میں اپنی اصلیت بھول جاؤ۔ شام زندگی کا موضوع عورتوں کی تعلیم کی اہمیت ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ سماج کو بہتر بنانے کا سب سے اہم ذریعہ عورتوں کی صحیح تعلیم اور تربیت ہے۔ وہ تعلیم کی اہمیت پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ وہ دماغ کو روشن کرتی ہیں۔ وسیع القلب بناتی ہے۔ گھریلو اور سماجی فرائض سے آگاہ کرتی ہے اور ان کو بحسن وخوبی پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ صغری مہدی راشد الخیری کے ناولوں میں خواتین کی تعلیم کے بارے لکھتی ہیں:

> "راشد الخیری کی ناول 'سنجوگ اور سمرنا کا چند کا موضوع بھی تعلیم نسواں ہے، بنت الوقت میں راشد الخیری نے اس ہندوستانی عورت کا کردار پیش کیا ہے جو انگریزوں کی نقل میں اپنی تہذیب اپنا مذہب بھلا بیٹھی ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا کردار رابعہ سلطان کا ہے جو پڑھی لکھی مذہبی عورت ہے جو میلاد میں آکر تعلیم نسواں کے موضوع پر لیکچر دیتی ہے اور اس تعلیم کی مذمت کرتی ہے جس کی اشاعت بنت الوقت کر رہی ہے اور اصلی تعلیم کا مفہوم سمجھاتی ہے۔ اپنی ناول 'سراب مغرب میں راشد الخیری نے ایک مدرستہ نسواں کا نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ مسلمان عورتوں کو جو پڑھ لکھ گئی ہیں"[۱۷]

صبح زندگی میں نسیمہ کی زندگی کے کنوارے حصے کا نمونہ پیش کیا ہے اور ایک مثالی کردار سامنے لا کے اسے اصلاح کا نمونہ بنایا گیا ہے۔ کہ لڑکیوں میں بہترین نسوانی، علمی اور انسانی اوصاف کس طریقے پر پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ اور ان کی زندگی نہ صرف ان کے خاندان کے لیے بلکہ ساری قوم کے لیے کس طرح باعث عزوناز ہو سکتا ہے۔ ناول کی ہیروئن بلاشبہ اعلی خوبیوں کا پیکر ہے لیکن خیال رکھنا چاہیے کہ جس طرح ایک صناع کسی بے قاعدہ پتھر کو تراش خراش کر اس قابل بناتا ہے کہ اسے کوئی بھی حسین خاتون اپنے گلے میں ناز سے سجانے کو ترجیح دے سکے۔ نسیمہ کی ساری زندگی بھی کچھ مختلف نہیں، سنجیدہ نے اسے سجا بنا کر وہ دلکش جوہر بنا دیا جو باعث عزوناز تصور کیا جاسکتا ہے۔ سنجیدہ اسے کھلاتی اچھا سے اچھا ہے مگر اس پر کڑی نظر رکھتی ہے اور یہی نظر اسے پارس بنا دیتی ہے۔ ایک روز کہیں سے حصہ آیا، ڈھائی تین سال کی عمر میں نسیمہ حصہ دیکھ کر شوخ ہو گئی اور ایڑیاں رگڑنے لگی، پھینیاں کھانے لگی۔ مگر سنجیدہ ایک بورا تک نہیں دیتی۔ علامہ نے بچوں کی تربیت و

نگہداشت کا کتنا عمدہ اور معنی آفرین مفہوم پیش کیا ہے: "اس کی ضد آج کروں پوری تو قیامت ہو جاوے"

یہ پہلا سبق نسیمہ کی حیات کا تھا، اور وہ آئندہ ضد نہ کرنے کا ارادہ کرتی ہے۔ ابھی نسیمہ پانچ چھ سال کی نابالغ ہے اور اسے ادراک / سمجھ بوجھ ہے کہ والد کے آنے پر مجرا بجالانا قاعدے کی بات ہے۔ لہذا وہ والد کو سلام کرنے جاتی ہے تو پہلے اس بات پر تنبیہ ہوتی ہے کہ:۔ "دھم دھم کرتے باپ کے آگے جاتے تم کو شرم نہیں آتی"۔ ناول چونکہ تعلیمِ نسواں اور تربیتِ نسواں سے وابستہ ہے اس لیے اس کے نیگٹو کردار جہالت کا نمونہ ہیں ان کا تعلیم و تربیت سے دور تک واسطہ نہیں لیکن ان کے اندر اتنی صلاحیت ضرور ہے کہ وہ اپنے سودوزیاں کی بابت بخوبی جان سکیں۔ تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس ناول کے چند مکالماتی اقتباسات پیش ہیں:

> "بھاوج:۔ " اللہ کا شکر ہے میں بھی مسلمان ہوں اور تم بھی۔ ہمارے حضرت نے فرمایا ہے کہ علم ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔ نند: نسیمہ کی ماں تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہیں ہو پڑھنے سے اور عقل آئے گی یا دیدہ دلیر ہو گا۔ اگلے زمانے کی عورتوں کا خیال تھا کہ لڑکیوں کے پڑھانے لکھانے سے فائدہ کیا ان کو کہیں نوکری نہیں کرنی روٹی نہیں کمانی، سارے جہاں کا حال بتا کر دیدہ دلیر کرنا ہے۔ (۱۸)

ناول کے ہر ورق پر حیات کی جولانی اور تابانی اس قدر ہے کہ زندگی آب و تاب سے سانس لیتی ہوئی نظر پڑتی ہے پھر وہ مسئلہ چھوٹا ہو کہ بڑا۔ راشد الخیری نے ناول کو اس انہماک اور غور و فکر سے تصنیف کیا ہے۔ کہ نسوانی زندگی میں پیش آنے والا کوئی مرحلہ چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ کہیں بچی کو گود میں لیے کھلا رہے ہیں، کہیں برسات میں جھولا جھلا رہے ہیں کہیں بچے کی توتلی زبان میں اس سے کہانی کہہ رہے ہیں، اور کبھی جائے نماز پر بیٹھے اسے مناجات سکھا رہے ہیں۔ کہیں انگنائی اور دالان میں جھاڑو دلا رہے ہیں کہیں باورچی خانہ میں سالن بگھارنے اور حلوہ پکانے کی ترکیب دکھا رہے ہیں۔ کبھی دکانداروں سے مول تول اور بازار کے سودا سلف کی گفتگو سکھا رہے ہیں۔ علامہ راشد الخیری کے زیادہ تر ناولوں کا موضوع عورتوں کی تعلیم ہے۔ مگر انھوں نے عورتوں کی اس تعلیم کی حمایت کی ہے جو صرف گھر کے دائرے میں ہو اور اپنے فرائض کو ادا کرنے میں معاون ہو۔ ان کے کئی ناولوں کا موضوع غلط مغربی تعلیم کے برے نتائج ہیں۔ یہ کوشش بھی اس لیے کی گئی ہے لوگ تعلیم نسواں کے خلاف نہ ہو جائیں۔ اپنے ناول "صبح زندگی" کے ایک کردار استانی جی کے منہ سے وہ کہلاتے

ہیں:" میں نہیں چاہتی کہ لڑکیاں لکیر کی فقیر بنی رہیں۔ زمانے کا رخ دیکھ کر کام کرو۔ نہ ایسا کہ دوسروں کی ریس میں اپنی اصلیت بھول جاؤ ہے۔

الغرض نسیمہ خوبیوں کا پیکر ہے اس کے درونِ خانہ وہ تمام اقدار اجگر کی گئیں ہیں جو ایک مثالی خاتون میں ہو سکتی ہیں یا ہوتی ہیں۔ لیکن رنج و غم اور مصائب و آلام کا احساس اسکی ذات میں فطری ہے وہ انبساط و مسرت کے جذبے سے لبریز بھی ہے۔ اس لیے دنیا کے اتار چڑھاؤ دیکھنے اور دگرگوں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد بھی ہے۔ اس لیے وہ ایک جذباتی کیفیات کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مرگِ پدر اس کی آنکھوں میں سیاہی بھر دیتی ہے، سرما کی پہاڑ جیسی راتیں والد کی خدمت میں اس نے آنکھوں میں گزار دیں، اور جب باپ کی چھتر چھایا سر سے اٹھ گئی تو اس کی آنکھیں بھی اشکوں سے بھری ہوئیں تھیں۔ ناول کے غائر مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ناول میں علامہ نے اپنے مقصد کو اس قدر اجاگر کیا ہے کہ بہت سی خوبیاں ہونے کے باوجود ناول ایک خشک مضمون سے زیادہ کچھ نہیں۔ صبح زندگی کو معاشرتی اصلاحی کتاب کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ ناول کے ہر قصے میں اصلاح کا عنصر نمایاں ہے ناول نگار نے فنی تقاضوں سے زیادہ اپنے مقصد کو زیر تحریر رکھا ہے۔

اختری بیگم:

مرزا محمد ہادی رسوا (۱۸۵۹ تا ۱۹۳۱) نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کی حمایت کرتے ہوئے ان کی تعلیم پر خاص توجہ کرنے پر زور دیا ہے۔ وہ شرفاء کی خاندانی زندگی کی ابتری کا ذمہ دار عورتوں کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول "اختری بیگم" (۱۹۲۴ء) میں ہرمزی کے کردار کے ذریعے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم سے عورتوں کے تجربات وسیع ہوتے ہیں۔ ان میں جرات اور بہادری آتی ہے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس ناول کی ہیروئین بھی تعلیم یافتہ دکھائی گئی ہے۔ مرزا رسوا کس قدر تعلیمِ نسواں کے حق میں تھے اس بات کا اندازہ ڈاکٹر شیخ آدم کی اس بات سے لگایا جاسکتا ہے:

> "جہاں تک مرزا ہادی رسوا کا تعلق ہے وہ بذاتِ خود ایک روشن خیال انسان تھے اور جدید تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، انھوں نے اپنی زندگی میں بھی عملی طور پر جدید تعلیم حاصل کرنے اور اس میدان میں سبقت لے جانے کی کوشش کی، علم کے لیے انھوں نے ہر شے کو قربان کر دیا"(۱۹)

مرزا نے اپنے ناولوں میں لکھنو کی زوال آمادہ تہذیب پر بڑے ہی توازن کے ساتھ تنقید کی ہے اور عوام کو نئے حالات کے تحت نئی تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ وہ اپنے ایک ناول "ذات شریف" میں فرماتے ہیں اس کتاب سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ امراجو تعلیم کو غیر ضروری اور لغو سمجھتے ہیں ان کی اولاد کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ عورتوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور خاتون کی تعلیم کو پورے معاشرے کی تعلیم گردانتے ہیں اس امر کی طرف وہ اپنے ایک ناول "شریف زادہ" میں کہتے ہیں کہ عورتوں کے جہل اور بد اخلاقیوں سے جو نقصان سوسائٹی کو پہنچ رہا ہے، وہ بھی ظاہر ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کی حمایت کی ہے۔ وہ شرفاء کی خاندانی زندگی کی ابتری کا ذمہ دار عورتوں کو سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ناول "اختری بیگم" میں ہرمزی کے کردار کے ذریعے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم سے عورتوں کے تجربات وسیع ہوتے ہیں۔ ان میں جرات اور بہادری آتی ہے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس ناول کی ہیروئین بھی تعلیم یافتہ دکھائی گئی ہے۔ رسوا اس کا تعارف یوں کرتے ہیں۔ اچھی خاصی لکھی پڑھی دست حکم تھی۔ فارسی میں گلستاں بوستان اور ایسی ہی کتابیں پڑھ چکی تھی۔ مرزا رسوا خیال کرتے تھے کہ طبقہ ءاعلی کے برباد ہونے کی ذمہ داری بھی اس طبقے پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اپنے ناول "اختری بیگم" میں لکھتے ہیں:

> "کسی قسم کی تعلیم نہیں، اچھی صحبت نہیں پھر بنے تو کیوں کر بنے انھی بھیک مانگنے والوں میں وہ لوگ ہین جن کے بزرگ برسرِ حکومت تھے"(۲۰)

مرزا رسوا کی مثالی خاتون اعلی تعلیم یافتہ اور اخلاقی صفات کی حامل ہے۔ اس سلسلے میں "اختری بیگم" کی اختری ان کے تصور کی ترجمان ہے۔ اس کی نیک دلی اور شرافت نفس کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ وہ خود غیرت مند ہے۔ اور دوسروں کی خودداری کی قدر کرتی ہے، اچھی تعلیم اور اعلی تربیت کے فیض سے کمسنی کے باوجود مستقل مزاجی اور سوجھ بوجھ کا وہ مادہ اس میں پیدا ہو جاتا ہے جس سے عورتیں عام طور سے جہالت کے باعث بے گانہ رہتی ہیں۔ اسی دور اندیشی سے کام لے کر وہ خورشید مرزا کے کارندے مراد علی کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رہتی ہے۔ اگر وہ جاہل اور بے وقوف ہوتی تو اس کا حشر بھی مراد علی کے ہاتھوں وہی ہوتا جو بوٹن کا ہوا۔ خوش اخلاقی اور ملنساری اس کی نمایاں صفات ہیں۔

وہ پڑھی لکھی شریف زادیوں کو وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری عورتیں اس معیار پر اس وقت تک پوری نہیں اتر سکتیں جب تک وہ ان اخلاقی کمزوریوں سے نجات، حاصل نہ کرلیں

جو شریفوں کی گھریلو معاشرت کو گھٹن کی طرح کھائے جارہی ہیں۔ ان کا قیمتی وقت عیب جوئی اور نکتہ چینی میں صرف ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں رزیلوں کی صحبت میں رہ کر ان کے کمینہ خصائل اختیار کرلیتی ہیں۔

عورتوں کی مغربی تعلیم کے ساتھ ہی رسوا آزادی نسواں کے بھی قائل ہیں لیکن شرافت کی حدوں کے اندر۔ ان کے یہاں عورتوں کی آزادی کا وہ مغربی تصور نہیں ملتا جو سرشار نے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں رسوا کے خیالات سرشار سے زیادہ توازن کے حامل ہیں۔ رسوا اپنی مثالی عورت کے لیے جس چیز کو ضروری خیال کرتے ہیں وہ ہے تعلیم کیوں کہ جدید دور میں انھیں اس کی اہمیت کا احساس ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ شرفا کے خانگی انتشار کی بنیادی وجہ عورتوں کی جہالت ہے۔ جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے رسوا اپنے ہمعصروں میں خاصے ترقی پسند ہیں۔ ان کی دوررس نگاہیں اس حقیقت کو عیاں دیکھتی ہیں کہ موجودہ دور میں عورتوں کو تعلیم سے محروم کر کے گھروں کی چار دیواری میں مقید رکھنا قرین مصلحت نہ ہوگا۔ "اختری بیگم" میں ہرمزی کے کردار کی وساطت سے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ تعلیم پانے سے عورتوں کے تجربات وسیع ہوں گے۔ زمانے کے حالات کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا اور ضرورت پڑنے پر وہ ہمت اور حوصلے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کرسکیں گے۔ ہرمزی کو جب پوٹن کے فرار ہونے کا حال معلوم ہوتا ہے تو اسے روکنے کے لیے اسٹیشن جاکر جس ہمت کا ثبوت دیتی ہے وہ گھر میں بیٹھنے والی عورت کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح نواب خورشید مرزا کی علالت کے دوران حکیم جعفر علی کو تار دے کر بلاتی ہے۔ یہ خود اعتمادی اور سوجھ بوجھ اس میں تعلیم کی بدولت پیدا ہوئی۔ چنانچہ وہ نہایت جفاکشی سے اور مردانہ وار زندگی کی سختیوں کا مقابلہ کر کے اپنی بہت سی مصیبت مند بہنوں کے لیے مثال قائم کرتی ہے۔ وہ کسی کے احسان کا بار اپنے سر پر نہیں لیتی مفلسی میں غیرت اور وضعداری کو قائم رکھتی ہے۔ انسانیت و شرافت کی زندہ مثال ہے۔ اگر ہرمزی جاہل ہوتی تو عسرت اور تنگ دستی اس کے لیے عذاب بن جاتی۔ اختری بیگم بھی ایک تعلیم یافتہ عورت ہے۔

اس عہد میں ایک عام غلط فہمی یہ تھی کہ جدید تعلیم اور مذہب ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ رسوا نے بالواسطہ طور پر اس خیال کی تردید کی ہے۔ ان کے یہاں ایک مثالی عورت کا تصور مکمل مذہبیت سے وابستہ ہے۔ انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ تعلیم اور مذہب متضاد حقیقتیں نہیں بلکہ علم ہی وہ ذریعہ ہے جو مذہب کی روح کو پہچاننے میں ہمارا معاون ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہرمزی اور اختری بیگم کا کوئی اقدام کبھی مذہب کی حدود سے متجاوز نہیں ہوتا۔ ان کے اقوال و افعال میں مکمل مذہبیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یہ اسی کی برکت ہے

کہ وہ کبھی بھی جاہل عورتوں کی طرح توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کا شکار نہیں ہوتیں۔ شریف زادہ" میں مرزا عابد حسین کی بیوی اور اختری بیگم" میں ہرمزی کے والد کو بھی ہم فرائض مذاہبی کی ادائیگی میں مصروف پاتے ہیں۔ نیکی، شرم وحیااور پاکیزگی کی صفات کو رسوا عورتوں کا زیور خیال کرتے ہیں۔ ہرمزی اور اختری بیگم دونوں ان خوبیوں سے مزین ہیں۔ اپنے فرائض منصبی سے ان کی واقفیت قابل ستائش ہے۔ والدین کی خدمت کو وہ عبادت کا درجہ دیتی ہیں۔ دونوں خدمت گزار اور اطاعت کیش ہیں۔ اختری اپنی ماں کی آخری سانس تک ان کی خدمت کرتی ہے۔ اسی طرح ہرمزی بھی اپنی ماں زینت بیگم کی اطاعت گزار ہے۔ زینت بیگم کی لڑکی ان کے لیے برکت تھی، ہزار بیٹے صدقے کیے تھے اس دنیا میں سوائے ماں کی اطاعت اور خدمت گزاری کے ان کو کسی بات کا شوق تھا نہ توصلہ اتنی زندگی عسرت میں بسر ہوئی تھی۔ خود تکلیفیں اٹھائیں مگر ماں کا دل کبھی میلا نہ ہونے دیا عین جوانی میں بڑھیوں کا سامزاج تھا۔ جو کچھ ماں سے بچا کھچا وہ کھالیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کرداروں کے واسطے سے رسوا تعلیم نسواں اور خاص طور سے مغربی تعلیم کے خلاف جو مشکوک تھے انھیں مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جدید تعلیم لڑکیوں کے اخلاق پر برا اثر نہیں ڈالتی بلکہ صحیح معنوں میں یہ تہذیب نفس اور ان صفات کے نشو نما کا ذریعہ ہے جو خلاصہ انسانیت ہیں۔ جو چیز عورتوں کو تباہ کرتی ہے وہ جہالت اور ناقص تربیت ہے۔

حوالہ جات

۱. نورالحسن نقوی،ڈاکٹر، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ ایجوکیشنل ہاؤس، علی گڑھ،۱۹۷۹ء، ص ۶۳

۲. قرۃالعین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۲

۳. ایضاً، ص ۱۸۴

۴. سوزن بیسنٹ، ترجمہ، توحید احمد، تقابلی ادب: تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جون ۲۰۱۵ء، ص ۶

۵. قرۃالعین حیدر، سفینہء غمِ دل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۳۶-۳۷

۶. نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، مشمولہ: ہوائے چمن میں خیمہء گل، مرتبہ: قرۃالعین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۳

۷. ایضاً، ص ۴

۸. ایضاً، ص ۱۱

۹. صغرا مہدی، اردو ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۸۲

۱۰. نذر سجاد حیدر، اختر النساء بیگم، ص ۱۶۲

۱۱. ایضاً، ص ۱۹۶

۱۲. ایضاً، ص ۱۹۶

۱۳. ایضاً، ص ۲۲۷

۱۴. وسیمہ سلطانہ، ڈاکٹر، نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص ۱۰۵

۱۵. نذر سجاد حیدر، نجمہ، مشمولہ: ہوائے چمن میں خیمہء گل، مرتبہ: قرۃالعین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲

۱۶. ایضاً، ص ۱۶۰

۱۷. صغرا مہدی، اردو ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۸۵

۱۸. راشد الخیری۔ علامہ، صبحِ زندگی، درویش پریس، دہلی، ۱۹۲۸ء، ص ۳۷

۱۹. شیخ آدم، ڈاکٹر، مرزا رسوا- حیات اور ناول نگاری، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء، ص ۴۶

۲۰. ہادی رسوا، مرزا، اختری بیگم، کتب خانہ علم و ادب، کراچی ۱۹۵۲ء، ص ۴

باب سوم:

نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں کا تصور:

خواتین کی اخلاقی تربیت کے تناظر میں تقابلی مطالعہ

الف: خواتین کی اخلاقی تربیت اور 'سگھڑ' و 'پھوہڑ' کی اخلاقی جہات:

ہر قوم، ہر شہر اور ہر ملک میں بعض اخلاقی اور تہذیبی قدریں وجہ امتیاز ہوتی ہیں جو دوسرے کے مقابلے میں شناخت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ہندوستان بہت سے صوبوں میں تقسیم ہے، ہر صوبہ سے اس کی کچھ انفرادی قدریں وابستہ ہیں جن کے سبب ہر صوبہ کا باشندہ اپنی پہچان کراتا ہے۔ اخلاقی قدروں کے اسی فرق نے مشرقی تہذیب اور مغربی تہذیب کی اصطلاحیں تشکیل دیں۔ اہلِ مشرق اپنی تہذیبی اقدار پر نازاں ہیں تو اہل مغرب بھی اپنی تہذیبی قدروں پر فخر کرتے ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم کی اخلاقی و تہذیبی قدروں کو اسی وقت اپناتی ہے جب اسے اپنے متعلق احساس کمتری ہو۔ اگرچہ ہر شخص اپنے انفرادی عادات واطوار رکھتا ہے لیکن ماحول کے زیر اثر بعض قدریں تمام اشخاص میں مشترک ہوتی ہیں مثلاً مجموعی طور پر یوں کہا جاتا ہے کہ فلاں علاقہ کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں یا فلاں جگہ کے افراد عیاش اور بد اخلاق ہیں۔ اس طرح کی آرا کسی بھی معاشرے میں اکثریت کے مابین اخلاقی طور پر قدر مشترک ہونے کے بعد قائم کی جاتی ہیں۔ کسی بھی تجزیے کے وقت دو باتیں ملحوظ رکھی جاسکتی ہیں، اچھائیاں اور برائیاں کسی معاشرے کا تجزیہ کریں یا کسی شخصیت کا مطالعہ کریں انہی بنیادی اقدار یا ارکان پر اس کا انحصار ہوتا ہے، ہر معاشرے میں اگر خوبیاں ہوتی ہیں تو خامیاں بھی ان کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں کبھی اچھائیاں غالب آجاتی ہیں اور کبھی برائیاں۔ یہ قول ایک بہت بڑی سچائی ہے کہ جب کسی نظام کو اپنایا جاتا ہے تو اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کے معائب کو بھی اپنانا پڑتا ہے،۔ چاہے بظاہر کوشش صرف یہ ہو کہ اس کی خوبیوں کو اپنائیں اور اس کی خامیوں کو چھوڑ دیں۔ جس عہد کا معاشرہ زیر بحث ہے وہ آج سے بہت مختلف تھا، طرز زندگی کچھ اور تھا، آداب و رسوم مختلف تھے اور اس وقت جن باتوں کو تسلیم کیا جاتا تھا ان پر شدت کے ساتھ عمل ہوتا تھا۔ آج کے صنعتی دور نے معاشرے کو آداب و رسوم کی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ اس زمانے کے لوگ انتہا پسندی کی حد تک ماضی پرست تھے، صدیوں

سے مروج اخلاقی قدروں پر چلنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ بزرگوں کی روایات کو زندہ رکھنا بہت بڑی سعادت تصور کیا جاتا تھا۔

اخلاقی قدروں کے متعلق سوچتے وقت ذہن کو آزاد نہیں چھوڑتے کیونکہ آزادی سے سوچنے کا نتیجہ بغاوت کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور بغاوت سے اعتقادات مجروح ہوتے ہیں۔ مروجہ اعتقادات سے انحراف نافرمانی کے مترادف خیال کیا جاتا ہے، اعتقادات کی پختگی کا ایک سبب مذہبی ذہن بھی ہے۔ چند صدیوں قبل بیشتر لوگوں کے دل ودماغ پر مذہب کا غلبہ تھا اور اس شدید غلبہ نے لوگوں کو توہم پرستی کی حد میں داخل کر دیا تھا، مذہب پرستی کا مطلب یہ نہیں کہ لوگ برائیوں سے دور تھے بلکہ برائیاں بھی شدید تھیں، زندگی کا معیار ہمیشہ بلندی پر بنتا ہے اور پستی کی طرف آتا ہے۔ یعنی معاشرے کا ڈھانچہ اہل دول کی طرز رہائش پر تیار ہوتا ہے، ہر طبقہ کا آدمی اپنے سے بڑے طبقہ والوں کی نقل کرتا ہے، خود کو اس کے برابر لانے کی کوشش میں رہتا ہے، رہن سہن کے انداز میں اس کا طریقہ اپناتا ہے، پہننے کھانے میں حتی المقدور، اس کا طرز اختیار کرتا ہے، پرانے زمانے میں جس طرح بادشاہ محل میں رہتا تھا یا دربار میں اٹھتا بیٹھتا تھا اس کے امرا اور وزرا بھی اس کی پیروی کرتے تھے۔ معاشرے میں طبقاتی تقسیم نے طبقوں کے اردگرد ایک حصار قائم کر دیا ہے، ہر طبقہ کا آدمی اس میں قید رہتا ہے۔ روایت واقدار کا پاس ولحاظ کرنے کے لیے وہ مجبور ہے۔ ماضی میں دولت اور پیشے نے بھی لوگوں کو ذاتوں میں بانٹ دیا تھا جس پیشے کا آدمی جو کام کرتا تمام زندگی اسے وہی کرنا ہوتا بلکہ اس کی اولاد بھی وہی کام کرتی تھی۔ اگرچہ یہ تقسیم اسلامی نقطہء نظر سے صحیح نہیں لیکن مسلمانوں میں بھی دوسری قوموں کے اثر سے ہم مذہب ہونے کے باوجود فرق کیا جانے لگا تھا خصوصاً شادی وغیرہ کے وقت اس مسئلے پر زیادہ غور کیا جاتا، اپنے سے کمتر کے یہاں رشتہ قائم کرنے یا اپنے معیار سے کم درجہ کا کام کرنا غیرت مندی کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ مثالی دخترانِ سلاطین سے عام آدمی کا تعلق خاطر کرنا بھی معیوب تھا۔ کنور محمد اشرف بیسویں صدی کے اوائل (عہدِ نذر سجاد) کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "اس دور کی خوبیاں اور برائیاں مجموعی طور پر گنی چنی تھیں، تاہم یہ خصوصیات خاصی ترقی یافتہ مضبوط بنیادوں پر قائم تھیں، رسوم ورواج اور مذہب جنھوں نے ان طور طریقوں کی مختلف صورتوں سے حفاظت کی موجودہ دور کے دینی اور اخلاقی اعتمادات سے زیادہ مفید قوتیں تھیں"[1]

معاشرہ کی خوبیوں میں ایک خوبی بزرگوں کا احترام کرنا رہی ہے۔ اپنے سے بڑے ہر آدمی کو قابل احترام سمجھا جاتا، اس کی موجودگی میں کمسن اونچی آواز سے نہیں بولتے، کوئی گستاخانہ بات نہیں کہتے، اس سے بحث نہیں کرتے، اس کی غلطی پر خاموش رہنا ادب میں شامل ہے۔ یہاں تک کہ دستر خوان پر کسی بڑے کی موجودگی میں کوئی چھوٹا اس سے پہلے کھانا شروع نہیں کر سکتا، بزرگوں کا احترام تو خود بادشاہ بھی کرتے تھے۔ والدین کی خدمت اخلاقی فریضہ ہے بلکہ مذہبی اعتقاد کے مطابق باعث نجات بھی ہے۔ ہر مذہب میں اس رشتے کو بڑا محترم مانا گیا ہے۔ رام چندر نے اپنے باپ کے حکم کی تعمیل کے لیے چودہ برس کا بن باس اختیار کیا، قرآن پاک میں بار بار ہدایت کی گئی ہے کہ والدین کی عزت و خدمت کرو۔ ہندوستان میں شرون کمار کا قصہ مشہور ہے کہ وہ اپنے ضعیف ماں باپ کو ٹوکریوں میں سوار کر کے خود اپنے کندھے پر رکھ کر تیر تھ کرانے کے لیے نکلا تھا۔ سوسائٹی کی اعلیٰ اقدار میں سے ایک قدر یہ بھی ہے کہ ایک آدمی وقت ضرورت دوسرے آدمی کے کام آئے، یہ عمل نہ صرف سماجی اقدار میں شامل ہے بلکہ انسانی فرض یہی ہے۔ مذہبی اعتبار سے بھی اس عمل کو پہلے احترام سمجھا گیا ہے اسلام کے اصولوں پر چلنے والے ہر شخص پر دو حقوق فرض ہوتے ہیں ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد حقوق اللہ کا تعلق خدا سے ہے لیکن حقوق العباد کا رشتہ مخلوق خدا سے ہوتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو یہی تمہاری نجات کا ذریعہ ہو گا۔ مختلف مذاہب میں بھی اس نقطہ نظر کی تائید کے نمایاں پہلو اور ان سے نسبت رکھنے والے واقعات موجود ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت کا بنیادی طریقہ فکر بھی یہی ہے کہ معاشرے کے مختلف افراد اور طبقات میں تعاون کا رشتہ قائم ہو، اور وہ ایک دوسرے کی محبت اور محنت اور یاہی کارکردگی سے زندگی کو زیادہ بامعنی اور پُر مسرت بنا سکیں۔ مصیبت یا پریشانی کے وقت اگر کوئی کسی کے کام آجائے تو اسے احسان سے تعبیر کرتے ہیں۔ مہذب اور شریف لوگوں کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنے مددگار کا احسان تاحیات فراموش نہیں کرتے، بلکہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ اپنے محسن کے احسان کا بدلہ کسی نہ کسی بہتر شکل میں ادا کر دیں۔

ب: اردو ناولوں میں خواتین کی اخلاقی تربیت کے پہلو: بیانات، واقعات اور کردار:

اردو ناول کے آغاز میں نذیر احمد نے اپنے مختلف ناولوں کے ذریعے ایک خاتونِ خانہ دار کو متعارف کرایا ہے۔ نذیر احمد نے روز مرہ زندگی کے کرداروں کی تخلیق کی ہے جن سے ہمارا واسطہ روزانہ پڑتا اور جن سے ہم واقف ہیں۔ عورت کے مختلف مسائل کو عورت کے ذریعے ہی اُجاگر کرنے کی کامیاب کوشش نذیر احمد کے کام میں نظر آتی ہے۔ اکبری (ناول۔ مراۃ العروس) کے ذریعہ انہوں نے اس بات کو باور کرانے کی سعی کی ہے کہ ایک ان پڑھ عورت کس قدر پھوہڑ، جاہل اور بد اخلاق ہوتی ہے اور کس طرح اپنے گنوار پن سے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ بن میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اصغری (مراۃ العروس) کے ذریعہ یہ بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک تعلیم یافتہ خاتونِ خانہ کس قدر سلیقہ مند، خوش اخلاق اور ہنر مند ہوتی ہے اور کس طرح الجھے اور پیچیدہ حالات کو اپنی ذہانت، حسنِ اخلاق اور زیرکی سے سنوار لیتی ہے۔ یہ دونوں کردار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

حسن آراء (ناول۔ بنات النعش "اکبری اور اصغری" کے کرداروں کا ایک حسین امتزاج ہے)۔ یہ ایک خوش خلق لڑکی کا عکس ہے جو پہلے اکبری کی طرح اچھائیوں اور برائیوں کا مرقع ہوتی ہے اور بعد میں اچھی تربیت کی وجہ سے اصغری کی طرح اچھائیوں اور خوبیوں کا حسین پیکر بن جاتی ہے۔ یعنی "اصغری" کے مقابلے میں حسن آراء اور "اکبری" کے کردار میں زندگی کی بھرپور سچائیاں ملتی ہیں۔ اور انہیں سچائیوں کی وجہ سے یہ دونوں کردار سپاٹ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔ زندگی کی یہ بوقلمونی اور متنوع کیفیات ہمیں دیگر کرداروں ہریالی، غیرت بیگم (فسانہ مبتلا) نعیمہ، فہمیدہ (توبتہ النصوح)، اور آزادی بیگم (ایامی) میں بھی ملتی ہیں۔ ہریالی کے کردار میں ایک طوائف کے مسائل کو نفسیاتی پیش کش کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ آزادی بیگم کے ذریعے ایک بیوہ عورت کی کشمکش اور جذباتی الجھنوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جبکہ غیرت بیگم کے ذریعے حسد اور جلن کو پیش کیا گیا ہے۔ نذیر احمد نے ان کرداروں کی نفسیاتی کشمکش کی طرف خاص توجہ دے کر ان کی انفرادی خصوصیات کو فن کارانہ مہارت سے نمایاں کیا ہے۔ المختصر نذیر احمد نے اپنے ابتدائی ناولوں میں جن نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے ان میں ایک کمی ہے اور وہ یہ کہ جو کردار برے کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے اس میں تمام برائیوں کو بھر دیا گیا ہے اور جو کردار اچھے کردار ہیں ان میں دنیا بھر کی اچھائیاں گھر کیے ہوئے ہیں۔

پہلے ناول نگار "نذیر احمد" کے بعد کئی لوگوں نے عورتوں کے مختلف اخلاقی، سماجی اور معاشرتی مسائل کی طرف توجہ مبذول کر کے ان کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالی، شاد عظیم آبادی اور مرزا عباس حسین ہوش قابل ذکر ہیں۔ حالی نے "مجالس النساء" میں عورتوں کی اخلاقی درستی اور معاشرتی اصلاح کے بارے میں دلچسپ باتیں بیان کی ہیں۔ اس میں سوائے زبان و بیان کی شادابی کے فنی لحاظ سے کوئی خوبی یا انفرادیت نہیں ملتی ہے۔ شاد عظیم آبادی نے صورت الخیال میں نذیر احمد کی اصغری سے ملتا جلتا کردار ولایتی کا پیش کیا ہے۔ ان دونوں کرداروں میں فرق یہ ہے کہ اصغری شروع سے آخر تک ایک اتالیق کی صورت میں نظر آتی ہے جس کے پاس جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس ولایتی کے کردار میں احساسات و جذبات کی متنوع دنیا اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں سنجیدگی بھی ہے اور شوخی بھی۔ خوشی کے موقعے پر وہ ہنس بھی لیتی ہے اور غم میں افسردہ بھی ہوتی ہے۔ ہوش کے افسانہ نادر جہاں؛ کی طاہرہ میں بھی اصغری کے کردار کی طرح صرف خوبیاں ہی خوبیاں اور اچھائیاں ہی اچھائیاں پائی جاتی ہیں۔

البتہ طاہرہ کی ساس کا کردار اپنی منفرد خصوصیات کی بناء پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے کردار میں باضابطہ ارتقائی منازل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ربط وضبط میں ہوش نے چند دلچسپ کردار پیش کئے ہیں۔ جہاں آراء، مہر جان اور امیر النساء اپنی نسوانی خوبیوں اور خامیوں کی بناء پر پرکشش ہیں۔ البتہ روزی کا کردار اپنے اندر بھرپور مثالیت لئے ہوئے ہے۔ اس دور میں رتن ناتھ سرشار نے کئی اہم اور کامیاب کرداروں کو تخلیق کیا ہے جن میں حسن آراء پہر آرا اور اللہ رکھی (فسانہ آزاد) قابل ذکر ہیں اگرچہ حسن آرا کو ایک شریف عورت کے روپ میں متعارف کرایا گیا ہے لیکن اس کی آزادی اور بے باکی نسوانی معصومیت اور شرافت کی نفی کرتی ہے۔ ہیروئن ہونے کی حیثیت سے سرشار نے اس کے کردار میں جن خصوصیات کو پیش کیا ہے ان سے یہ کردار غیر فطری سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ ان خصوصیات کی اس کردار میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اگر سرشار حقیقت پر ہی اکتفا کرتے تو یہ کردار مزید جاندار ہوتا لیکن پھر بھی اس کی تخلیق میں سرشار نے جس فنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ چند خامیوں کے باجود یہ کردار کامیاب ہے۔ حسن آراء کے برعکس اس کی چھوٹی بہن سپہر آرا کے کردار میں حقیقی پہلوؤں کو مد نظر رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے اُس کی سیرت میں فطری جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس لئے اس کا کردار حسن آرا سے زیادہ جاندار کہلایا جاسکتا ہے۔ اللہ رکھی سرشار کا سب سے زیادہ جاذب نظر اور پرکشش کردار ہے۔ اس کردار میں ہندوستانی معاشرے کے پسے کچلے طبقے کی

ایک عام عورت ملتی ہے۔ جو اپنے اندر بھرپور ارضیت لئے ہوئے ہے۔ اس کے کردار میں زندگی کی حرارت بھی ہے اور جینے کی تڑپ بھی۔ زندگی کو کپڑے کی طرح رینگتے اور سسکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر قسمت کا تماشا دیکھ سکتی ہے۔ وہ سسکیوں کو قہقہوں میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ ایک مخصوص معاشرت کی پروردہ اللہ رکھی اپنے کردار کی انفرادیت کو شروع سے آخر تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

شرر کا نام تاریخی ناول نگاری کی وجہ سے نہایت اہم ہے۔ اپنے نسوانی کرداروں میں نہوں نے برے کردار بھی پیش کئے ہیں اور اچھے کردار بھی۔ ان کے کرداروں میں بہت سی چیزیں یکساں ہیں مثلاً ان کے ہر ناول کی ہیروئین خوبصورتی، خوب سیرتی، خود اعتمادی، خود اری، دلیری، جرات مندی، محبت، خلوص اور غیرت مندی کا ایک دلنواز پیکر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے نسوانی کرداروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مذہب کے سچے عقیدت مند ہوتے ہیں ورجنا، موہنا، مریم، فلورنڈا اور زمرد وغیرہ ان کے کامیاب نسوانی کردار کہلائے جاسکتے ہیں۔ حکیم محمد علی طبیب نے بھی کئی تاریخی ناول شرر کی تقلید میں لکھے ہیں لیکن ان کے ناولوں میں کوئی ایسی انفرادی خصوصیت نہیں ملتی ہے جو ان کی الگ پہچان کہلائی جاسکتی ہو۔ سجاد حسین انجم نے ایک ناول نشتر" لکھا ہے جس میں طوائفوں کی زندگی سے متعلق مختلف مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ خانم جان اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے کردار میں کوئی غیر فطری خوبی یا خامی نہیں ملتی ہے بلکہ خانم جان کا کردار زندگی کی تمام صداقتوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جذبات کی وارفتگی، اور احساسات کا والہانہ پن اس کے کردار کی خاص خصوصیات ہیں۔ منشی سجاد حسین کے نسوانی کرداروں میں میٹھی چھتری کی بیگم ایک کامیاب کردار کہلائی جاسکتی ہے۔ بیگم کی زندگی کی شکستہ حالیوں اور تلخیوں کو فن کارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ قاری سرفراز عزمی کے اہم ناول" شاہد رعنا کی ننھی جان ایک جاذب نظر کردار ہے۔ اس کی زندگی کے مختلف نشیب و فراز، نفسیاتی کشمش اور ذہنی الجھنوں کو پیش کرنے میں فن کار نے اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا ہے۔ اور یہی فن کارانہ پیش کش اس کردار کی کامیابی کا بڑا راز ہے۔

محمد ہادی رسوا کا نسوانی کردار امراؤ جان اردو کے نسوانی کرداروں کی دنیا میں ایک تابناک کردار ہے۔ مندرجہ بالا تمام نسوانی کرداروں کے مقابلہ میں یہ کردار، بھرپور، جامع اور دلچسپ ہے۔ تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود یہ کردار اپنی ہمہ جہت شخصیت کی پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے۔ امراؤ جان کی زندگی مختلف حالات میں مختلف تبدیلیوں سے دوچار ہوتی ہے جن کو رسوا نے خارجی حالات

اور باطنی کیفیات سے ہموار کر کے فنکارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے کردار کی عظمت یہ ہے کہ ایک گھناؤنے اور غلط ماحول میں تربیت پانے اور زندگی بسر کرنے کے باوجود اس کا ضمیر زندہ ہے اور یہی زندہ ضمیر امراؤ کی احساساتی اور جذباتی دنیا کو تابناکیاں بخشے ہوئے ہے۔ انسان کی بے رحمیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہونے کے باوجود انسانیت پر اس کا یقین ہے یہی یقین اس کی جیت ہے اور یہ جیت اس کے کردار کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

رسوا کا دوسرا نسوانی کردار خانم (امراؤ جان ادا) بھی ایک اہم کردار کے روپ میں ابھرتا ہے۔ وہ ایک تجربہ کار اور جہاں دیدہ عورت ہے۔ کسی بھی موقعہ پر اس سے کوئی بھول چوک نہیں ہوتی ہے۔ ہر کام نہایت دلیری، بردباری اور تندہی سے کرنے والی خانم ایک شاطر اور کامیاب وکاندار ہے پہلے خود ایک بکنے والی جنس ہوتی ہے لیکن اب دوسری بکنے والی جنسوں کی سرپرست ہے۔ وہ کسی سے دبنے والی نہیں ہے جو کچھ سماج نے اسے دیا ہے وہی وہ بسم اللہ جان، امیرن جان خورشید جان، بیگا جان اور امراؤ جان کی صورت میں واپس لوٹاتی ہے۔ بسم اللہ جان کے کردار میں زندگی کی گرمی اور تڑپ سب سے زیادہ ملتی ہے۔ موقعہ پرستی، خود پسندی، خود غرضی اور طوطا چشمی اس کی خاص خصوصیات ہیں۔ اپنی ماں خانم کی طرح وہ ایک کامیاب طوائف کی ساری خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا ظاہر بھی طوائف ہے اور اس کا باطن بھی طوائف ہے۔ خورشید جان خانم کے نگار خانے میں رہنے کے باوجود خود کو اس ماحول سے وابستہ نہیں کر پاتی ہے۔ ضمیر کی بے چینی اس کو ہر وقت مضطرب رکھتی ہے۔ یہ اضطراب اور بے قراری ہی اس کے کردار کی خاص خصوصیات ہیں۔ رسوا نے ان کرداروں کو ان کی تمام تر ذہنی پیچیدگیوں اور معاشرتی اُلجھنوں کے ساتھ ابھارا ہے۔ ماحول کی یکسوئی کے باوجود ان کی الگ الگ انفرادیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

رسوا کے بعد راشد الخیری کا نام اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک اہم نام ہے۔ نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی عورت اور اس سے متعلق مختلف مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے جہاں بھی عورت کو پیش کیا ہے مشرقی تہذیب کا نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اپنے نسوانی کرداروں کے ذریعہ انہوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ حقیقتاً عورت پر ہی گھریلو زندگی کا دارومدار ہے۔ عورت کو ایک بڑی طاقت کے طور پر انہوں نے متعارف کرایا ہے۔ چاہے یہ طاقت برائی کے لئے استعمال کی جائے یا اچھائی کے لئے۔ ان کے نسوانی کرداروں میں نسیمہ، سنجیدہ بیگم، وسیم دلہن، نسترن، جہاں آرا، حشمت آرا، ناصرہ اور ہاجرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعہ انہوں نے عورت کی بے زبانی، خوش فہمی، مظلومیت، ناچاکی کا بیان موثر طریقے سے غم

انگیزی کے ساتھ کیا ہے۔ ان تمام خاتون ناول نگاروں کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ انہوں نے اپنے حالات و مسائل کی ترجمانی کا بیڑا خود ہی اٹھالیا ہے۔ اب انہیں کسی نذیر احمد یا راشد الخیری کی ضرورت نہیں رہی جو ان کے جذبات کی ترجمانی کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان تمام ناول نگار خواتین نے صرف عورت کی مظلومیت کی باتیں نہیں کی ہیں، نہ ہی اس کے حال زار پر آنسو بہانے پر اکتفا کیا ہے۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم، اخلاق اور ان کی آزادی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے اور عام طور پر ایک آئیڈیل عورت یا لڑکی کا تصور بھی پیش کیا ہے جو مشرق و مغرب کی بہترین قدروں کی امین ہے۔ یہ سمجھنا بھی سو فیصد درست نہیں کہ نذیر احمد نے اصغری کی شکل میں ایک مثالی عورت کا جو کردار پیش کیا تھا۔

اس سے انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے آغاز میں ابھرنے والی خاتون ناول نگاروں نے انحراف کیا ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں اصغری کا کردار ان کے دائرہ فکر میں موجود رہا ہے لیکن اس میں انہوں نے اپنی پسند کے مطابق تبدیلیاں کی ہیں۔ بعض خصوصیات کو حذف کیا ہے اور چند خصوصیات کا اضافہ کیا ہے تاکہ اسے زمانے کے تقاضوں کے مطابق بنایا جا سکے۔ نذیر احمد اور راشد الخیری کے یہاں عورت "چراغ خانہ" ہے اور شمع محفل بننا تو دور کی بات ہے، بر سر محفل آنا بھی اس کے لئے شرم کی بات ہے۔ نئے علوم و فنون سے آشنائی اس کی قسمت میں نہیں چونکہ گھر سے باہر نکلنا اس کے لیے معیوب ہے۔ وہ مظلوم ضرور ہے مگر اس کی مظلومیت کا مداوا بس اس طور سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے شوہر، بال بچوں یا دوسرے افراد خانہ کی زیادہ خدمت کرے۔ یہ تصور بریم چند تک کے ناولوں میں موجود ہے۔ ایسے میں بیسوی صدی کے آغاز سے تیس پینتیس سال کے دوران ابھرنے والی خاتون ناول نگاروں کا نقطہ نظر اور طرز فکر خاصا باغیانہ محسوس ہوتا ہے۔ کم و بیش تمام خاتون ناول نگاروں نے عورتوں کے لیے ایک نئی زندگی کا خواب دیکھا ہے۔ نئی تعلیم و تہذیب سے آشنائی کو ان کی محرومیوں کا مداوا کہا جاتا ہے اور استحصال کی صورت میں گھر سے باہر نکل کر جدوجہد کرنے کو ان کا حق قرار دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی آئیڈل عورت ایمان و کفر، مشرق و مغرب، مذہب و سائنس دونوں کا دامن تھامے رہتی ہے۔ وہ تمام امور شریعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم بھی حاصل کرتی ہے اور مغربی تہذیب کے بہترین عناصر کو اپنی زندگی کا حصہ بناتی ہے۔ اس طرح یہ خواتین عورت کو صرف مظلومیت کا نہیں حرکت و عمل کا پیکر بنا کر پیش کرتی ہیں۔ مردوں نے کیا نہیں کیا ہے۔

عورتوں کے تحریر کردہ ان ناولوں میں اوہام پرستی اور بوجھل رسوم و رواج کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے۔ اس طرح کے اوہام میں عورتیں ہی زیادہ مبتلا تھیں۔ اس لیے یہ احتجاج بہت اہم ہے۔ عورتوں کے لکھے

ہوئے ان ناولوں کی ایک اور خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ ان میں خاص عہد کے اعلیٰ upper middle class مسلمانوں کے تہذیبی امورر معاشرتی احوال محفوظ ہو گئے ہیں۔ تہذیب جو مٹ رہی تھی اور جس کو بچائے رکھنے کے لیے مسلمانوں کے خوشحال طبقے نے اپنی زندگی کی بچی کچھی خوشیاں بھی داؤں پر لگادی تھیں، اپنی فرسودگی کے باوجود کل بھی رومان پرور تھی اور آج بھی خوشگوار لگتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اس تہذیب کے اکثر عناصر کو ہم مٹتے ہوئے جاگیر دارانہ نظام کی نشانی سمجھ کر اس کی تنقید کرتے رہے ہیں۔ لیکن یہ عناصر اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ جس طرح عورتوں کے لکھے ہوئے ناولوں میں پیش ہوئے ہیں اس طرح مردوں کے تحریر کردہ ناولوں میں پیش نہیں ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے۔ چونکہ یہ تہذیب بیشتر گھروں کے اندر منعقد ہونے والی تقریبات محفلوں اور مجلسوں میں زندہ تھی، رسوم ورواج کی شکل میں موجود تھی۔ پرب تہواروں کی صورت میں محفوظ تھی اور ایسی چیز میں تھیں جن کا عورتوں سے براہ راست اور گہرا تعلق تھا۔ وقار عظیم نے درست لکھاہے:

"ایک تیسری چیز جس کے بہت حسین مرقعے ہیں ان ناولوں میں ملتے ہیں وہ رسوم ہیں جن کی رومانیت اپنی کہنگی، فرسودگی اور افویت کے باوجود بھی پرکشش ہے۔ اس ظاہری حسن اور کشش کے علاوہ ان رسوم میں صدیوں کی تہذیبی روایت، قومی مزاج اور مخصوص فکری و جذباتی میلان کا بیش بہا سرمایہ بھی محفوظ ہے۔ اس لیے انہیں ترک کر دینے کے بعد بھی ہم ان کی یاد کو ایک دولت بیدار سمجھتے ہیں یہ ناول زندگی کے ایک ایسے دور میں لکھے گئے جب ہندوستان کے امیر و متوسط گھرانوں میں یہ رسوم پوری آب و تاب سے ہوتی جارہی ہیں اس لیے ان کا ہر ورق ان کے حسن کا آئینہ ہے۔"[۲]

جہاں تک ان ناولوں کے فنی محاسن کا سوال ہے، انہیں دور حاضر کی ناول نگاری کے مقابل رکھنا کار لا حاصل ہو گا۔ ظاہر ہے جب مرزار سوا گئے امراؤ جان ادا" سے قبل مرد ناول نگاروں کے سامنے پلاٹ سازی یا کردار نگاری کا کوئی واضح تصور نہیں تھا، تو خواتین اس سے کس طرح واقف ہو سکتی ہیں؟ ان خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں میں عام طور پر پورا قصہ ایک مرکزی کردار یا بہ الفاظ دیگر ایک ہیروئن کے گرد گھومتا ہے اور اکثر ناولوں کا نام بھی اسی مرکزی کردار کے نام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ کردار تمثیلی تو نہیں ہوتے مگر بہر حال اپنی ضرورت کے مطابق تراشے جاتے ہیں۔ اور ان کی شخصیت کے رد عمل یا نفسیاتی نشیب و فراز کی پیش کش

ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ خیر و شر کے تصادم کے لیے جو کردار ابھارے جاتے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص دائرہ کار سے باہر بھی نہیں جاتے۔ پلاٹ سازی کی صورت یہ ہے کہ عموماً واقعات ڈھیلے ڈھالے انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ مگر اتنے بھی بے ربط نہیں ہوتے کہ قاری کے لیے قصے کا سرا تھامنا مشکل ہو جائے۔ مکالمہ نگاری اور زبان و بیان کی صحت اور چستی و درستی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ چونکہ زبان کے اصل خدو خال تو درون خانہ ہی محفوظ ہوتے ہیں مجموعی طور پر عورتوں کے لکھے ہوئے اکثر ناولوں کی زبان معیاری ہے۔ اس سلسلے میں ایک قابل غور اور اہم نکتہ یہ ہے کہ ان خواتین ناول نگاروں کا تعلق کسی خاص علاقے یا صوبے سے نہیں ہے۔

شمالی ہند ہو یا جنوبی ہند، دہلی ہو لکھنو ہو یا عظیم آباد، ہر جگہ خواتین نے ناول لکھے ہیں اور اپنے عہد کے اعتبار سے کامیابی کے ساتھ لکھے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ مختلف علاقوں میں لکھے جانے والے ان ناولوں میں طرز و فکر کم و بیش یکساں ہے اور یہ طرز فکر حقیقت سے بے حد قریب ہے۔ ان ناولوں میں اگر کوئی نمایاں عیب ہے تو بس یہ ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کی طرح جابجا واعظانہ تقریریں اور نصیحتیں ملتی ہیں جن سے قصے کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے۔ دراصل مقصدیت اس دور کے ادب کا عام مزاج تھی جس سے چھٹکارا پانا نذر سجاد جیسی ناول نگار کے لیے بھی ممکن نہ ہو سکا۔ نوابوں، رئیسوں اور امیروں کی چمک دمک اس طرح دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول کی خواتین ناول نگار کا یہ زندگی کی شکست و ریخت کے تمام واقعات اور طبقاتی نظام کا مکمل عکس اس عہد کی عہد سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا صحیح عکاس اور آئینہ دار ہے۔ مغرب و مشرق کے تمدن خواتین کے ناولوں میں بڑی خوبصورتی سے ظاہر ہوا ہے۔ اس معاملے میں خواتین اور تہذیب کا آپس میں تضاد اور ٹکراؤ کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں تبدیلیاں واضح طور پر ناول نگار مردوں سے بہر حال ممتاز نظر آتی ہیں۔ چوں کہ نئے حالات اور نئے خیالات کے جنم لینے سے جدید و قدیم کے واقعات پر عورتوں کی نظریں زیادہ رہتی ہیں اور انھیں قریب سے مشاہدہ کرنے کا اچھا اقدار و معیار میں شدید قسم کی مشکل ہو رہی تھی، جس سے متصادم قسم کے رجحانات ابھر رہے تھے۔

نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں خواتین کی اخلاقی تربیت:

بیسویں صدی کے آغاز میں جن خاتون ناول نگاروں نے شہرت اور مقبولیت حاصل کی ان میں سب سے نمایاں نام نذر سجاد حیدر کا ہے۔ ان کی پیدائش ایک اعلی اور روشن خیال مسلم گھرانے میں ۱۸۹۶ء کے آس پاس ہوئی۔ وہ سجاد حیدر یلدرم کی بیوی اور قرۃ العین حیدر کی والدہ ہیں۔ ابتدا سے ہی انہیں ایک ایسا گھریلو ماحول ملا جسے ترقی پسند اور روشن خیال سمجھا جاتا تھا۔ صغری ہمایوں کی طرح ہندوستان کے مختلف علاقوں

اور باہر کے ملکوں کی سیاحت کا بھی انہیں موقع ملا۔ یلدرم کی افسانہ نگاری، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر رومانیت اور جمالیت کے عناصر غالب ہیں، بھی انہیں متاثر کرتی رہی۔ ایسے میں انہوں نے جو ناول لکھے وہ اس عہد کی دوسری خاتون ناول نگاروں کے مقابلے میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ ان میں رومانیت اور حقیقت نگاری کے خوبصورت امتزاج کے ساتھ ساتھ فنکاری بھی ہے۔ نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول "اختر النساء بیگم" ہے جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس ناول کا موضوع " تعلیم نسواں ہے یہ بھی ایک کرداری ناول ہے جو مرکزی کردار اختر النساء بیگم کے گرد گھومتا ہے۔ وہ ایک جرات مند اور باحوصلہ عورت ہے اور فرسودہ رسم و رواج یا غیر ضروری پابندیوں کی زیادہ پروا نہیں کرتی قابل غور بات یہ ہے کہ مصنفہ نے یہ ناول صرف چودہ پندرہ سال کی عمر میں تحریر کیا تھا۔ ایسے میں ان کا نقطہ نظر حیرت انگیز بھی ہے اور قابل داد بھی۔ یوسف سرمست نے اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "نذر سجاد حیدر کی ہیروئن اختر النساء اس اعتبار سے زیادہ روشن خیال اور ترقی پسند ہے۔ وہ گو انتہائی ظلم و ستم سہتی ہے لیکن جب اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے تو اپنی زندگی کو خود آپ بناتی ہے وہ فرضی نام اختیار کر کے تعلیم بھی حاصل کرتی ہے اور ملازمت بھی کرتی ہے۔ یہ ناول بیسویں صدی کے پہلے دہے میں لکھا گیا لیکن اس کے باوجود اس ناول کی ہیروئن ایسا جرات مندانہ کام کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نذیر احمد اور راشد الخیری کی کوئی ہیروئن اس قدر جرات سے کام نہیں لے سکتی تھی۔" (۳)

اس ناول کے تمام واقعات کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ نے مسلمان عورت کی اوہام پرستی، جہالت اور رسوم پرستی وغیرہ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا ہے مگر ناول کی آخری اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ مسلم معاشرے خصوصاً مسلم خواتین کی ساری پریشانی کا حل ان کا تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ نذر سجاد کا دوسرا ناول "جاں باز" ہے جو پہلے رسالہ "عصمت" میں چھپتا رہا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس کا مزاج بھی اصلاحی ہے۔ اس میں ہندوستان کی سودیشی تحریک کے پس منظر میں ایک نیم رومانی کہانی پیش کی گئے زبیدہ ایک قوم پرست لڑکی ہے جس کا منگیتر قمر ایک مغرب زدہ لڑکی کے دام میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ مگر زبیدہ کی سچی محبت اور ثابت قدمی بالآخر قمر کو اس سے ملا دیتی ہے اور نجمہ برے انجام سے دوچار ہوتی ہے۔ نذر سجاد کا ایک اور ناول " آہ مظلوماں" ہے جو ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ کا موضوع دوسری شادی اور اس کے برے نتائج پر مبنی ہے۔ اس کا مزاج بھی اصلاحانہ وواعظانہ ہے۔ ان کا ایک ناول "ثریا ۱۹۳۰ء میں اور نجمہ ۱۹۳۹ء

میں طبع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک ناول " حرماں نصیب" بھی لکھا تھا۔ ان کا ناول "مذہب اور عشق" ان کی پھوپھی " والدہ افضل علی" (اکبری بیگم) س کے نام سے تھا۔ ان کی ناول نگاری کے بارے میں محترمہ نیلم فرزانہ کا یہ بیان بہت اہم ہے:

"در اصل نذر سجاد حیدر کے نزدیک فنی عوامل اس قدر اہم نہیں تھے جس قدر اپنے موضوع کی معاشرتی اہمیت۔ البتہ اس سلسلے میں انہوں نے ایک کوشش ضرور کی کہ اپنے قصوں کو دلچسپ اور پر اثر بنائیں اور اس میں وہ بلاشبہ کامیاب ہیں۔"(۴)

ظاہر ہے کہ موضوعات کے تنوع، مقصد کی سنجیدگی اور قصے کی دلچسپی کے ساتھ معاشرت کی آئینہ داری کے اعتبار سے نذر سجاد کے ناول اہم ہیں۔

اختر النسا بیگم:

اختر النساء بیگم نذر سجاد کا پہلا ناول ہے۔ اس میں مسلمانوں کی معاشرتی زندگی برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ مصنفہ کے اس ناول میں ان سماجی برائیوں اور غلط رسوم کے خلاف کی کئی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ توہم پرستی، جہالت اور بے بنیاد رسم ورواج کے غلط صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ مختلف نظریوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کا ناول " نجمہ " بھی اصلاحی نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے۔ پنپنے والے مسائل اور سماجی روایات کو جس خوبی سے اجاگر کیا ہے، وہ یقیناً مغربی تعلیم اور مشرقی اقدار کی روشنی میں پیش کی گئی ہیں۔ زندگی کا ایک ایسا نصب العین پیش کیا گیا ہے جو دونوں تہذیبوں کے صحت مند اقدار کے امتزاج سے ایک مثالی سماج کا تصور سامنے لاتا ہے۔ آہ مظلوماں نذر سجاد کا مشہور ناول ہے اس ناول میں دو طبقوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے پر جس قسم کے برے اور غلط نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ نذر سجاد نے اس کی طرف نشان دہی کی ہے، یہی اس ناول کا موضوع بھی ہے۔ اس طرح کی شادیاں نہ صرف نچلے طبقے کے لیے وبال جان ثابت ہوتی ہیں بلکہ اعلیٰ طبقہ ایسے کاموں کو کرنے میں برابر کا شریک تھا۔ سماج میں اس طرح کی برائیاں صرف مردوں کی وجہ سے وجود میں نہیں آتیں بلکہ عورتیں بھی ان برائیوں کو ہوا دینے میں برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے نذر سجاد کے متعلق لکھا ہے۔

"اس عہد کی ناول نگاروں میں نذر سجاد حیدر خصوصی اہمیت رکھتی ہیں انھوں نے ہے اور ظاہری بات ہے کہ جس طرح اختر النساء نے جرات مندانہ قدم اٹھائے ہیں کئی ناول لکھے۔ جن میں اختر النساء بیگم، جانباز، آہ مظلوماں، ثریا، نجمہ اور حرماں نصیب

اس طرح سے نذیر احمد اور راشد الخیری کی ہیروئین اس بے باکی اور جرات مندی سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔"(۵)

نذر سجاد نے چودہ سال کی عمر میں ایک نہایت ترقی پسند اصلاحی ناول لکھا جس کی ہیروئن "اختر النساء بیگم "نے مردوں کے معاشرے کے مظالم کا نہایت عقل مندی سے مقابلہ کیا اور آخر میں فتح مند ہوئی... اس کے یہ سارے ناول ان کے طبقہ کے اس پس منظر کی بہت عمدہ عکاسی کرتے ہیں، جس نے پچھلی صدی کے آخر میں اور اس صدی کے شروع میں یوربین تہذیب اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ لڑکیاں پردے میں تھیں لیکن یورپین نرسیں انھیں انگریزی پڑھاتی اور پیانو بجانا سکھاتی تھیں۔ اس طرح عورتوں کی تعلیم و تربیت کی افادیت اور ضرورت کو نذر سجاد حیدر کے ناول اور ان کے موضوعات ایک عام زندگی کی سچی اور واضح تصویر بناتے ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار اختر النساء ہے جو تعلیم یافتہ، شریف، باحیا، گہری حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں میں رومانوی عناصر بھرپور انداز میں دور اندیش اور قوم پرست ہونے کے علاوہ وہ تعلیم نسواں کے فروغ میں حصہ لیتی ہے ملتے ہیں۔ چوں کہ رومانوی فضا اور ماحول اس عہد کا مزاج بن گئے تھے۔ اگر انھوں اور ملک و قوم کی خدمت بھی انجام دیتی ہے اور زندگی کی پر خار وادی میں اسے ظلم و ستم نے ایک طرف خالص مشرقی اقدار کے مستحکم عناصر کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے تو اور مخالفتوں سے نبرد آزمائی بھی کرنی پڑی ہے۔ جب وہ گھر سے نکال دی جاتی ہے تو دوسری طرف مغربی تہذیب اور تعلیم کی خوبیوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے اور اپنے وہ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنے کے لیے جد و جہد شروع کر دیتی ہے۔ اپنی دنیا خود بیشتر ناولوں میں ہندوستان کی سماجی فضا میں سانس لینے والی عورتوں کی مظلومیت اور بناتی ہے۔ اس کا اسکول انسپکٹر کی حیثیت سے ملازمت کرنا اس عہد کے لیے ایک نئی بے چارگی کا واضح نقشہ پیش کیا ہے۔ مولانا رازق الخیری نے نذر سجاد حیدر کی کردار اختر النساء کو اس اعتبار سے قرن الشحال لکھا ہے:

"اگر یہ بحث چھڑے کہ خود عورتوں میں کس نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور ان کے شرعی حقوق کے حصول کی ان تھک کوششیں کیں، عظیم المرتبت، بلند پایہ لکھنے والیوں میں اردو کی کون کی مصنفہ ہے۔ جس کی ساتھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کی جائے مشرقی شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو۔ تو ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک نام لیا جائے گا "نذر سجاد حیدر"(۶)

نذر سجاد حیدر میں ڈپٹی نذیر احمد جیسے واعظ نظر آتے ہیں نہ شرر کی طرح مصنفہ کرداروں کی انگلی پکڑ کر انہیں کسی خاص سمت میں لے جاتی ہے۔ اور نہ ہی سرشار کی تائید اس میں کہیں ابتدال یا گھٹیا مذاق ہے۔ نذر سجاد حیدر کا پورا گھرانہ علم و ادب کا رسیا تھا۔ ان کے شوہر سید سجاد حیدر یلدرم ایک صاحب طرز افسانہ نویس تھے اور ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر اردو ادب کی ایک نامور ہستی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا بنیادی موضوع نئے رجحانات کو اپنانا تھا کہ زندگی بہتر طریقے پر گزاری جاسکے۔ وہ ذاتی طور پر انگریزی تعلیم کو پسند کرتی تھیں مگر ساتھ ہی ساتھ غیر ذمہ دارانہ آزادی اور بے راہ روی کے بھی خلاف تھیں۔ مغرب کی اندھا دھند تقلید انہیں پسند نہیں تھی۔ ان کے ناول اس طبقہ کی بہت عمدہ اور حقیقی نمائندگی کرتے ہیں جس نے پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے اوپری طبقے کی طرح یورپی تہذیب اپنانا شروع کر دی تھی۔ انہوں نے اس طبقے کی عکاسی کی جس کی لڑکیاں پردے میں تھیں لیکن گوریوں کی طرح انہیں انگریزی پڑھائی اور پیانو سکھائی جاتی تھی۔ آج سے نصف صدی قبل نذر سجاد جس ہندوستانی مسلم معاشرے کا حصہ تھیں اس میں ان کو جدت پسند عورت سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں ان اولین خواتین رہنماؤں میں سے تھیں جنہوں نے لاتعداد بے زبان عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھائی اور انہیں مردوں کے پنجہ استبداد سے رہا کرانے کی جدوجہد کی۔ ان کے متعدد افسانے اور ناول اسی جدوجہد کی غمازی کرتے ہیں۔

آہِ مظلوماں

"آہِ مظلوماں" (۱۹۱۱ء) نذر سجاد حیدر کا دوسرا ناول ہے۔ ایک ایسا ناول ہے جس میں مرکزی کردار کے طور پر مرزا عزیز الرحمن اسٹنٹ کمشنر اور سلطنت آرا بیگم کو پیش کیا گیا ہے۔ سلطنت آرا ایک خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جہاں دولت بھی ہے، عزت بھی ہے، اور تعلیم بھی اس میں سلطنت آرا کے تین بھائی حامد علی، محمود علی اور محمد علی ایک بہن تمکنت آرا اور بہنوئی رشید الزماں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ منظم اور گٹھا ہوا ہے۔ کردار نگاری میں بھی ناول نگار نے اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اور جیسا کہ ناول نگار کے دور میں تمام ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے اعصاب پر عورت سوار تھی۔ اس کے مطابق نذر سجاد حیدر زیادہ سے زیادہ نسوانی کرداروں کی ہمدرد نظر آتی ہیں۔

ایک جگہ لکھتی ہیں:

اور یہ شریف بیبیوں ہی کا حوصلہ ہے۔ کہ اس قدر ظلم و ستم سہ کر بھی ویسی ہی وفادار و جان نثار رہتی ہیں یہ شوہر پرستی نہیں۔ تو اور کیا ہے؟ ایک شریف و تعلیم یافتہ بی بی سے بڑھ کر دنیا میں مرد کا کوئی ہمدرد نہیں۔ مگر بی بی بھی وہ جو بیوی کہلانے کی اصل مستحق جیسی کہ ڈپٹی صاحب کی دوسری ہو۔ ورنہ ایسی ہو ا عورت بھی باعث بربادی ہے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان میں تو اسی قسم کی ناجائز شادیوں کی آندھی چل رہی ہے۔ جس میں کمی نہیں۔ بلکہ طوفان برپا ہے۔ مگر کوئی اس طرف توجہ نہیں کرتا۔ ایڈ کر ان مرور ریفارمران نحوم تو بہتیرے ہیں۔ لیکن اس کے انسداد کی کسی کو فکر نہیں۔ آخر وہ بے بس و بیکس فرقہ بھی اسی قوم کا ایک حصہ ہے جس پر نہایت بے دردی سے اندھا دھند ظلم ہو رہا ہے۔ مگر آہ کسی کو پروا نہیں۔"(۷)

"سلطنت آرا" کے کردار میں بھی ایک ایسی ہی عورت ابھرتی ہے۔ ڈپٹی صاحب یعنی عزیز الرحمن سلطنت آرا سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن اچانک ان کی زندگی میں "زرین" نام کی ایک آوارہ عورت داخل ہوتی ہے۔ اور عزیز الرحمن کا رویہ بدلنے لگتا ہے۔ سلطنت آرا اس تغیر کو محسوس کرتی رہتی ہے۔ لیکن شرافت اسے خاموش رکھتی ہے اور پھر ایک دن عزیر الرحمن خود ہی سلطنت آرا کو بولنے کا موقع دیتے ہیں۔ جب وہ یہ سناتے ہیں کہ ان کا تبادلہ ہو چکا ہے اور اس بار وہ سلطنت آرا کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے، وہ کچھ دنوں کے لیے میکے چلی جائے۔ سلطنت آرا پر یہ راز راز نہیں رہتا کہ اس کی نگاہ کسی اور پر ہے۔ لیکن وہ خاموشی سے آگرہ کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔

چند دنوں تک عزیز الرحمن کے خطوط آتے رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ تب سلطنت آرا ایک دن خود ہی اپنے بچے کو لیے ہوئے شوہر کے پاس پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں وہ زرین کو دیکھتی ہے۔ "زرین" صورت و شکل، عادات و خصائل نہیں کسی طرح بھی سلطنت آرا کو نہیں پہنچ پاتی اور اسکے باوجود ڈپٹی صاحب نے اس سے عقد کر رکھا ہے۔ کہانی اس وقت تیز رفتار ہو جاتی ہے جب کچھ دنوں کے لیے "زرین" ایک کنیز کی طرح سلطنت آرا کی خدمت کرتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ ڈپٹی صاحب کے کان بھر کر انھیں اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اسے الگ مکان لے کر رکھیں۔ ڈپٹی صاحب کچھ دنوں تک تو یہ اصول نبھاتے رہے کہ ایک دن سلطنت آرا کے پاس رہے اور دوسرے دن زرین کے ساتھ۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ اس غم نے سلطنت آرا کو ایسا بیمار ڈالا کہ بچنے کی اُمید نہ رہی اور آگرہ خبر دے کر رشید الملک کو

بلایا گیا۔ اور سلطنت آرا ایک بار پھر میکے روانہ ہوئیں۔ اس میں نذر سجاد حیدر نے وقت کی مناسبت سے اور کہانی کو دیکھتے ہوئے ایک شو میں بہت کچھ کہہ دینے کی کوشش کی ہے۔

آگرہ میں بھائیوں کی محبت بہنوں کی ہمدردی نے سلطنت آرا کو نئی زندگی بخش دی لیکن دوسری طرف ڈپٹی صاحب کو زندگی نے پوری طرح تباہ کر رکھا ہے۔ اور آخر وہ یہ پروگرام بنا لیتی ہے کہ ڈپٹی صاحب کا خاتمہ کر کے مال لے جائے۔ اس کے کچھ غنڈے رات کو چوروں کی طرح کوٹھی میں گھستے ہیں لیکن ڈپٹی صاحب کی گولیوں سے زخمی ہو کر بھاگتے ہیں، ڈپٹی صاحب کو بھی گولی لگتی ہے۔ زخم گہرا آنے کی وجہ سے وہ مہینوں بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ علاج کے لئے پیسے بھی نہیں بچتے جب باری زیوروں کے بیچنے کی آتی ہے تو ایک رات چپکے سے زیورات اور گھر کے دوسرے سامان لے کر زرین فرار ہو جاتی ہے۔ ڈپٹی صاحب کا پرانا ملازم کسی طرح سلطنت آرا کو خبر کر دیتا ہے۔ اور وہ شوہر پرست مشرقی عورت اس مصیبت میں شوہر کے کام آجاتی ہے۔ "سلطنت آرا" کے کردار میں ایک مکمل مشرقی عورت کا تصور ابھرتا ہے۔ جو تعلیم یافتہ بھی ہے۔ حسن و جمال اور سیرت بے مثال کی مالک بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک وفاشعار اور شوہر پرست بیوی ہے۔ جس نے شوہر کا ہر ظلم سہہ کر بھی اُف نہ کیا۔ اس ناول کا اصل قصہ ڈپٹی صاحب اور سلطنت آرا سے تعلق رکھتا ہے۔ زبیدہ اور عظمت اللہ سے اگر صرف ناول کے عنوان 'آہ مظلوماں' کی مناسبت سے سلطنت آرا اور زبیدہ دو مظلوم نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے تو بھی ناول نگاری کے مزاج اور فن کے لحاظ سے غلط ہے۔

ناول "آہِ مظلوماں" میں زبیدہ اور سلطنت آرا دو نسوانی کردار ہیں جو مسلسل ظلم اور بے جا جبر کو برداشت کرتے ہیں اور اس برداشت کو وہ اپنی اخلاقی تربیت سے سہتی ہیں وہ جاہلوں کی طرح اپنا حوصلہ نہیں توڑتے بلکہ تمیز اور اخلاقی جرات سے ان تمام مصائب کا سامنا کرتے ہیں اور اس عمل میں مددگار ان کی اخلاقی تربیت بھی ہے۔ نذر سجاد نے ان کرداروں کے ذریعے ہندوستانی خواتین کی اخلاقی تربیت بھی کی ہے۔ خواتین کی اخلاقیات کے مطابق سلطنت آرا اپنے خاوند کی بے وفائی اور دھوکہ دہی کو اپنے بھائیوں سے چھپاتی ہے اور کہتی ہے:

> "میں نے بھی یہ سوچا تھا مگر جاؤں کس کے ساتھ۔ میں اپنے بھائیوں پر یہ معاملہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ اگر ظفر حسن یا کوئی بھائی پہنچانے گئے تو یہ بات کھل جائے گی اور میں اس خیال سے ابھی پوشیدگی چاہتی ہوں کہ نہ معلوم ابھی کیا بات ہے" (۸)

نذیر احمد کا بھی یہی مقصد تھا کہ عورتوں کی اصلاح کی جائے اور معاشرے میں ان کو اونچا مقام دیا جائے۔ راشد الخیری، اور شررؔ کے یہاں بھی نسوانی کرداروں پر بہت زور دیا گیا ہے۔ البتہ سرشار اس روش سے الگ ہٹ کر چلتے ہیں۔ رسواؔ کے ناولوں میں بھی عورت کو خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ رسواؔ کے ناول "امراؤ جان ادا" بھی ایک عورت کی کہانی ہے جو طوائف ہے عورت گھر کی چہار دیواریوں میں ہو یا آزاد۔ ہر جگہ آنے جانے تعلیم حاصل کرنے اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے لئے خود مختار ہو لیکن پھر بھی مرد کی محکوم ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح مرد کردار اس پر حاوی رہتا ہے۔ لیکن اگر عورت شریف اور تعلیم یافتہ ہے تو اکثر اسے گھٹ گھٹ کر مرنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس "زریں" کا کردار جو غیر اخلاقی اور پھوہڑ قسم کی خاتون ہے، عیاری سے ڈپٹی صاحب کو اکساتی ہے اور بہانہ کرتی ہے:

> "آپ کو کیا معلوم، گھر میں کیا کیا ہوا۔ جس وقت آپ اندر آتے ہیں وہ مجھ پر مہربان ہو جاتی ہے اور آپ کے پیچھے جس جس طرح مجھے جلایا اور ستایا جاتا ہے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ یہ چمپا اور گلاب بڑی آفت ہیں، بچھو کی طرح ڈنک مارتی ہیں"[(۹)]

اس ناول میں نذر سجاد نے اسی سے ملتا جلتا ایک اور قصہ بیان کر دیا ہے۔ ہدایت اللہ اسکی بیوی آبادی بیگم، بیٹا عظمت اللہ اور بد نصیب بہو زبیدہ کو دو بچوں کی ماں دکھایا ہے۔ وہ رات تک تو ساس اور سسر کی خدمت میں لگی رہتی ہے مگر مار اور گالیوں کے علاوہ اسکے نصیب میں کوئی خوشی نہیں ملتی، وہ اس حالت میں بھی صبر و شکر کا مجسم بنی رہتی ہے۔ اور کوئی حرف شکایت اپنی زبان پر نہیں لاتی۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ کچھ دنوں کے بعد ایک دن آبادی بیگم اپنے بیٹے کی دوسری شادی کر کے اور نئی بہو لے آتی ہے اور زبیدہ کو گھر سے باہر مویشیوں کے رہنے کی جگہ ایک کوٹھری دے دی جاتی ہے، لیکن جب ہدایت اللہ اور عظمت اللہ کی دوسری بیوی کی موت ہو جاتی ہے۔ عظمت اللہ جوڑوں کے درد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ماں بیٹے بھوکوں مرنے لگتے ہیں تو زبیدہ ڈرتی جھجکتی آئی اور اپنے سارے غم بھول کر ان دونوں کی خوب خدمت کرتی ہے۔ زبیدہ کے اس طرز عمل سے دونوں اپنے فعل پر نادم ہوتے ہیں اور اپنے کیے پر پچھتاتے ہیں۔ اور یہ سوچ کر کہ اس مصیبت میں وہ سہارا بنتی ہے اس لیے اسے سینے سے لگا لیا جاتا ہے۔ اس قصے کے آخر میں بھی بد تمیز اور جاہل بیگم "زریں" کی لوٹ مار اور دھوکہ دہی کا حال عظیم الدین کے اس خط سے معلوم ہوتا ہے جو وہ سلطنت آرا کو آگرہ لکھتا ہے:

"کل صبح کا ذکر ہے کہ جب سرکار بیدار ہوئے تو اپنا کمرا خالی پایا نہ بیوی تھی نہ کوئی ملازمہ۔ سرکار زور زور سے گھنٹی دیتے رہے اور کوئی نہ پہنچا۔ باہر میں متواتر گھنٹی کی آواز سن رہا تھا اور حیران تھا کہ کیا ہوا۔ سب سوتی ہوئی مر گیئں "(۱۰)

یہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ دونوں قصوں میں فرق کیا ہے۔ ایک قصہ دولت مند اور تعلیم یافتہ افراد سے منسوب ہے اور دوسرا غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ ناول ڈپٹی صاحب اور سلطنت آرا کے قصے پر مکمل ہو جاتا درمیان میں چچا ہدایت اللہ اور آبادی بیگم کے قصے کو لانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس ناول کی کردار نگاری کمزور ہے، ناول میں کوئی خاص حرکت اور کشش نظر نہیں آتی اور مرکزی کردار بھی توجہ کا مرکز نہیں بنتے۔ حالانکہ نہ ہمیں متاثر کرتے ہیں، غم والم میں گھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود قاری کے ذہن پر ان کا کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ سلطنت آرا کے کردار میں عمل کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ سلطنت آرا کی نسبت زبیدہ کا کردار جاندار ہے، گھر والوں کے برے برتاؤ کے باوجود حوصلے سے کام لیتی ہے مگر ہر طرح سے مشکلات کا سامنا صبر وسکون سے کرتی ہے۔ اپنا اور بچے کا محنت کر کے پیٹ پالتی ہے حالانکہ حالات سے گھبرا کر کبھی کبھی وہ نفرت کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔ پھر بھی سب کچھ وہ بھول کر محبت سے کام لیتی ہے اور اپنی ساس اور شوہر کا مختلف انداز سے دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتی، پھر بھی اس کی طرف سے ہمت، عزم اور جدوجہد کا سلسلہ جاری رہتا ہے، دوسرے قصے میں زبیدہ کا کردار صبر مجسم اور اخلاقیات کا پیکر بنا ہوا ہے:

"زبیدہ بہت سویرے اٹھ کر ادھر آتی تھی۔ صبح کے پانچ بجے تھے محمودہ اور صبغت اللہ کو سوتا چھوڑا، خود اٹھی اور نماز پڑھی اور بڑے گھر آئی۔ باورچی خانے میں جھاڑو دے کر آگ جلائی۔ سب کے منہ دھونے کو پانی گرم کیا، ساس نندوں کے دالان میں جھاڑو دے آئی"(۱۱)

زبیدہ اور سلطنت آرا بیگم کے کردار سے زیادہ زندہ اور متحرک ہیں۔ آبادی بیگم کے کردار میں دونوں عورتیں کسی ماورائی صفات کی مالک نہیں ہیں۔ یہ دونوں بالخصوص "زرین" اس چالبازی اور فراست کو اس طرح استعمال کرتی ہے کہ اس کا کرداروں سے زیادہ زندہ اور متحرک کردار. اس کے عزم اور عمل سے ہو سکتا تھا کہ اس کے کردار کے دیرپا اثرات منظر عام پر آتے مگر یہ بھی دیکھا جا چکا ہے کہ مصنفہ کو کہانی ختم کرنے کی جلدی ہوتی ہے، اس لیے اس ناول کو بھی جلد ختم کر دیا ہے۔ ناولوں میں ضمنی قصے ہوا کرتے ہیں۔

شرط ہوتی ہے کہ وہ ناول کے اصل قصے سے جڑے ہوئے ہوں اور اس قصے کو آگے بڑھانے کو پوری کہانی کو تیز رفتار بنانے اور ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لیے لائے جاتے ہیں۔ لیکن آہ مظلوماں میں جو ضمنی قصہ زبیدہ سے تعلق رکھتا ہے اسکا اصل قصے سے کوئی ربط نہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ اس سے قاری کا ذہن الجھ جاتا ہے اس قصے کے آخر میں جب زبیدہ کا سارا سسرال مصائب کا شکار ہوتا ہے تو زبیدہ ہی انسانیت اور اخلاقی حوالے سے ان کے کام آتی ہے:

> "آخر برے وقت میں کام آئی تو زبیدہ۔۔۔۔اب عظمت اللہ کی آنکھیں کھل گئیں او ر وہ اپنے کیے پر پچھتائے۔ زبیدہ کے بے انتہا قدردان اور تابعدار ہو گئے مگر اب تابعداری کس کام کی جب خود اسی کے محتاج ہو گئے ورنہ جب کسی حالت میں تھے تو دوسرے کو سکھ دیا۔ مصیبت پڑی تو زبیدہ یاد آئی۔ آہ یہ دنیا بری ہے"(۱۲)

حرماں نصیب:

"حرماں نصیب"(۱۹۳۸ء) کو نذر سجاد حیدر کا ایک کامیاب ناول کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس ناول میں نہ تو کرداروں کی بھرمار ہے اور نہ ہی کوئی ضمنی قصہ اس سے منسلک ہے سوائے اس کے کہ نسوانی کرداروں کو غم والم کا مجسمہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، انداز بیان ایسا ہے کہ آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ جیسے ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا میں آپ بیتی کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ نذیر احمد کے بعض ناولوں میں بھی یہ انداز جھلکتا ہے اسی طرح نذر سجاد حیدر نے "حرماں نصیب" کی ہیروئن "فیروزہ" کی آپ بیتی بیان کی ہے فیروزہ کی کہانی بڑی حد تک "نجمہ" سے مماثلت رکھتی ہے "نجمہ" کی کہانی ناکام محبت کی کہانی تھی اور فیروزہ کی بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناول نگار نے نجمہ کو ابدی نیند سلا کر اُسے دنیا کے تمام غموں سے چھٹکارا دلا دیا لیکن فیروزہ یہاں رہ کر، یہ صدمہ سہہ کر بھی زندہ ہے کہ اسکا محب کسی اور کا ہو چکا ہے۔ فیروزہ کے کردار میں ایک جاں نثار بین اور ایک وفا شعار عورت کی دو تصویریں ابھرتی ہیں۔ اس ناول میں نذر سجاد حیدر نے بڑی اچھی کردار نگاری کی ہے، فیروزہ کا کردار قاری کے ذہن پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ ظفر کے کردار میں کچھ الجھاؤ ضرور ہے وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عزم و حوصلے سے کام لینا نہیں جانتا۔ وہ ایک جذباتی نوجوان ہے جو جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے۔

بنیادی وجہ ہے کہ جب وہ فیروزہ کے ساتھ ایک نئے نوجوان کو دیکھتا ہے تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جب وہ بتاتی ہے کہ وہ کوئی غیر شخص نہیں بلکہ اسکا چچا تھا تو ظفر کو نہ صرف اپنے آپ پر غصہ آتا ہے بلکہ اسے صفدر سے بھی شکایت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اسحاق کے معاملے میں بھی وہ دھوکہ کھاتا ہے۔ اور اس

چھوٹی سی غلط فہمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام عمر فیروزہ کے لیے تڑپتا رہتا ہے اور اسکی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جو اسے کہیں چین سے رہنے نہیں دیتا، وہ اسی بھول کی وجہ سے اپنی ذات سے بھی نفرت کرنے لگتا ہے جبکہ فیروزہ بھائی کی موت اور محبوب کی دائمی جدائی کے داغ کو سینے میں چھپائے ہوئے بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ زندگی گزارتی ہے۔ ظفر کے مقابلے میں فیروزہ کا کردار زیادہ متحرک اور جاندار ہے۔ ناول میں کہیں بھی کوئی تصادم کی فضا پیدا نہیں ہوئی کیونکہ سیدھا سادا قصہ ہے اور اکہرے پلاٹ کے قصے پر اسکی تعمیر کی گئی ہے۔ اس لیے ایک سپاٹ پن کا احساس ہوتا ہے۔ کسی بھی کردار میں زندگی کی تڑپ اور حرکت نظر نہیں آتی، ہر کردار بجھا بجھا سا نظر آتا ہے۔ صحیح ہے کہ اس ناول کا قصہ نذر سجاد حیدر کے مذکورہ بالا ناولوں سے مختلف ہے اس میں فنی خامیاں بھی زیادہ نظر نہیں آئیں۔ اس لیے یہ مختصر سا ناول کچھ دیر کے لئے پڑھنے والے کو متاثر ضرور کر دیتا ہے اور یہی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

حرماں نصیب "ناکام محبت فیروزہ کا افسانہ غم ہے۔ یہ ناول نذر سجاد حیدر کے سیارے ناولوں میں سے زیادہ دلچسپ اور زور دار ہے۔ کہانی کو بڑی مہارت سے گوندھا گیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ۲ پلاٹ درج ہونے کے باوجود اپنے اندر کوئی جھول نہیں رکھتا اسے مختصرا بیان کیا جاتا ہے۔ فیروزہ کے دادا نے جلیان سے بغرض تجارت بمبئی میں آکر ایک ایرانی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ وہ خود تو ہندوستان ہی میں مقیم رہے البتہ فیروزہ کے والدین جاپان چلے گئے۔ یہ لوگ کروڑ پتی میلے تھے۔ ایک مرتبہ دادا اپنی پوتی فیروزہ اور اپنے ہوتے فیروز کے ساتھ گرمیوں کا موسم گزارنے مسوری گئے۔ وہاں ڈیرہ دون کے ایک رئیس زادے ظفر سے فیروزہ کی محبت کا آغاز ہوا۔ پھر فیروزہ اور اس کا اکلوتا بھائی مسوری میں ہی پڑھنے لگے۔ دادا نے انہیں ایک کو ٹھی خرید دی فیروزہ سکول سے کالج میں پہنچی اور ظلفر پانچ سال کے لئے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ولایت چلا گیا۔ پھر اچانک بیمار ہو کر فیروز خدا کو پیارا ہو گیا۔ بہن جو اسے بے انتہا چاہتی تھی اس کے صدمے سے نڈھال ہو گئی۔ بے چارے دادا بھی شدت غم سے مر گئے۔ جب ظفر ولایت سے واپس آیا تو اس نے ایک خانقاہ کے پاس کسی جھونپڑی میں فیروزہ کو دیکھا جو بھائی کے سوگ میں تارک الدنیا ہو چکی تھی۔ اس کی مایوسی کی یہ انتہا تھی کہ ایک مرتبہ اگر ظفر مین موقع پر نہ پہنچ جاتا تو وہ انگوٹی کا نگ نکل کر خودکشی کر چکی ہوتی۔ اب اس کے والدین جیلان چھوڑ کر بھیتی آ چکے تھے۔ اور وہ اسے وہاں بلا رہے تھے لیکن وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔ ظفر کی شادی کی درخواست بھی اس نے رد کر دی۔ اگلے روز ظفر اور اس کے بھائی مقدر نے اس جھونپڑی میں ایک اور مرد کو دیکھا جو فیروزہ سے بڑا بے کلف تھا۔ صفدر نے شبہ ظاہر کیا کہ فیروزہ بے وفا ہے اس لئے اسے

بھول جانا چاہیے۔ دوسرے ہی دن فیروزہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ مایوس و نامراد ظفر نے والدین کے اصرار پر شادی کر لی۔

چند برس بعد جب اس کے دو بچے تھے اور اپنے خاندان کے ہمراہ مسوری میں قیام پذیر تھا تو اس کی فیروزہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی جو اپنے بھائی کی قبر پر تلاوت کر رہی تھی۔ مسوری ہی میں وہ مسٹر اسحاق ڈپٹی کمشنر سے بھی ملا جو فیروزہ سے شادی کا متمنی تھا۔ فیروزہ نے ظفر کو بتایا کہ اس کے ماں باپ اگرچہ اسحاق کو ہاں کہہ چکے ہیں مگر وہ آج بھی صرف دو ہستیوں سے پیار کرتی ہے۔ ایک اس کا پیارا دوست ظفر جو اب شادی شدہ ہے اور کسی دوسری عورت کی امانت ہے۔ دوسرا اس کا پیارا بھائی نیروز جو مر چکا ہے۔ اسحاق سے جان چھڑانے کے لئے وہ باہر سے ڈاکٹری کرنے کے بہانے امریکہ چلی گئی تھی۔ اب پانچ سال بعد واپس آئی ہے اور سیدھے سوری پہنچی ہے۔ اسحاق کو اس نے صاف صاف جواب دے دیا ہے اور اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ بھائی کی آخری آرام گاہ کے قریب ایک ہسپتال تعمیر کر کے غریبوں کا مفت علاج کرے گی تا کہ فیروز کی روح کو ثواب پہنچے۔ ظفر کو انسی ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ چند برس پیشتر فیروزہ کی کوٹھڑی میں نظر آنے والا مرد اس کا سکا پنچا تھا جو اسے بیٹی سے لینے وہاں پہنچا تھا۔ ظفر کا دل پچھتاوے اور بیوی بچوں کی زنجیروں کے بوجھ سے ناپ اٹھا۔ مگر فیروزہ نے اس سے کہا کہ ان دونوں کی قسمت میں یہی لکھا تھا اس لئے اب انہیں حوصلے سے اپنی اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔ حرماں نصیب" کا انجام بڑا حقیقت پسندانہ، تشبیہات دلفریب اور اسلوب تحریر جاذب نظر ہے۔ منظر نگاری میں تو مصنفہ کو کمال حاصل ہے۔ وہ ذہانت اور قوت مشاہدہ سے ہر منظر کی خوبصورت مصوری کرتی ہیں۔ کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ان کی حسین رفیق عمر جن کو اس وقت خوش رنگ تیریاں کہا جائے تو بجا ہے، بجر نگی یعنی کاسنی آبی گلابی عنابی دھانی ہلکے رنگ کی باریک سازیاں اپنے عجیب ناز سے بیٹھی تھیں۔"(۱۳)

مسوری کا یہ موسم نہایت خوشگوار اور پر فضا ہے۔ چونکہ ابھی برسات میں کچھ عرصہ باقی ہے اس لئے موسم بہار کے رنگ برنگ کے خوشنما پھول اپنی پوری شادابی پر ہیں، اور ان کے مختلف رنگوں کے ملتے عجیب بہار دکھاتے ہیں۔ اس وقت اس کمرے کا منظر نہایت دلفریب تھا۔ چاروں طرف کی کھڑکیاں اور دروازے کھلے تھے جن میں سے پھولوں کی خوشبو ہلکی ہلکی روشنی اور تازہ ہوا کے جھونکے داخل ہو کر روح کی فرحت و انبساط کا باعث ہو رہے تھے۔ کمرے کے اندر خوبصورت گلدان اور گملوں کے پھول پتے باہر کی ہوا کے سرد

جھونکوں سے مست ہو کر جھوم رہے تھے اور دونوں خوبصورت نوجوان بادامی ریشمی سوٹ پہنے سروں سے نو یہاں اتارے بے تکلف بیٹھے تھے۔ نذر سجاد حیدر نے "حرماں نصیب" میں جیتے جاگتے زندگی کی لگن سے بے کردار پیش کئے ہیں اور ان کے احساسات کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ پورا ناول گو بذبات کا ایک بہتا ہوا دھارا ہے۔ اس حوالے سے اس علا ظلم خیز جذباتی منظر کو دیکھیے جس میں ظفر اور فیروزہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں۔ ظفر کچھ نہ بولا۔ فیروزہ نے خود اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ پھر آنکھوں سے لگائے اور وہ سوار ہو کر رخصت ہوا۔ دونوں کے سی نے وفور رنج و غم سے پھٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے سامنے دونوں ضبط کئے رہے۔ کمر رکشہ کا بڑھنا تھا کہ خون دل ظفر کی آنکھوں میں امنڈ آیا۔ ادھر فیروزہ گھر جا کر ایک صوفے پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رولی۔

راشد الخیری کے ناول میں خواتین کی اخلاقی تربیت کے پہلو:

شام زندگی

"صبح زندگی" کی طرح "شام زندگی" (۱۹۱۸ء) بھی ایک اصلاحی ناول ہے۔ یعنی یہ ایک دوسرا زاویہ ہے جو آپ "صبح زندگی میں دیکھ چکے ہیں۔ یوں کہیے کہ جس حیات کی سحر صبح زندگی میں ہوئی تھی اس کی شاماب شام شام زندگی میں نظر آ رہی ہے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ "صبح زندگی" میں نسیمہ کے کنوارپنے کا عہد تھا اس میں صاف بتایا جاتا ہے کہ خاتون کو عہد طفلی سے بڑھاپے تک مائی کے اور سسرال میں بیٹی،، ماں، بہن اور بیوی ہونے کی نسبت سے جتنی منازل طے کرنی پڑتی ہیں، وہ سب کی سب بولتی اور جیتی جاگتی تصویر میں ناظرین کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اگر خاتون کی زندگی کے کسی جزو کی تکمیل میں کوتاہی رہ جاتی ہے تو وہ شام زندگی میں تکمیل پاتی ہے۔ ناول "شام زندگی" کا آغاز ناول کی ہیروئن نسیمہ اور قسیم کی شادی خانہ آبادی سے ہوتا ہے، مائی کے سے وداع ہونے کے بعد نسیمہ اپنی سسرال آتی ہے، سسرال اس کے لیے بالکل اجنبی جگہ ثابت ہوتی ہے۔ فقط اجنبیت یا اوپری جگہ کے اعتبار ہی سے نسیمہ کی سسرال نسیمہ کے لیے غریب الدیار نہیں ہوتی بلکہ ساس نندوں کے اعتقاد کا ضعف بھی اس کے لیے ایک سدِ راہ بن کر آ سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ساس کی تو تکرار، ڈانٹ اور پھٹکار نندوں کی تاخ تڑاخ، بھاوج کے طنز کی کاٹ وغیرہ۔ بقولِ مصنف:

> "نسیمہ نماز کی ایسی پابند کہ موقع ملے تو تہجد اور اشراق تک نہ چھوڑے قسیم اس نام سے ایسا بے زار کہ بس چلے تو عید و بقر عید کی بھی اڑا جائے "(۱۴)

مگر نسیمہ ایسے خاندان اور ایسے ماحول سے آئی تھی جہاں اس کو محبت اور اخلاق کا پہلا پاٹ پڑھایا گیا تھا، اپنی اسی اعلی ظرفی کے باعث وہ سسرال پر جلد ہی قابض ہونے میں کامران ہو جاتی ہے۔ مگر یہ کامیابی زیادہ مضبوط ثابت نہیں ہوتی، اسے اپنے شوہر کے خصائل اور مزاج میں تغیر کر کے ہی اصل کامیابی حاصل ہو سکتی تھی۔ قسیم اور نسیمہ کے مزاج میں بڑا امتیاز تھا، نسیمہ صوم و صلوۃ کی پابند، جب کہ قسیم اس کے الٹ، نسیمہ قرآن و حدیث پر جان چھڑکنے والی خاتون، خدا کے خوف سے لرزنے والی عورت، جبکہ قسیم رازق الخیری رقم طراز ہیں:

"انھوں نے اپنی تصانیف "صبح زندگی "شام زندگی" اور " شب زندگی میں تعدد نسوانی کی مکمل مرقع کشی کی ہے اور ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ شوہر اور بیوی کے تعلقات اچھے ہیں تو گھر جنت ہے۔ اور اگر تعلقات برے ہیں تو گھر جہنم ہے۔ عورت کو نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر و تخریب کا اختیار ہے بلکہ اس کے قابو میں اس کے شوہر اور اس کے بچوں کی زندگی بھی ہے یعنی عورت چاہے تو مرد کی زندگی قابل رشک بن سکتی ہے۔" (۱۵)

زبان و بیان کے لحاظ سے علامہ کا یہ ایک مکمل ناول ہے۔ انھوں نے دلی کی عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر ایسے فقروں سے کام لیا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گھریلو زندگی میں پیش آتے ہیں خلا قسیم کا نسیمہ سے پلول چلنے کی لیے کہنا۔ اور پھر نسیمہ کا منع کرنا اور اعتراف کرنا، نسیمہ کے اس جواب میں قسیم کی ماں کے لیے عزت بھی ہے اور احترام بھی۔ مصنف نے اسے فقروں کو خاص نسوانی اندازم میں پیش کیا ہے:

"مجھے چلنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے مگر اماں جان سے پہلے صلاح کرا وا گر وہ بھی تشریف لے چلیں تو بہت اچھا ہے قسیم کی اناکافی پر نسیمہ مزید اپنے فیصلے کو آگے بڑھاتی ہے۔ فقط ذکر سے تو کام نہ چلے گا پہلی مرتبہ کا چلنا ہے ان کی بلا اجازت ٹھیک نہیں اس مرحلے کو تو تم ہی طے کرو گے۔"(۱۶)

راشد الخیری نے سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنا کر جس خوب صورت انداز سے پیش کیا ہے اس سے ان کے عمیق مطالعہ اور دور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزوں کی کوری تقلید سے ہمارا معاشرہ کس قدر برباد ہو چکا ہے اس کی اصلاح کی کیا اور کیونکر تدبیریں ممکن ہو سکتی ہیں۔ اس کی سعی کی اپنے انکشافات

سے سماج کی رسموں پر بھی روشنی ڈالی جن سے سماج میں خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں مثلاً رابعہ کی شادی اسکی واضح مثال ہے اس موقع پر اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ ایک عقل مند ہو اپنے فرائض کو کسی خوبی سے انجام دیتی ہے۔

بہت جتن کے بعد رابعہ کی شادی ایسے شخص سے طے ہوئی۔ اور جس لڑکی کے ساتھ دس ہزار کی جائداد اور دریا باد کا آدھا موضع۔ اور ایک کے بدلے چار زیور ہوں اس کے خواستگار ایسے صاحب زادے ہوئے۔ عمر کے ادھیڑ صورت کے حبشی مزاج کے خاصے سو روپے کے نوکر تین بچوں کے باپ لنگڑے رنڈوے پردیسی رابعہ کے شوہر کی اس حقیقت سے بھی ناول نگار کو کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ وہ اس کو رابعہ کے لیے سنہرا موقع ہی تصور کرتا ہے کیوں کہ رابعہ شادی کے بعد اپنی زندگی کو عیش و عشرت سے گزارتی ہے۔ شام زندگی کا پلاٹ خانگی زندگی کے ڈھانچے پر بنا گیا نہایت دلچسپ پلاٹ ہے۔ جو عورت کی زندگی کو ہر زاویہ سے اجاگر کر کے اس کی خامیاں اور خوبیاں ظاہر کرتا ہے لیکن مصنف صرف خامیاں یا خوبیاں ظاہر کرنے ہی میں فخر نہیں محسوس کرتا۔ بلکہ مصلحانہ تدبیریں کر کے ان کا مداوہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شوہر اور بیوی کے ازدواجی تعلقات کے متعلق علی عباس حسینی راشد الخیری کے ناولوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "یہی بات ہے کہ ازدواجی زندگی میں واقع ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے اخذ کیے گئے، اس قصے کے پلاٹ کی ترتیب نہایت دلکش اور مترتب ہے اور قاری کو اصلی کا دھوکہ ہوتا ہے، اس قصے میں پلاٹ کے علاوہ واقعات اصل اور فطری لگتے ہیں۔"(١٧)

یہ فطرتِ انسانی ہے کہ اس کی ہمدردی اور توجہ مظلوم کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے۔ راشد الخیری نے اپنے کرداروں کو اکثر اوقات مظلوم بنا کر پیش کیا نسیمہ بھی اس مظلومیت سے مبرہ نہ رہ سکی۔ اس کے سسرال میں اس کے ساتھ جس طرح کا سلوک کیا گیا وہ کسی ذہنی تشدد سے کم نہیں، ساس نندوں اور جٹھانی کی تلخیاں اس کے دل پر جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ گراں گزرتی ہیں۔ مرکزی کردار "نسیمہ" اول تا آخر تک قاری کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے، قاری خود نسیمہ کی تقریروں میں اتنا الجھ کر رہ جاتا ہے کہ اسے دوسری طرف رخ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ "صبح زندگی" میں نسیمہ کے مقابل منجھلی کا کردار اپنی چمک دمک کے ساتھ نظر پڑتا ہے۔ ناول "شام زندگی" میں نسیمہ کی جٹھانی اس کے سامنے متضاد حیثیت سے نمایاں

ہوتی ہے۔ ناول کے آغاز ہی میں "ساجد" کا واقعہ پیش آتا ہے جسے نسیمہ کی جٹھانی اس قدر زدوکوب کرتی ہے کہ اس پر قافیہ تنگ ہو جاتا ہے۔ مگر ساجد کا یہ واقعہ نسیمہ کو ساس نندوں کے قریب ضرور لے آتا ہے، بصورت دیگر اس واقعہ سے قبل "نسیمہ کی سسرال میں آمد" زیادہ معنی خیز نہ ہوتی ہے بلکہ نسیمہ کو ساس نندوں کی تلخیوں کا سامنا ہی کرنا پڑتا ہے۔۔۔ بقولِ مصنف:۔

"ساس بہو کے تعلقات ایک نسیمہ ہی کے ساتھ کیا تمام دنیا میں مصیبت ہیں قسیم کی ماں لاکھ پڑھی لکھی اور ہزار بزرگوں کی ملنے والی تھی مگر اس آگ سے وہ بھی محفوظ نہ رہ سکی"(۱۸)

"مصورِ غم" راشد الخیری کے دوسرے ناولوں کی صورت اس میں بھی کوئی واقعہ اصلاح النسا سے عاری نہیں ہے۔ راشد الخیری نے انگلیوں پر گن کر وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جن سے ایک لڑکی شادی ہونے کے بعد دوچار ہو سکتی ہے۔ راشد الخیری نے صرف حیاتِ نسواں میں پیش آنے والے مصائب و مسائل ہی نہیں بیان کیے بلکہ ان کا معقول حل بھی پیش کیا ہے۔ نسیمہ راشد الخیری کا آئیڈیل کردار ہے اور وہ ہر ایک کو ایسا ہی بننے کی دعوت دیتے ہیں، اس کے لیے راہ سے پتھر ہٹاتے ہیں اپنے مقصد کو مکمل کرنے کے لیے وہ ناول میں خوابوں اور چھوٹے چھوٹے قصوں کا بھی آسرا لیتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کو مکمل کسی وعظ یا کسی بزرگ کے نصائح آمیز خط کے ذریعہ سے کر لیتے ہیں۔

راشد الخیری قاری کی اس نبض سے آگاہ تھے کہ قاری کو آلام میں مبتلا کر کے ہی وہ اپنے مقصد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہر ناول میں چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعہ رنگین فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں اس انشا پرداز کے قلم پر جس نے یوں گدگدا گدگدا کر رلایا اور رلا ڈلا کر گرگدایا۔ کتنے بگڑے ہوئے گھر انھیں تحریروں سے سدھرے ہوں کے اور ظلمت کدوں میں انسانیت اور خدا ترسی کی شعاعیں انھیں روز نو سے پہنچی ہونگی اور افسانہ نویسی کے اجر بے حساب اور مردے بے اندازہ کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔"(۱۹)

اگر قاری نے مطالعہ کی روانی سے اپنی توجہ منتشر کرنے کی کوشش بھی کی تو کوئی واقعہ ایسا پیش آیا کہ خود قاری اس میں الجھ گیا اور اس کی تفہیم کے لیے اسے نسیمہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ نسیمہ کی معاملہ فہمی

اور زیر کی پر قاری کو بھی شک نہیں ہوتا۔ قسیم کا متنفر ہو جانا بھی نہایت تکلیف کا سبب تھا پھر ساجد کی مرگِ ناگہاں کا واقع ہونا جس کو نسیمہ نے فطرت انسانی کا تقاضا جان کر پیار کیا۔ اس سے بھی بڑھ کر نسیمہ کے اپنے صاحبزادہ کی موت واقع ہو جانا ایسا سانحہ نہ تھا جسے نسیمہ آرام سے بھلا پاتی۔ راشد الخیری کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں اپنے آپ کو مدغم کر دیا تھا اگر نسیمہ کی طبیعت رنجیدہ ہوتی تو ان کی تحریر بھی آنسو بہاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے اشخاص قصہ فطرت انسانی کے خاص مرقع ہیں اور یہ ان کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اپنے ناولوں میں جا بجا طرز معاشرت کا نقشہ صداقت کے ساتھ کھینچا ہے جن میں ہر قسم کے کیرکٹر نشو و نما پاتے ہیں نسیمہ اور قسیم کے خیالات میں بعد المشرقین تھا۔ نسیمہ ناتجربہ کار کم عمر بھولی سیدھی ہے اور پہلو میں ایسا دل جس میں ہمدردی کا دریا ہر وقت لہریں لے رہا ہے۔ قسیم خود بھی پڑھا لکھا آدمی ہے لیکن موجودہ زمانے کی غلط تعلیم نے اس پر کافی اثر ڈالا ہے۔۔۔ بقول احرار نقوی:

> "نسیمہ پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ لڑکی ہے اس سے وہ اپنے فرائض سے بھی کماحقہ واقف تھی۔ اور جانتی تھی کہ بیبیوں کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ شوہر کو اپنا ہم خیال کریں یا خود اس کی ہم خیال ہو جائیں۔ سوسائٹی کا وہ نقشہ بھی کس قدر صاف اور واضح پیش کیا ہے، جہاں ساس بہو کے تعلقات ایک نسیمہ ہی کے ساتھ کیا دنیا میں مصیبت ہیں۔"[۲۰]

نسیمہ ناول کا مثالی کردار ہے اور اپنی نقل و حرکت سے دوسروں کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ نسیمہ کے علاوہ ناول میں دوسرے کردار بھی اپنا پارٹ ادا کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں لیکن قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔ مصنف ہی نے قسیم کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ ورنہ بیٹے کے سانحہ ارتحال ایسا نہ تھا کہ ایک مشفق باپ اس کو یوں ہی فراموش کر جائے، باپ میں خواہ ہزار خامیاں ہوں، دراصل قسیم کی قوتِ فیصلہ کمزور ہے۔ وہ انگریزی نقالی میں اپنے ہوش و حواس زائل کر چکا ہے اس لیے صرف مصنف کے اشارے کا منتظر رہتا ہے؛ اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ بچے کی موت اس کے اندر جو تبدیلی نہ پیدا کر سکی لیکن پھپھو سنجیدہ کا ایک خط وہ کام کر دیتا ہے وہ پھر سے اپنے بیوی بچوں کا گرویدہ بن جاتا ہے۔ "شام زندگی" میں مرکزی کردار قسیم کے علاوہ اور بھی بہت سے کردار ایسے ہیں جن کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ صرف مصنف کی مرضی کے پابند ہیں۔ ان تمام کرداروں میں نہ تو صلاحیت ہے کہ وہ اپنے ذہن و دماغ سے کچھ سوچ سکیں اور نہ ہی یہ جذبہ کہ ناول نگار کے خیالات سے بغاوت کر سکیں۔ وہ ناول نگار کی

مرضی کے اس قدر پابند نظر آتے ہیں کہ اس کی مرضی سے اٹھتے بیٹھتے اور نقل و حرکت کرتے ہیں۔ یہ مصنف کا شیوہ انداز ہے کہ اگر کسی کردار نے باغی ہو کر اپنی راہیں خود سے اختیار کرنے کی کوشش کی بھی تو مصنف نے ایک لمباچوڑا وعظ کہہ کر اسے رام راست اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ تقسیم اس کی سب سے اچھی مثال ہے کہ معصوم بچے کی وفات اس کے قدم واپس نہ لاسکے لیکن پھوپھو کا ایک خط اسے نیمہ کے قدموں پر لوٹنے کی لیے مجبور کر دیتا ہے یہ اتفاق بھی خوب ہوتا ہے کہ خط پھوپھو نے نسیمہ کو لکھا تھا اور ڈاک پہنچی تقسیم کے ہاتھوں میں ملاحظہ فرمائے:۔

"میں نے میاں تقسیم کے حال بھی سناوہ ماشاء اللہ سمجھ دار آدمی ہیں جو مناسب سمجھا وہ کر رہے ہیں۔ تم کیوں رنجیدہ ہوتی ہو ان کو اس فانی دنیا سے خوش "(۲۱)

ناول "شامِ زندگی" مولانا راشد الخیری کی شخصیت کا عکاس ہے۔ انھوں نے غم نگاری کو اپنا وصفِ خاص بنایا اور اس خوبی کو معراج تک پہنچایا۔ غم کی نوعیت جس کا تذکرہ ناول میں جابجا ملتا ہے اگر ناول سے وہ تمام واقعات اور تفصیلات حذف کر دی جائیں تو ناول میں ایسا کچھ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ علامہ کی عظمت کا اعتراف کم و بیش ادب کے ہر طالب علم کے دل میں موجزن ہے یہ علامہ راشد الخیری ہی کی خوبی ہے کہ انھوں نے تمام متفرق واقعات کو یکجا کر کے شام زندگی کا بہترین اسٹر کچر تیار کیا۔ ناول "شام زندگی" جس شکوہ سے صفحہء قرطاس پر رقم کیا گیا تھا اس سے کہیں زیادہ مشہور بھی ہوا۔

ناول "شام زندگی" میں جو غم کی تلخی کو اخلاق اور محبت کی مٹھاس سے رفع کرنے کا بیان ملتا ہے وہ اپنے آپ میں بے نظیر ہے۔ اسی ناول نے مصنف کو "مصورِ غم" کا خطاب دلایا۔ ناول کے آغاز ہی میں جٹھانی کا ظلم اور ساجد کی مظلومی قاری کو اپنے دام میں لے لیتی ہے ناول کی غم انگیزی کے متعلق اخبار "مشرق" میں کچھ یوں تعریف کی گئی:

"شام زندگی درد و غم کی داستان ہے مگر صنف نازک کی تربیت و تعلیم میں ایک بڑی معلمہ کا کام کرتی ہے۔ جن عورتوں کو نالائق یا گمراہ شوہروں سے سابقہ پڑ جائے اگر وہ اس کتاب کو پڑھیں اور اس پر عمل کریں تو ان کے خاندان سنبھل جائیں گے۔ اور ان کا گھر بربادی سے بچ جائے گا قصہ دلچسپ اور بیان پر لطف ہے۔ بیان میں روانی اور داستان میں طغیانی ایسی ہے کہ ہم کو دیر تک اس قصہ نے اشکبار کیا"(۲۲)

"شام زندگی" ان کا وہ شاہکار ناول ہے جس سے مولانا کو "مصورِ غم" کا لقب ملا۔ اس لیے ناول میں غم کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ مگر یہ غم صرف رونے دھونے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا حقیقی ترجمان نظر آتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر کون سا ایسا پتھر دل انسان ہو گا جس کے قلب میں بیٹی کے لیے جذبات نہ ابھرے اور وہ ان جذبات میں بہہ کر آنسو نہ بہائے یا اس سے قبل قسیم کی موت پر نسیمہ کی حالت زار دیکھ کر کون سنگ دل ہو گا جس کا دل نہ پسیجے گا۔ ساجد جو کہ چچی سے اس قدر مار کھاتا ہے کہ اس کی موت واقع ہوتی ہے۔ کون سا ایسا ظالم انسان ہو گا جو کہ ساجد کی موت سے قبل اس کی حالت مظلومی پر رحم نہ کھائے ملاحظہ فرمائیے:

> سنگدل چچی کی تصویر معصوم آنکھیں بھولی نہ تھیں۔ سہم گیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ چچی جان میں نے نہیں مارا۔ ایک تیر تھا جو نسیمہ کے کلیجے میں گھسا یتیم کی بے گناہی پر تڑپ اٹھی منہ پر منہ رکھا اور کلیجے سے لگا کر کہا، رو نہیں نہ ہی لو آنکھیں کھولو اور دودھ پیو"(۲۳)

اس کے آگے کی تحریر اور درد انگیز آتی ہے سخت سے سخت دل انسان کو بھی مطالعہ سے قبل اپنے دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے۔ ساس بہو ایک ایسی عورت کے لال پر رو رہی تھیں جس کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں۔ کہ بچہ گھبرا کر اٹھا، بیٹا چاروں طرف دیکھا اور تیسری دفعہ اپنی بے گناہی کا اظہار کیا۔ ناول کا دوسرا کردار جو قدرے اہم ہے؛ نسیمہ کا شوہر ہے۔ جو نسیمہ کے ساتھ ساتھ مکمل ناول میں بے معنی سی گردش کرتا ہے؛ "قسیم" ہے۔ جس کی اداکاری کافی بے معنی سی ہی معلوم ہوتی ہے۔ قسیم بھی نسلِ انسان ہی سے ہے اور اپنی طرف توجہ کا متمنی۔ شاید اسی لیے اس نے فرض شناسی اور ایمانداری کو خیرباد کہہ کر مغربی تہذیب و تمدن کا راستہ اختیار کیا۔ زندگی کی بوقلمونیوں سے متلذذ ہونے کے لیے کلب اور تماشے کا آسرا لیا۔ اس کے اس شوق نے اس قدر شدت اختیار کی کہ اس کو اپنے گھر سے نفرت بیوی بچوں سے نفرت اپنے تمام فرائض سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یہ نفرت اتنی شدت پکڑتی ہے کہ اس کو اپنے معصوم بچے پر بھی رحم نہ آتا ہے۔ اس کو شدید بخار میں مبتلا چھوڑ کر وہ اپنا شوق پورا کرنے کے لیے کلب کی راہ پکڑتا ہے۔

یہاں مصنف نے دو اہم پہلو نمایاں کیے ہیں، ایک تو یہ کہ مغرب کی کورانہ تقلید عوام کو کس قدر گمراہ کر سکتی ہے، دوسرا یہ کہ قاری کے دل پر مصنف اپنے مقصد کی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہو جائے۔ مصنف اپنے دونوں مقاصد میں یہاں پر کامیاب نظر آتا ہے قسیم جیسا باپ جو اپنے بچوں کو ٹوٹ کر چاہتا ہے وہ مغرب نوازی میں اس قدر مبتلا ہوتا ہے کہ بیمار بچہ دم توڑ دیتا ہے اور اسے پروا نہیں ہوتی۔ قسیم اپنے زمانے کے ان

مردوں کی ترجمانی کرتا ہے جنھوں نے مغرب کی اندھی پیروی میں اپناسب کچھ برباد کر لیا لیکن پھر بھی ان کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ قسیم کی اس حرکت سے کم ظرفی اور غیر دانش مندی ظاہر ہوتی ہے۔

مرزا محمد سعید کے ناول میں خواتین کی اخلاقی تربیت کے پہلو:

خوابِ ہستی

مرزا محمد سعید (۱۸۸۶-۱۹۶۲ء) ناول نگاروں کی کامیابی ان کی کردار نویسی ہے اور وہ اس صف میں اس وجہ سے نمایاں ہیں کہ انہوں نے مرزاہادی رسوا (امراؤ جان ادا) کے بعد پہلی بار کرداروں کی تحلیل نفسی (Psycho Analysis) کو بنیاد بنا کر اپنے کرداروں کی نفسیاتی پیش کش کی طرف خاص توجہ دی ہے اور یہی ان کی کامیاب ناول نگاری کی ضمانت ہے۔ مرزا محمد سعید کے دو اہم ناول ہیں (۱) خواب ہستی (۱۹۰۵ء) اور (۲) یاسمین (۱۹۳۵ء)۔ "اکثر ناول نویس قصہ کی دلچسپی بڑھانے کی غرض سے لوح پر یا تمہید میں یہ لکھ دیتے ہیں۔ کہ ایک اصلی واقعہ کی بنا پر لکھا گیا ہے" ہم ایسی صداقت کا سر گز دھوئے نہیں کرتے۔ کیونکہ ہو وہ قیاسات و شبہات کا محرک بننا منظور نہیں۔ لیکن یہ ضرور دعوے کرتے ہیں۔ کہ اس کے ہر ایک فقرے میں واقعیت کی جھلک نظر آتی ہے، بہت سے فقرات و خیالات اپنے نوجوان دوستوں کی تحریر و تقریر سے مجنہ نقل کئے گئے ہیں۔ خواب ہستی مرزا محمد سعید کا پہلا ناول ہے۔ یہ ایک اصلاحی ناول ہے۔ مرزا محمد سعید اپنے ناول "خوابِ ہستی" کے آغاز یہ میں رقم طراز ہیں:

> " ہمیں جس فقرے کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے۔ وہ ہم نے ایک نہایت عزیز دوست کے خط سے نقل کیا ہے، یہ صاحب نہایت متین و سنجیدہ نوجوان ہیں۔ اور انہوں نے نہ صرف زمانہ طالب علمی نہایت نیک نامی سے بسر کیا ہے۔ بلکہ اس وقت بھی بحیثیت ایک ممتاز سرکاری عہدہ دار اور ہونہار اہل الرائے ہونے کے اس قابل ہیں۔ کہ قوم کے دیگر نوجوانوں کے لئے نمونہ ہوں۔ لہذا ان کی رائے ناظرین کی خاص توجہ کی مستحق ہے" [۲۴]

ناول کا ہیرو عثمان ہے جو ایک تعلیم یافتہ، قابل، ذہین مگر سادگی پسند نوجوان ہے۔ حسن افروز کے دلسوز حسن کو دیکھ کر وہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس دوران وہ دوسری عورت شمیم کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے لیکن شمیم ہر جائی ہے۔ وہ عثمان کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور عثمان دوبارہ حسن افروز کے حسن میں پناہ لیتا ہے۔ خاندانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود وہ حسن افروز سے شادی کر لیتا

ہے لیکن حسن افروز (جو بنیادی طور پر ایک طوائف ہے) کو عزت کی زندگی راس نہیں آتی ہے وہ بیمار ہو جاتی ہے۔ یہ بیماری جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ حسن افروز کی موت کا صدمہ عثمان برداشت نہیں کر پاتا ہے اور ذہنی توازن کے ساتھ ساتھ اپنی صحت بھی کھو بیٹھتا ہے لیکن اس کا دوست ایڈرین اس کی طرف بھرپور توجہ دیتا ہے اور عثمان کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔ صحت یاب ہو کر وہ عشق حقیقی میں غرق ہو کر لازوال دولت سے مالامال ہو جاتا ہے۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں:

> "جن خصوصیات کی حامل حسن افروز کو ہونا تھا وہ تمام ٹیم میں پائی جاتی ہیں۔ حسن افروز اگرچہ ایک طوائف ہے لیکن شرافت اس کے کردار کی ایک خاص خصوصیت ہے۔ شمیم طوائف نہیں ہے لیکن عام طوائفوں کی عیاری اور مکاری اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔"(۲۵)

ان دونوں کے کرداروں کا تقابل اس طرح کیا جا سکتا ہے۔ زنانے کرداروں میں شمیم اور حسن افروز دو متضاد طبیعتیں ہیں۔ ایک اگر بس بھری ناگن ہے تو دوسری درد سر رفع کرنے والی شاخ صندل، شمیم عثمان کی خود داری کو مفتوح بنانا چاہتی ہے۔ حسن افروز اسے دیوتا سمجھ کر اس کے چرنوں پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھاتی ہے۔ دونوں ایک ہی طرح کے گندے معدن سے نکلتی ہیں لیکن ایک کے وہ اطوار ہیں جو پیشہ ور عورتوں کا مارکہ ہیں۔ دوسری کی وہ سیرت ہے جس کی اچھے اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیاں تمنا کرتی ہیں۔ شمیم، بدر (خواب ہستی کا کردار) کا نسوانی کردار ہے۔ جفا کیش، خود پسند اور متکبر حسن افروز، ایڈرین (عثمان کا دوست) کا نسوانی رخ ہے۔ وفا پرست، اخلاص پسند، ایثار کا مجسمہ۔ کردار دونوں مثالی ہیں لیکن زندگی کی دھوپ چھاؤں اکثر ایسے ہی تانوں بانوں سے بنی ہوتی ہے۔ حسن افروز کو ناول میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ طوائف ہونے کے باجود فطرتاً نیک سیرت اور معصوم عورت ہے۔ اس کی معصومیت پر ہی عثمان اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔ بازاری عورت ہونے کے باوصف وہ چھچھوری حرکات کی قائل نہیں ہے۔ عثمان سے شادی کے بعد وہ اپنی ساری زندگی عثمان کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ وہ ایک خدمت گزار اور شوہر پرست عورت ہے۔ وہ عثمان کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتی ہے۔ اس کو دیوتا سمجھ کر اس پر اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کر دیتی ہے۔ الغرض وہ خلوص، وفا، قربانی اور ایثار کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ ناول کا دوسرا نسوانی کردار شیم کا ہے۔ وہ حسن افروز کے کردار کے بالکل بر عکس ہے۔ دونوں متضاد طبیعتیں رکھتی ہیں۔ شمیم ایک خوب صورت عورت ہے اور اپنی خوبصورتی کے زہر سے واقف ہے۔ وہ عثمان پر ڈورے ڈالتی ہے اور عثمان کو اپنی

طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوتی ہے لیکن عثمان سے جب جی بھر جاتا ہے تو اس کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ وہ ایک دھوکے باز عورت ہے۔ محبت، خلوص، ایثار اور قربانی جیسی انسانی قدریں اس کے نزدیک کوئی مفہوم نہیں رکھتی ہیں۔ شمیم کے کردار کی خصوصیات میں شامل ہے کہ حسن افروز اگر شمع کا فوری ہے تو شمیم شعلہ جوالہ۔ پھر وہ ہر حربے سے آراستہ ہے۔ ناز سے، غمزے سے، مکاریوں سے، عیاریوں سے، جھوٹ سے، فریب سے لے اپنی ان تمام خصوصیات کو وہ ہر مرد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ "خوابِ ہستی" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "ایڈرین: پھر دیکھو، کیا طبیعت پائی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذہن کس قدر رسا تھا۔ بایں ہمہ اس کا زہد و تورع ضرب المثل ہے۔
>
> بدر: مروجہ مذہبی یا اخلاقی قانون کا پابند ہونا بجائے خود دماغی ترقی کو روکنے کے لیے کافی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو نہایت پارسا خیال کرتے ہیں، علی العموم نہایت تنگ نظر خیال کرتے ہیں"(۲۶)

یاسمین:

مرزا محمد سعید کا دوسرا ناول یاسمین ہے بنیادی طور پر یہ ایک کرداری ناول ہے۔ جو اختر، صفیہ اور یاسمین کی کہانی کے گرد گھومتا ہے۔ اختر کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہونے کے بعد جب مایوسی و پریشانی اسے گھیر لیتی ہے تو اختر کا والد بیٹے کو اس کیفیت سے نکالنے کے لیے کلکتہ سیر و تفریح کی غرض سے بھیج دیتا ہے۔ کلکتہ میں اختر کی ملاقات یاسمین سے ہوتی ہے اور یہ ملاقات محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے تو یاسمین اختر کے ہمراہ بھاگ جاتی ہے، وہ جس گاؤں میں پناہ لینے پہنچتے ہیں وہاں طاعون کی بیماری پھیل جاتی ہے تو اختر اور یاسمین وہاں ان لوگوں کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ اس خدمت کے عوض اس گاؤں والے ان دونوں کو وہاں ایک مکان تعمیر کر کے دیتے ہیں۔ لیکن چند ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے وہ پھر واپس کلکتہ آجاتے ہیں وہیں یاسمین کی ملاقات ایک اور شخص پھول چندر سے ہوتی ہے اور یاسمین اس کے ساتھ محبت کا اظہار کرتی ہے اور پھر اپنا راستہ بدل لیتی ہے۔ چندر پھول یاسمین کے اس رویہ کی وجہ سے دلبر داشتہ ہو کر خودکشی کر لیتا ہے اور دوسری طرف اختر یاسمین کی ان حرکات کی وجہ سے شراب و جوا کی لت میں پڑ جاتا ہے اور پولیس اسے گرفتار کر لیتی ہے اور رہائی کے بعد جب واپس گھر پہنچتا ہے تو وہ اپنی بیوی کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ بیوی اس کو سنبھالا دیتی ہے اور

اسے یاسمین کی بے وفائی کے غم سے نکال کر نارمل زندگی پر اسے رواں دواں کر دیتی ہے۔اس ناول میں مرزا سعید نے یاسمین کے زریعے ایک شاطر، متلون مزاج اور دغاباز عورت کا کردار پیش کیا ہے جس کے ہاں محبت، شادی اور ازدواجی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں۔اور اس کردار کے زریعے ناول نگار نے اس حقیقت پر روشنی ڈالی ہے کہ بچیوں کی تربیت میں ماں کا کردار کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔اور اگر ماں بچیوں کی درست تربیت نہ کر سکے تو ان کے مستقبل کس قدر تاریک ہو جاتے ہیں اور پھر اس وجہ سے معاشرہ کو کن کن مسائل کا شکار ہونا پڑتا ہے۔یاسمین مرزا سعید کے کرداروں میں ایک ایسا ہی کردار ہے جسے نہ تو مجسم رحمانی کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی پیکر شیطانی بلکہ درست اخلاقی تربیت کی قلت کا شکار کردار ہے جبکہ اس ناول میں صفیہ کا کردار اس بات کا غماز ہے کہ اچھی تربیت کی حامل خواتین مسائل پیدا نہیں کرتی ہیں بلکہ مسائل سے نجات میں دوسروں کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔مرزا سعید اس ناول کے ذریعے اس بات کی طرف توجہ دلا رہے ہیں کہ ماں کی زمہ داری معاشرے کی تشکیل و ارتقا کس قدر اہم ہے اور ہر خاتون کو مستقبل میں ایک ماں کا روپ دھارنا ہوتا ہے جس نے معاشرے کے افراد کی اخلاقی تربیت کرنی ہوتی ہے اس لیے عورت کی تعلیم و تربیت کی اہمیت و افادیت سے کسی صورت انکار ممکن نہیں ہے۔

پریم چند کے ناول میں خواتین کی اخلاقی تربیت کے پہلو:

بیوہ:

پریم چند ۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء) اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک عہد ساز شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔بہ حیثیت ادیب پریم چند کی نگارشات اور ان کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔نثری ادب کی ہر صنف میں ان کی تصانیف اور تحریریں ملتی ہیں۔افسانہ، ناول، ڈرامہ، سوانح تنقید اور انشائیہ کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لئے بھی مفید اور دلچسپ کتابیں مرتب کی ہیں۔ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی اُردو اور ہندی میں ان کا خاص مقام ہے۔ان میں سے ہر صنف میں پریم چند کا منفرد اور دلنشیں طرز تحریر، ان کی شخصیت کے دلاویز پہلو اور زندگی اور زمانے کے متعلق ان کے تصورات نمایاں ہیں۔اُردو زبان وادب میں پریم چند کے مرتب کا تعین اسی وقت ممکن ہے جب ان تمام موضوعات پر ان کی تصانیف اور تحریروں کا عائر نظر سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں میں بے شمار نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے جن کے ذریعے عورت کے مختلف مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔اردو فکشن کا بڑا فن کار منشی پریم چند

ہے۔ پریم چند نے اپنے عہد کے لکھاریوں خصوصاً ناول نگاروں اور اپنے بعد آنے والی ایک بڑی نسل کو اپنے حصار میں لیا ہے۔ پریم چند کے معاصر ناول نگاروں نے پریم چند کی روایت کو وسعت دی اور اسکی ترویج کرتے ہوئے ناول نگاری میں بے بہا اضافے کیے۔ ایسے بہت سے ناول نگار جن کی مقبولیت و شہرت اپنے زمانے تک ہی محدود رہی۔ لیکن ناول نگاروں کا ایک بڑا گروہ ایسا ہے جو آج بھی اردو فکشن میں اپنی فن کارانہ استعداد کی بدولت زندہ ہیں۔ پریم چند نے ناولوں کے ذریعہ سماجی سیاسی اور معاشی مسائل پیش کئے ان کی نگاہ ہمیشہ ملک کے ان ہی حالات پر رہتی تھی۔ لیکن مدن گوپال کے الفاظ میں چونکہ اس سپاہی کی تربیت صحافت سے ہوئی ہے اس طرح ان کی ناول نگاری ایک پورے عہد کی عکاسی کرتی ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری اپنے عہد کے سیاسی ، سماجی ، ملکی اور قومی حالات کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں شریک ہو جاتی ہے۔ پریم چند نے ساحل سے طوفان ہی نہیں پریم چند ہندوستان کے سماجی مسائل کو حل کرنے میں بھی مجاہدانہ اطوار کا نظارہ پیش کیا بلکہ انہوں نے طوفان کے تھپڑے بھی کھائے، ان کی زندگی جہدِ مسلسل کا انداز اختیار کر چکی تھی۔ ہندوستان کے سماجی اور معاشی حالات کے طوفان سے عملی طور پر نبرد آزما ہونے اور بیسویں صدی کے پہلے دہے میں ایک بیوہ سے شادی کرنے کے کارِ خیر میں حصہ لیا۔ اس طوفان کے مدوجزر میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز صاف صاف ان کی جرات مندی اور باغیانہ رجحان ہی کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ان کی ملکی اور قومی معاملات سے دلی وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے اس وقت کے سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" (۱۹۰۸ء) انگریزی حکومت کے خلاف لکھا۔

الغرض پریم چند کے ناولوں اور کہانیوں میں ان کے عہد تک کے ہندوستان کی معاشی، سیاسی، طبقاتی اور عوامی کشمکش کا بڑا واضح اور تابناک نقشہ ملتا ہے لیکن پریم چند کی زندگی، ان کے تصویر حیات، ان کا عہد اور ان کی تحقیقات باہم گر اس درجہ مخلوط ہیں کہ ان کو باہمہ یا بے ہمہ دیکھنا اور دکھانا مشکل لیکن اہم اور دلچسپ مطالعہ ہے۔ ان کے نسوانی کرداروں میں چھارن سے لے کر رانی تک ہر طبقے کی عورت ملتی ہے لیکن ان کی انفرادیت کو ہر جگہ ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ پریما، منورما اور سکھدا کے کرداروں کو انہوں نے ایک آدرش ہندو ناری کے روپ میں پیش کیا ہے۔ خود اعتمادی حق شناسی کے ساتھ ساتھ مظلوموں سے ہمدردی اور ظالموں سے نفرت ان کی خاص انفرادی خصوصیات ہیں۔ وہ جہاں بھی ظالم کو ظلم کرتے یا گندی سازشیں کرتے دیکھتی ہیں اس کو علامت کئے بغیر نہیں رہتی ہیں۔ خواہ وہ ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ حق و صداقت کے راستے پر ان کو جو بھی رکاوٹ نظر آتی اپنی ہمت اور جرات سے وہ ان کو دور کر کے آگے بڑھتی ہی جاتی ہیں اور

منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتی ہیں۔ ہندوستانی عورت کی پامالی اور کسمپرسی نے پریم چند کو کافی متاثر کیا ہے اور عورت کی یہی پامالی اور شکستگی ان کے ناولوں کا ایک خاص موضوع ہے۔ اردو کا افسانوی ادب جتنا پریم چند سے متاثر ہوا اتنا شاید کسی دوسرے مصنف سے ہوا ہو۔ پریم چند کی اک بڑی خوبی ان کی سادہ اور سلیس زبان اور شفاف و بے تکلف طرز تحریر ہے انھوں نے بول چال کی عام زبان کو تخلیقی زبان بنادیا اور افسانوی ادب کو ایسا جاندار اور شگفتہ اسلوب دیا جو تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے کئی ایسے نسوانی کردار بھی تخلیق کئے ہیں جن کے ذریعے عام گھریلو مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پورنا کے کردار میں انہوں نے ہندو بیوہ کی زندگی کی تلخیوں کا بیان فنی بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ دراصل بیوگان کے مسائل کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے اپنے مختصر ناول "بیوہ" میں کسی قدر وضاحت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پریم چند نے دراصل ۱۹۲۲ء میں اپنے ناول "پرکیا" کے پلاٹ میں کچھ تبدیلیاں کر کے نئے سرے سے لکھا اور اس کا نام "تنگیا" رکھا۔ یہی ناول ہندی میں "پرتگیا" کے نام سے شائع ہوا اور پھر اس کا ترجمہ ۱۹۲۷ء میں "بیوہ" کے نام سے اردو زبان میں شائع ہوا کیا گیا ہے۔ ۔ اگر چہ یہ ناول " جلوہ ایثار" سے پہلے لکھا گیا تھا لیکن فنی اعتبار سے یہ زیادہ مکمل اور کامیاب ناول ہے۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ اس ناول کی مختلف اشاعتوں پر پریم چند مناسب ترمیم و اصلاح کرتے رہے ہیں۔ امرت رائے ایک نوجوان وکیل ناول کا ہیرو ہے وہ ایک اصول پرست آدرش وادی لیکن عملی انسان ہے۔ اس کے دل میں انسانیت کا درد اور قومی اصلاح کا سچا جذبہ ہے۔ وہ اپنی مرحوم بیوی کی بہن پریما سے محبت کرتا ہے اور پریما اس سے۔ لیکن اس زمانے میں ہندو بیواؤں کی مظلومی پر ایک مصلح کی تقریر سے اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ وہ پریما سے شادی نہ کرنے کا عہد کرلیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اسے ایک کنواری لڑکی سے شادی کرنے کا حق ہی نہیں۔ اصلاح کا یہ پیکر اپنی ساری دولت اور تمام زندگی قومی اصلاح کے کاموں میں صرف کر دیتا ہے۔ اناتھ آشرم اور بیوہ آشرم کی تعمیر کے لیے گھر گھر چندے مانگتا ہے اور سناتن دھرمیوں کی مخالفت کے باوجود بھی لگن، نیک نیتی اور خلوص اسے اپنے اعلیٰ مقصد میں کامیاب بناتے ہیں۔ "کشنا" دستیاب نہیں ہوتا لیکن اس کا موضوع " غبن کی طرح عورتوں میں نہ زیورات کے شوق کے خطرنات نتائج دکھاتا ہے "غبن" "کشنا" ہی کی ارتقائی صورت ہے۔۔ پرتگیا پریا اور ہم خرما و ہم ثواب کا موضوع ایک ہی ہے ۔ان ناولوں کے متعلق ڈاکٹر رام رتن بھٹنا گر لکھتے ہیں :

> "پرتنگیا پرکا کا بدلا ہوا روپ ہے جو پہلے اردو میں ہم خرما و ہم ثواب کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کا سنہ تصنیف شام کے لگ بھگ ہے، ان سب کا موضوع سماج میں

بیواؤں کا مسئلہ ہے " پر کا " اور ہم خرما و ہم ثواب میں عقد بیو گان کو اس مسئلہ کا حل بتایا گیا ہے۔ یہ سماجی مسئلہ نذیر احمد کے زمانہ سے ناول نگاروں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ پریم چند نے " ہم خرما و ہم ثواب میں اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے مشرقی اقدار کا پاس رکھتے ہیں "(۲۸)

ناول " ہم خرما د ہم ثواب " ہے جو نہ صرف فن بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان کے دیگر ناولوں سے بہت کمزور اور کمتر ہے۔ یہ ناول " جلوہ ایثار " ۱۹۱۰ء کے بعد کی تصنیف ہے۔ اُردو میں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۱۲ء میں انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا جیسا کہ خود پریم چند نے اپنی خود نوشت سوانح میں اور بعض دوسری تحریروں میں لکھا ہے۔ ان کے احباب منشی دیانرائن نگم اور پیارے لال شاکر کے بیانات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کے ہندی میں یہ ناول اردو میں شائع ہونے کے بعد ہی" دردان " کے نام سے شائع ہوا۔ ہم خرما و ہم ثواب " نو عمری کی مشق کا نتیجہ ہے اور ہر لحاظ سے ایک مبتدیانہ کوشش ہے۔ لیکن یہ دو ناول اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود پریم چند کی سنجیدہ کوششوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

فاضل نقاد کی یہ رائے صرف ایک حد تک صحیح ہے۔ پریم چند کے مختصر ناول اُن کی فنی کاوشوں کے ابتدائی نمونے ہیں۔ یہاں سے ان کی ناول نگاری کا جو سفر شروع ہوتا ہے، ان کے ناولوں میں پلاٹ کی تعمیر شخصیت نگاری اور زبان دبیان کی بہت سی کوتاہیاں موجود ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت اُردو میں قلمی حیثیت سے ناول کا کوئی ایسا مکمل اور معیاری نمونہ موجود نہیں تھا جو پریم چند کے لئے مشعل راہ کا کام دیتا اس لیے انھوں نے اپنے ہی غور و فکر کے سہارے اپنے فن کی راہوں کا تعین کیا ہے۔ انھوں نے فن کے اس ورثہ سے جو انھیں ملا تھا فائدہ ضرور اٹھایا لیکن اسے شمع ہدایت نہیں بنایا اور اس طرح عملی طور پر اردو میں ناول کا ایک نیا اور با مقصد تصور پیش کیا جو اس سے پہلے کے ناولوں سے زیادہ نکھرا ہوا اور کامیاب ہے۔ اس ناول کو پریم چند نے اسی حقیقت یا اسی آدرش کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے لیکن اس کے ساتھ اس ناول میں مصنف نے پورنا کے کردار میں بال بیواؤں کی الم نصیبی اور ہندو سماج میں ان کی کس مپری اور بدحالی کی کامیاب مصوری بھی کی ہے۔ اپنے شوہر بسنت کمار کی موت کے بعد وہ بے سہارا ہو جاتی ہے جبکہ دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ شوہر کی موت کے بعد سسرالی عزیزوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہیں۔ ایک پڑوسی لالہ بدری پرشاد اس کی حالت پر ترس کھا کر اپنے گھر میں پناہ دیدیتے ہیں۔ غیروں کی ہمدردی کے سہارے جینے کی ذلت کا احساس اس کے لیے کم نہ تھا کہ بدری پرشاد کا آوارہ مزاج لڑکا اس کی بے بسی سے فائدہ اُٹھا کر اس کی

آبرو پر حملہ کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کو ایک مستقل عذاب سمجھ کر وہ خودکشی کا ارادہ کرتی ہے لیکن ایسا کر نہیں پاتی۔ امرت رائے اسے اپنے آشرم میں داخل کر لیتے ہیں اور اس طرح اسے ایک باعزت زندگی نصیب ہوتی ہے۔

پریم چند نے اس طور پر اس مسئلہ کا ایک عملی اور سماجی حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عورت کی جہالت اور اس کی معاشی غلامی ہی ہندو سماج میں اس کی پستی، بدحالی اور ذلت کا اصل سبب ہے۔ اور اس غلامی کی زنجیر کو توڑے بغیر اس کے لئے آزاد فضا اور تروتازہ ہوا میں سانس لینا ممکن نہیں۔ بیوہ کا ایک اور اہم کردار سمترا ہے۔ وہ اپنے شوہر کملاچرن سے پیار کرتی ہے لیکن اس کی خودداری اور حفظ انس کا جذبہ تنگ دل کملاچون کے احساس برتری سے متصادم ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے میکے سے شوہر کو اپنانے اور ایک خوش گوار ازدواجی زندگی گزارنے کے جو خواب لے کر آئی وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ شوہر کے دل میں اس کے لئے نہ محبت ہے نہ عزت۔ ساس کی بدسلوکی اور شوہر کی بے نیازی اور بے مہری سے اس کی زندگی بھی پورنا (بیوہ) کی زندگی سے کچھ زیادہ بہتر نہیں۔ نہ شوہر پر اس کا کوئی حق ہے نہ گھر کے انتظام میں اختیار۔ اس کی دن رات کی محنت کے صلے میں کچھ کھانے اور پہنے کو ل جاتا ہے ہی اس کی زندگی ہے اور یہ سب کیوں؟ اس کا جواب پریم چند نے کمتر ہی کی زبان سے دیا ہے۔ وہ کہتی ہے۔

> "تم نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی۔ یہی میں بھی کہتی ہوں۔ بیچاری عورت کما نہیں سکتی اسی لیے اس کی یہ درگت ہے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ اگر مرد اپنے کنبے بھر کو کھلا سکتا ہے تو کیا عورت اپنی کمائی سے اپنا پیٹ بھی نہیں بھر سکتی؟"(۲۹)

اس بیچارگی اور کھٹنائی میں وہ اسی طرح سوچتی ہے وہ اس غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن مجبور ہے۔ ماں باپ اسے ہمیشہ کے لئے گھر سے وداع کر چکے ہیں۔ سماج اسے محنت کر کے اپنی روزی آپ کمانے کا موقع اور آزادی نہیں دیتا۔ پریم چند نے اس سوال کو "بازار حسن" میں ذرا اور بڑے کینوس پر ابھارا ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر خود بھی سوچا ہے اور دوسروں کو بھی دعوت دی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیوہ کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جو اس ناول کا اساسی موضوع ہے مصنف کی نگاہ آشرم کی تعمیر سے آگے نہ بڑھ گی۔ اگرچہ ذاتی طور پر ایک بیوہ سے شادی کر کے پریم چند نے اس سے بھی ترقی پسند قدم اٹھایا تھا لیکن یہاں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاسی غلامی کا طوق ساز دلبری سمجھا جاتا تھا۔ غیر ملکی

حکومت کی برکتوں کے گیت گائے جاتے تھے۔ ابھی ہر طرف جاگیر دارانہ قدروں کا تسلط تھا۔ خانوں میں بٹی ہوئی زندگی اس صنعتی دور کی منتظر تھی جب وسیع پیمانے پر پیداواری وسائل کی تبدیلی سماجی رشتوں کو مضبوط و مستحکم کر دیتی ہے اور ادیب زندگی کے نو بہ نو مظاہر اور مسائل کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھتا ہے۔

نرملا:

''نرملا'' کو بھی پریم چند کے ناولوں میں سے ایک کا بہترین ناول تصور کیا جاتا ہے جو 1925 میں ادارہ فروغ اردو نے شائع کیا۔ پریم چند کے ناول نرملا کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں پریم چند نے عورتوں کی زندگی سے متعلق بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن کی بیوگی، بے جوڑ شادی اور جہیز سے پیدا ہونے والے مسائل جس کے نتیجے میں ایک پاکیزہ عورت بھی طوائف بن جاتی ہے۔ سن رسیدہ منشی طوطارام ایک کم سن لڑکی نرملا کی مجبوری کا فائدہ اُٹھا کر اُسے اپنی بیوی بنالیتا ہے جو عمر میں اُس کے بچوں کے برابر ہے۔ جہیز کی لعنت کے شکار والدین جب اپنی لڑکیوں کو عمر رسیدہ شخص سے شادی کر دیتے ہیں تو مستقبل کی پریشانیوں کا نقشہ اس ناول میں دیکھایا گیا ہے۔

پریم چند کا ناول نرملا دراصل دو لڑکیوں نرملا اور کرشنا کے کردار پر مبنی ایک سماجی کہانی ہے۔ نرملا چنچل اور شوخ مزاج ہے۔ جب وہ پندرہ سال کی ہو جاتی ہے تو گھر میں اس کی شادی کی بات چھڑتی ہے۔ اس کے بعد نرملا اپنے چنچلے پن پر سنجیدگی کا غلاف چڑھا دیتی ہے۔ شادی کی تیاریاں زوروں پر ہے۔ نرملا کی شادی جس شخص سے ہوتی ہے وہ عمر دراز اور انتہائی لحیم شحیم آدمی ہے۔ نرملا جس خواب کو سجائے اپنے پیا کے گھر جاتی ہے وہ شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتا ہے اور پھر دونوں میں کشیدگی آجاتی ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے نرملا کو اپنا فرض یاد آتا ہے۔ وہ اس بات سے انجان ہے کہ اس کی آنے والی زندگی میں درد کا عفریت اس کا منتظر ہے۔ نرملا کی زندگی میں ایک عجیب و غریب موڑ آتا ہے اور یہیں سے درد کا ایک طویل سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پوری کہانی کو گاؤں کے ماحول میں خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کو پڑھنے کے بعد قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ ازدواجی اور سماجی زندگی کے اپنے کچھ تقاضے ہیں اور ان تقاضوں کی پاسداری کر کے ہی خوشیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

پریم چند نے اپنے ناول نرملا میں سمن اور نرملا کے کرداروں کے وسیلے سے یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ بے جوڑ شادیاں کس طرح معصوم لڑکیوں کی زندگی میں زہر گھول دیتی ہیں اور کس طرح ان

کو غلط راستہ اپنانے پر مجبور کرتی ہیں۔ انھوں نے اپنے تخلیق کردہ کرداروں کے ذریعے عورت کی تمام تر فطری خوبیوں اور خامیوں کو بڑی چابکدستی و مہارت سے پیش کیا ہے۔

ج: اچھے اور برے اخلاق کی وضاحتیں، صورتحال اور امثلہ:

انسانی تہذیب کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج کا جب وجود ہوا تو اس وقت تک طبقات کا کوئی تصور انسانی ذہن میں نہیں تھا مگر جیسے جیسے انسانی سماج کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور انسان نے زندگی کے مقصد کو صرف شکار تک محدود نہیں رکھا کیوں کہ شکار سے صرف بھوک مٹ سکتی تھی مگر سری ضروریات زندگی پوری نہیں ہو سکتی تھیں، زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس نے مختلف کام شروع کئے جیسے کاشت کاری، ماہی گیری، باغبانی، مویشی پالنا، گھر بناتا، اوزار بنانا، جڑی بوٹیوں سے علاج کرنا وغیرہ۔ ابتدا میں یہ کام انسان نے ضروریاتِ کی کو پورا کرنے کے لئے شروع کئے تھے مگر بعد میں کام کی مختلف قسموں کو سماج میں انسان کو عزت وام بخشنے کا ذریعہ بنایا گیا۔ انسان کو اس کی آمدنی، قوت اور صلاحیت کے عتبار سے سماج میں درجہ ملنے لگا سے انسانی سماج طبقاتی سماج میں بہنے لگا یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسانی سماج کے طبقات یا درجات معین کر لیے گئے اور انسانی سماج کے وجود کا دارومدار مازی دولت کی پیداوار پر منحصر ہو گیا۔ انسانی ہمدردی اور انسان دوستی سماج کی بنیادیں ہیں یہ دونوں جذبات ہی افراد کو سماجی رشتوں میں باندھتے ہیں جس سے سماج بنتا ہے۔ مختصرا ہم کہ سکتے ہیں کہ سماج دو یا دو سے زیادہ ایسے افراد کا گروہ ہے جو مخصوص ادرشوں اور روایتوں سے بندھے ہوں جن کی طرز زندگی اور دلچسپیوں میں مماثلت پائی جاتی ہو۔

انسانی تہذیب اور سماج کے فروغ کے ساتھ ساتھ سماج میں سماجی عدم مساوات بڑھتی گئی ہیں اور انسانی سماج طبقات میں تقسیم ہو گیا۔ سماج کے اعلیٰ اور ادنی درجات میں منقسم ہوتے ہی سماج کا نظام اپنا توازن کھونے لگا۔ سماجی نظام کو برقرار رکھنے اور اس میں نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے جن طریقوں کو اختیار کیا گیا اس طریقہ کار کو ہم سیاست کہہ سکتے ہیں دراصل سیاست کا بنیادی مقصد ملک و معاشرے میں نظم و ضبط برقرار رکھنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سیاست سماج کی ایک اہم ضرورت بن گئی۔ اگر سیاست کا وجود نہ ہوتا تو سماج میں سب کو یکساں رہنے کا حق اور آزادی کا حق نہ مل پاتا، سیاست کے ذریعہ سماج میں ہر شخص کو برابر کے حقوق دیئے گئے سیاست کی ابتدا کے متعلق ٹامس باس (Thoms Hobbes) اور روسو نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ اسٹیٹ سے پہلے مزاج کا دور دورہ تھا جس طرح بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں اسی طرح جسمانی اعتبار سے طاقت ور اشخاص کمزورں پر ظلم و ستم کرتے رہتے تھے۔ جیسے جیسے انسانی

تہذیب کا فروغ ہوا انسان تکلفات کا عادی ہونے لگا اور ذاتی ملکیت معرض وجود میں آئی اُس نے مساوات کا تقریباً خاتمہ کر دیا۔ امیر اور غریب کی نہ صرف تفریق بلکہ زیر دست کشمکش شروع ہو گئی اور اس کی وجہ سے خود غرضی شروع ہوئی اب امن و چین باقی نہ رہا۔ لوگ آزادی اور مساوات کی برکتوں سے محروم ہو گئے اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے ہر شخص نے اپنی آزادی سماج کے حوالے کر دی یہ مرضیءعامہ سب لوگوں کے مشترکہ مفاد کی حفاظت کرتی تھی قانون اسی مرضی کے اظہار کا نام ہے۔

سیاست ایک ایسی تنظیم ہے جسے سماج نے اس لئے قائم کیا کہ وہ سب کو اپنی ماتحتی میں رکھے سب پر اپنا حکم چلائے اور سب اس کا حکم مانیں۔ سماج میں اس قسم کی تنظیم، مملکت یا اسٹیٹ کہلاتی ہے اسطرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیاست کی جڑیں طبقاتی سماج میں مضمر ہیں۔ اورادب کو سماج کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اگر سماج کا وجود نہ ہوتا تو ادب بھی نہ ہوتا۔ کسی بھی سماج کی ترقی اور منزل کا اندازہ اس دور کے ادب سے لگایا جا سکتا ہے۔ جس دور کا جیسا سماج ہوگا ویسا ہی ادب ہوگا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سماج تغیر پذیر ہوتا ہے۔ یہ بھی زندگی کے مانند متحرک ہے ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے ادب کا تغیر پذیر ہونا لازمی ہے، ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی کے مانند ادب بھی کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ زندگی کبھی ایک منزل پر نہیں ٹھہرتی کبھی وہ ترقی کی طرف گامزن ہوتی ہے اور کبھی مائل بہ زوال۔ ان تبدیلیوں سے ادب بھی دوچار ہوتا ہے۔ کیونکہ جب زندگی کروٹ بدلتی ہے تو سماج بھی اسی انداز سے بدلتا ہے۔ ہم ادب پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں انسان اور اس کی معاشرت، ماحول کے لحاظ سے اس کے ادب میں مختلف کروٹیں لیتی رہی ہے۔

کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب انسانی تاریخ انسانی ادب پر اثر انداز نہ ہوئی ہو۔ کسی بھی زمانے کا ادب اس دور کے انسانوں کی تحریکات، خیالات اور نظریات کی عکاسی سے خالی نہیں رہا انسان نے جب بھی اپنے خیالات کو رواج دینا چاہا اپنی اُلجھنوں (چاہے وہ روحانی ہو یا ماڈی) کا تذکرہ کیا تو وہ ادب میں شامل کر لیا گیا، وہ دور جب انسان نے پڑھنا لکھنا سیکھا یا پھر وہ تصویر کی دور جب وہ اپنے جذبات و خیالات کی ترجمانی تصویر میں بنا کر کیا کرتا تھا اس وقت بھی ادب میں انسانی ضروریات سماجی کشمکش اور اس کے جذبات کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ ادیب ایک سماجی فرد ہے وہ جس طرح کے سماج میں رہتا ہے اور سماج سے جس طرح کے اثرات قبول کرتا ہے اسی طرح کے ادب کی تخلیق کرتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب اور سماج ایک سعہ کے دو پہلو ہیں اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں جب کبھی سماج میں برائیاں سر بلند کرتی ہیں اور سماج کا اخلاقی معیار گرتا ہے تو ادب سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح

ادب سماج کے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے ادب سماج کا نقاد بھی ہے اس کا کام صرف سماج کے ہو بہو تصویر کشی کرنا ہی نہیں ہے بلکہ ایک روشن مستقبل کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔زندگی کے لئے داستان سے حقیقت تک کا یہ سفر بالکل نیا اور طویل سفر تھا اور جب زندگی اس طویل سفر کو طے کر کے حقیقت کی دنیا میں داخل ہوئی تو ادب نے ایک نئی شکل میں اس کا استقبال کیا اور اسے حقیقت کی دنیا میں رہنے اور جینے کا سلیقہ سکھایا۔ اس طرح زندگی حقیقت کے ساتھ ساتھ سائنسی ایجادات سے بھی روشناس ہوئی ادب نے اپنی اس نئی شکل کا نام ناول رکھا۔ ناول اور عوام کے بیچ گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے کرداروں کا انتخاب عوام کے بیچ سے ہی کرتا ہے۔ اور قاری بھی عوام ہی ہوتا ہے۔ اور نقاد بھی عوام ہوتا ہے۔ اور اس طرح سے ایک عظیم ناول میں بلند کرداروں اور قاری کے بیچ ایک طرح کی حیاتیاتی رشتہ ہوتا ہے یوں تو کسی بھی ناول نگار کے انفرادی عقائد ہوتے ہیں۔ اور فن موضوع و کردار کے اعتبار سے اپنی پسند و ناپسند پر پورا اختیار رکھتا ہے۔

کرداروں کی تخلیق میں خود اس کی شخصیت جھلکنے لگتی ہے۔ اس کے ذاتی تجربات و مشاہدات کام کرتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود شعوری یا لاشعوری طور پر سماج سے وابستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ دیگر واقعات و کرداروں سے رشتہ بناتا ہے۔ یہ ناول نگار کی کم صنف، ناول کی مجبوری زیادہ ہوا کرتی ہے کہ اُسے ایک بڑے پلاٹ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے کرداروں میں ایک خاص رنگ بھرنا پڑتا ہے۔ اور پھر وہ اسی طرح پوری زندگی کو پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ زندگی اور سماج سے ناول کا رشتہ ناگزیر ہے۔ یہ بات سچ ہے اسی لئے ناول میں، ادب برائے زندگی کا اصول زیادہ منعکس ہونا چاہیئے۔ ناول انسانی زندگی کا ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس میں ہر زاویے سے ایک دور کی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اور اسی لئے ناول کو زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

غرض کہ ناول اپنے مزاج اور کردار کے اعتبار سے کاج اور سیاست سے بے حد قریب ہے۔ ناول کے وسیع اور طویل کینوس میں جس طرح زندگی اور سماج سمٹ آتا ہے۔ شاید کسی اور دوسری صنف میں اس طرح کے امکانات نہیں شاید اسی لئے تاریخی واقعات، سماجی تصادمات اور انسانی نفسیات کا جتنا بہتر اور فنکارانہ عکس ناول میں نظر آتا ہے۔ کسی دوسری صنف میں ممکن نہیں۔ اسی لئے ادبی اصناف میں ناول کا سماجیات اور سیاسیات سے گہرا رشتہ ہے۔ انہیں رشتوں کے بارے میں توکاچ نے کہا تھا۔ ناول اور سماج کا رشتہ حقیقت پسندی تک پہونچنے کا ایک راستہ ہے۔ اور یہ ایک ایسی ہے۔ جو کردار اور انسانی رشتوں کو آزاد زندگی سے جوڑتا ہے" لارنس نے بھی کہا تھا: "ناول صرف فنکار ہی نہیں بلکہ زندگی کے تجربوں کو پڑھنا ہے ایک اعلان ہے۔

ایک اندرونی تصویر ہے۔ مغرب میں ناول نگار خواتین نے جو ادبی خدمات سر انجام دیں اور جو راستے مستقبل کے ادیبوں کو دکھائے ان کے تجزیے سے یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے کہ ہمارا ادب بھی مغربی دنیا کے ان تجربوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تاہم ایک بات انتہائی وثوق کے ساتھ کسی جا سکتی ہے کہ ایشیائی خواتین کا اپنا تخلیقی سفر بھی ہمیشہ جاری رہا ہے۔ وہ علم و آگہی اور شعور کے سفر میں ہمیشہ فعال رہی ہیں۔ مشرقی ناول نگاری میں بھی خواتین اور اس کے اخلاقی، سماجی، معاشی اور ثقافتی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بر صغیر کی خواتین اردو ناول نگار بھی پیش پیش رہی ہیں۔

محمدی بیگم جو نامور ادیب و ناشر شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی کی بیوی اور مشہور ڈرامہ نگار سید امتیاز علی تاج کی والدہ تھیں۔ محمدی بیگم (۱۸۷۹ء۔۱۹۰۸ء) نے رسالہ تہذیب نسواں کی ادارت کے علاوہ بے شمار علمی و ادبی خدمات سر انجام دیں۔ ان کی اکثر تصانیف امور خانہ داری اور اصلاح رسوم پر مبنی ہیں۔ لیکن "شریف بیٹی" "صفیہ بیگم سگھڑ بیٹی" اور "آج کل ان کے مشہور ناول ہیں۔ صفیہ بیگم" پہلی مرتبہ ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں بچپن کی منگنی کا عبرتناک قصہ بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ محمدی بیگم اس رسم کو خلاف شریعت سمجھتی تھیں اس لیے اس سماجی کوڑھ کو مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے کاٹ کر علیحدہ کر دینا چاہتی تھیں۔ صفیہ ایک شریف خاندان کی تعلیم یافتہ لڑکی تھی جو اس قبیح رسم کی وجہ سے زندہ در گور ہو گئی اور مسلسل ذہنی صدموں کے باعث بالآخر حرکت قلب بند ہو جانے سے چل بسی۔ اس کا وصیت نامہ جو ایک خط کی صورت میں ہے، سارے قصے کا ماحصل ہے اور اکیلی صفیہ بیگم کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرتا بلکہ اس دور کی ان بے شمار معصوم اور بے بس بیٹیوں کی دبی دبی آہوں اور سسکیوں کی بھی غمازی کرتا ہے جو ان فرسودہ رسموں کی بھینٹ چڑھ جاتی تھیں۔

محمدی بیگم نے "شریف بیٹی" میں طبقہ اناث کو ہاتھ پاؤں ہلا کر اپنے خاندان کی معاونت کرنے کی تلقین کی ہے۔ اور کہانی کے پیرائے میں ان اسباب دنیاوی پر روشنی ڈالی ہے جس سے خاتون خانہ بے فکر ہو کر اپنے ہی گھر میں ہر معاشی دشواری سے عہدہ بر آ ہو سکتی ہے۔ شریف النساء کم سن ہی تھی کہ اس کا باپ عبدالغنی جو میں روپے ماہوار کا ملازم تھا خدا کو پیارا ہو گیا۔ اللہ نے شریف النساء کو ذہن رسا عطا کیا تھا۔ اس نے سلائی کشیدہ کاری کی بدولت گھر کی بدحالی کو آسودہ حالی میں بدل دیا۔ بلکہ اپنی بیمار ماں کا علاج کرایا اور اپنے دونوں بھائیوں کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائیں، ایک بھائی بیرسٹر بنا اور دوسرا سول سرجن۔" آج کل" محمدی بیگم کا آخری ناول ہے۔ اور غالبا اس لئے پہلے قصوں کے مقابلے میں زیادہ جاندار اور کامیاب ہے۔ اس میں

مصنفہ مولوی نذیر احمد کے غلبے سے قطعاً آزاد نظر آتی ہیں۔ اور ان کی کہانی پر فنی گرفت مضبوط ہے۔ یہ قصہ ایک کردار نمیدہ کی زبانی صیغہ واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہے۔ وہ ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار خاتون تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ امور خانہ داری میں طاق، خاندان کی لاڈلی۔ بہت سی خوبیوں کی مالک۔ مگر ایک بری عادت اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ آج کا کام کل پر ڈال دینا۔ والدین نے یہ سوچا کہ شادی کے بعد ان کی بیٹی یہ عادت خود بخود ترک کر دے گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کا شوہر اس کے ناز نخروں میں یوں الجھا کہ خود بھی نکما ہو کر رہ گیا۔ ہر کام التوا میں پڑنے لگا۔

محمدی بیگم کی تصنیفات کی مقبولیت کا عام سبب ان کی تحریر کی سادگی اور دل نشینی ہے... ان کی زبان دہلی اور لکھنو کی بیگمات اور ٹکسالی زبان کے قریب تر ہوتے ہوئے بھی تصنع و تکلف کے عیب سے بالکل پاک ہے۔ نذیر احمد دہلوی اور راشد الخیری نے اپنی تصانیف میں زنانہ محاورات کے استعمال کا پر تکلف اہتمام کیا ہے لیکن جا و بیجا محاورات کی بھرمار اور نامانوس الفاظ کی ثقالت سے ان کی تحریریں بوجھل ہو گئیں ہیں۔ ان کی زبان ضرورت سے زیادہ ٹکسالی اور علاقائی ہے۔ محمدی بیگم نے اپنی کتابوں میں جو زبان استعمال کی ہے وہ کسی خاص علاقے کی زبان نہیں بلکہ شمالی ہند کے شریف اور تعلیم یافتہ گھرانوں کی عام زبان ہے۔ اس میں صفائی و شائستگی کے ساتھ نسوانی لب و لہجہ کی مٹھاس اور شیرینی بھی بھرپور طور پر موجود ہے۔ محمدی بیگم کی ایک اور ہم عصر خاتون قصہ گو والدہ افضل علی کے نام سے ادبی دنیا میں مشہور ہوئیں۔ ان کا اصل نام اکبری بیگم تھا۔ اور وہ نذر سجاد حیدر کی سگی پھوپھی تھیں۔ گلدستہ محبت ان کا پہلا ناول تھا۔ چونکہ اس زمانے میں مذہبی پابندیوں کے باعث عورتوں کے نام تک پردے میں رکھے جاتے تھے اس لئے یہ ناول عباس مرتضی کے فرضی نام سے پبلک پریس مراد آباد سے چھپوایا گیا۔ اب یہ ناول نایاب ہے۔ اور صرف ایک نسخہ بقول خود مشہور ناول نگار قرۃ العین حیدر کے پاس ہے۔ "گودڑ کا لال" اکبری بیگم کا دوسرا ناول تھا جو ۱۹۰۷ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اس کے چھپتے ہی دھوم مچ گئی اور بہت جلد اس ناول نے نئی مڈل کلاس مسلمان عورتوں میں خصوصی حیثیت اختیار کر لی۔ لڑکیوں کے جہیز میں دیا جانے لگا۔

عباسی بیگم اس دور کی ایک اور اہم ناول نگار تھیں۔ جن کے دو ناول "افسانہ نادر جہاں (۱۹۱۸ء) اور زہرہ بیگم" بہت مشہور ہوئے۔ یہ قصے بھی اصلاحی نقطۂ نظر سے لکھے گئے اور ان پر مولوی نذیر احمد ہی کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً "زہرہ بیگم" کی کہانی میں یت کو بطورِ خاص موضوع بنایا گیا ہے کہ ان کے ہاں علم و ہنر کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اور یہ لوگ محض دولت ہی کو اپنا ملیلی و مادی سمجھتے تھے۔ اس قصہ کے زیادہ تر

کردار نئی روشنی کے پرستار ہیں۔ مثلاً صغیر شوکت و مز شوکت اور صغیر کے والد. صرف ہیروئین زہرہ کی ماں پرانے نظریات کی عورت ہے۔ پہلے تو وہ جانتے بوجھتے ہوئے صرف دولت کی ہوس میں زہرہ کو بوڑھے نواب سے بیاہ دیتی ہے اور پھر تعویذ گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں سے حالات سنوارنا چاہتی ہے۔ لیکن ناکام ہوتی ہے۔عباسی بیگم کا یہ ناول ایک کامیاب المیہ ہے۔ جو اثر انگیز ہے اور اسے پڑھنے کے بعد کوئی ماں اپنی بچی کا مقدر مال و زر کی لالچ میں داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ اس قصے کی زبان بڑی رواں سادہ اور بے ساختہ ہے اور اس کے کردار معاشرے کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے حقیقی افراد ہیں۔ طیبہ بیگم اس زمانے کی ایک اور خاتون ناول نگار تھیں۔ آپ نواب عماد الملک کی صاحبزادی تھیں۔ عربی فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتی تھیں۔ایک باعمل اور متحرک شخصیت تھیں۔

سماجی بہبود کے کاموں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیتیں۔ چنانچہ آپ نے، حیدر آباد دکن میں لیڈیز ایسوسی ایشن اور انجمن خواتین اسلام کی بنیاد رکھی۔ بے شمار عورتوں کو دستکاری خانہ داری سکھانے کے علاوہ ابتدائی تعلیم سے بھی مزین کیا۔ آپ نے علی گڑھ کالج کے لئے چندے جمع کئے۔ جنگ بلقان اور جنگ طرابلس کے مظلوموں کے لئے بھی مالی امداد فراہم کی۔ مزید برآں آپ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر آل انڈیا لیڈیز

کانفرنس کی صدر بھی منتخب ہوئیں۔ طیبہ بیگم کے دو ناول "حشمت النساء" اور "انوری بیگم" قابل ذکر ہیں۔ ان ناولوں میں آخر انیسویں صدی اور شروع بیسویں صدی کے حیدر آباد کی معاشرتی تصویر کشی کی گئی ہے۔ تعلیم نسواں خاص موضوع ہے اور پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر دکھائی گئی ہے۔ جیت اس طبقے کی ہوتی ہے جو نئی روشنی کا دلدادہ ہے اور پرانے توہمات اور تعصبات کو چھوڑ کر جدید نظریات سے بہرہ ور ہو چکا ہے۔ رشیدۃ النساء اور محمدی بیگم کی طرح طیبہ بیگم بھی شادی بیاہ کی رسوم پوری جزیات سے بیان کرنے کی شوقین ہیں۔ حشمت النساء لڑکیوں کی تعلیم کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں حیدر آباد کی بڑی بوڑھی بیگموں اور پیش خدمتوں کی بھولی بھالی یا تین لڑکے لڑکیوں کی معصوم شرارتوں روز مرہ کے کام کاج۔ بیکاری اور فرصت کے مشاغل بہت دلچسپ ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ آج کے لڑکے لڑکیوں اور گزشتہ نسل کے بڑے بوڑھوں کے خیالات میں کیا فرق ہے۔

"انوری بیگم" میں سرمایہ دار طبقہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ جاگیر دارنہ خو بو کے حامل یہ لوگ اپنی تباہ کن رسموں کے سبب ماضی کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔ اور یوں پرانے اور نئے زمانے میں ایک واضح فرق پیدا کر کے مصنفہ نے قاری کو نئی تہذیب کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ طیبہ بیگم کی تحریر میں اثر آفرینی

بدرجہ کمال موجود ہے۔ وہ روزمرہ زندگی کے سیدھے سادے واقعات کی بنیاد پر اپنے قصے کی عمارت کھڑی کرتی ہیں۔ مبالغہ آمیزی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ البتہ وہ کہیں کہیں سرشار کی تقلید میں ظریفانہ چٹکلے بھی چھوڑتی ہیں جن سے ان کی تحریر میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

صغرا ہمایوں مرزا کا شمار بھی اُردو کی اولین خاتون ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے تقریباً چودہ ناول لکھے۔ جن میں "تحریر النساء" موہنی مشیر نسواں" "زہرہ" اور "سرگزشت ہاجرہ" بہت مقبول ہوئے۔ خاص طور پر م پر موخرالذکر ناول نے بہت شہرت پائی۔ بیگم ہمایوں مرزا نے اپنی تمام تحریروں میں خواتین کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اچھی تربیت پر بھی زور دیا ہے مثلاً ان کے ناول "سرگزشت ہاجرہ(۱۹۳۶ء) ہی کی ہیروئین کو لیجئے۔ وہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس کی شادی حیدرآباد دکن کے ایک ایسے امیر خاندان میں ہوتی ہے جو شراب اور عیش و عشرت کا دلدادہ ہے۔ مگر ہاجرہ اس ماحول میں بھی اپنی قابل تعریف تربیت کی وجہ سے نہ صرف اپنا مقام پیدا کرتی ہے بلکہ اس ناخوشگوار فضا ہی کو بدل ڈالتی ہے۔ وہ دنیادار لوگوں کو دین کی طرف مائل کرتی ہے۔ مزید برآں اس کی تین سہیلیاں جو اسی قسم کی مشکلات سے دوچار تھیں اس کے مشوروں سے اپنے اپنے گھروں کے حالات سنوارتی ہیں۔ مصنفہ نے ہیروئین کے شب و روز کا ایک ٹائم ٹیبل درج کیا ہے، جس سے اس کی تربیت اور زندگی کے دستور العمل کی پابندی کا پتہ چلتا ہے۔ صغرا ہمایوں کی تحریر میں سادگی اور روانی ہے۔ وہ اپنی مقصدیت کے باوجود قصہ کی دلچسپی کو ضائع نہیں ہونے دیتیں۔ اسی زمانے کا ایک اور مقبول ترین ناول "بیاض سحر" ہے جس کی مصنفہ تراب علی (سدید) تھیں۔ یہ ناول بدلتے ہوئے تمدن کے ہندوستانی شرفاء کی گویا عکاسی ہے۔ اس کتاب نے مسلمان، عیسائی، ہندو اور پارسی بھی اقوام کو متاثر کیا۔

لڑکیوں کی تعلیم، اصلاح رسوم، شادی میں آزادی رائے اور اولاد کی اچھی تربیت جیسے اہم مسائل اس کا موضوع ہیں۔ کہانی کے آغاز میں بچوں کی تربیت کے اصول بتائے گئے. ہیں۔ اور اس کے لئے ماں کی تربیت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ بیاض سحر" میں توحید و رسالت اور پیغمبران کرام کی حیات مقدسہ کی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہندو عقائد بھی واضح کیے گئے ہیں۔ تراب علی سدید کا انداز تحریر آسان اور اثر آفرین ہے۔ ذیل کے اس اقتباس سے یہ سادگی اور اثر آفرینی بخوبی ظاہر ہوتی ہے: مذہب ایک خوبصورت چیز ہے۔ خوبصورتی ایک مجسم شے ہے۔ حسن کی کشش انسانی فطرت میں ہے۔ بچہ جب کسی چمکدار چیز کو دیکھتا ہے ہمک کر اس پر گرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں جب انسانی عقل پوری طرح صیقل نہیں ہوئی تھی انسان

سورج کو پرماتھا سمجھتا تھا۔ چاند کی پرستش کرتا تھا۔ بیگم جعفر " بیاض سحر " کا ایک مثالی کردار ہیں۔ وہ ایک سوشل ورکر ہونے کے ناطے اکثر اوقات دوسری خواتین کو غیر ضروری رسمیں چھوڑنے کی تلقین کرتی رہتی ہیں۔ وہ چیزوں کو عقل سے پرکھنے کی قائل ہیں۔ وہ لڑکیوں کو رضامندی کی شادی کا حق دلانا چاہتی ہیں۔ فضہ کا کردار اس کا آئینہ دار ہے۔ وہ ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان جاتی ہے۔ جب نذیر اس کا رشتہ مانگتا ہے تو وہ یہ سمجھ کر کہ وہ صرف دولت کے لئے اس کا آرزومند ہے، اسے ٹھکرادیتی ہے۔ وہ آزادی رائے کے لئے مختلف دلائل دیتی ہے۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ ہے اس لئے زندگی کو بہتر انداز میں گزارنے کا سلیقہ جانتی ہے۔

بیگم جعفر مذہبی رواداری کی قائل ہیں۔ شانتی، جوگندر، اور شکستلا وغیرہ سے ان کا برتاؤ ویسا ہی ہے جیسے مسلمانوں سے۔ اس کے علاوہ وہ انگریز لڑکیوں اور نرسوں سے میل ملاپ میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتیں۔ ناول کے ایک اور کردار زہرہ نے ایثار کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ خفیہ طور پر اپنی سوکن کی امداد کرتی ہے۔ اپنے جذبات پر قابو رکھ کر اچھے کردار کا مظاہرہ کرتی ہے اور یہ ثابت کرتی ہے کہ عورت اپنی نیکی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے عزم واستقلال سے باعزت روزی کما سکتی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو " بیاض سحر ایک کامیاب ناول ہے۔ اسی لئے اس نے آئندہ کی ناول نگار خواتین کو بڑا متاثر کیا۔ محمودہ بیگم اس عہد کی ایک اور کامیاب ناول نگار تھیں۔ جو ا۔ ظ حسن کے قلمی نام سے معروف ہوئیں۔ ان کا ناول " روشک بیگم " اُردو ادب میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ناول ۱۹۳۴ء میں دار الاشاعت پنجاب لاہور نے شائع کیا۔ زمانی اعتبار سے یہ قصہ تین نسلوں پر محیط ہے اور متحدہ ہندوستان کے علاوہ لندن کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ سید مظفر شہر دہلی کے ایک خاندانی رئیس تھے۔ جنہیں برٹش گورنمنٹ نے نواب بہادر " کا خطاب دیا تھا۔ نواب جعفر ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ بھی خطاب یافتہ تھے۔ دونوں زمینداری - مکانات جائیداد - نقد - جنس - نوکر چاکر۔ ماما۔ بگھی۔ فٹن۔ گھوڑے اور ہاتھی۔ رکھتے تھے۔ ان دونوں میں حد درجہ الفت تھی۔

نواب جعفر کی بیوی حسینی بیگم خوبصورت مگر بدمزاج ضدی اور جاہل عورت تھی جبکہ مظفر کی بیوی عالیہ بیگم حسن ظاہری کے ساتھ ساتھ تعلیم رحم دلی اور خوش مزاجی کے زیور سے بھی آراستہ تھی۔ نواب جعفر کی اکلوتی بیٹی روشک کی عمر چار سال تھی۔ نواب مظفر کے چار بچے تھے۔ چھوٹا بیٹا ہمایوں فر تیرہ برس کا تھا۔ نواب جعفر اپنے بھتیجے ہمایوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ جب اس نے علی گڑھ کالج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اسے اس کے ماموں نواب اشرف علی اور کالج کے ریٹائر ہونے والے پرنسپل کے ہمراہ اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیج دیا گیا۔ روانگی سے قبل ہمایوں اور روشنک کا نکاح کر دیا گیا۔ حالانکہ حسینی بیگم کی رضامندی اس میں

شامل نہ تھی۔ لندن کے قیام کے دوران ہمایوں نے سیر تماشے اور لہو لعب سے پرہیز کیا اور سخت محنت کے ساتھ پانچ سال میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی۔ ایل ایل ڈی کے امتحانات پاس کئے۔ پرنسپل صاحب کے مشورے پر مزید پانچ برس لگا کر اس نے سول سروس بیرسٹری اور ڈاکٹری کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس کی قابلیت اور ذہانت کی دھوم پورے انگلستان میں بچ گئی۔ لندن میں ہمایوں کی دوستی مائیکل سے ہوئی جو اس کا ہم جماعت تھا۔ مائیکل کی بہن میری بڑی خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ وہ ہمایوں میں دلچسپی لینے لگی۔ اسی دوران ہمایوں کے چچا نواب جعفر کا انتقال ہو گیا۔ اور حسینی بیگم نے اسے ایک خط لکھا کہ وہ روشنک کو طلاق دے کر آزاد کر دے کیونکہ جب نکاح ہوا تھا تو اُن کی بیٹی بہت چھوٹی اور کم عقل تھی مگر اب جوان ہو کر وہ اس عقد کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہمایوں نے جواب میں لکھ بھیجا کہ وہ چھ ماہ تک واپس آرہا ہے جیسے بچی کی خوشی ہو گی ویسے ہی کیا جائے گا۔ چند روز بعد ان کا دوسرا خط آیا جس میں مطلع کیا گیا تھا کہ وہ روشنک کی شادی اپنے بھتیجے سے کرنا چاہتی ہیں۔ اسلئے ہمایوں کو بھی اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیے شادی کر لے۔ اس کے علاوہ ہمایوں کو حسینی بیگم نے اس کی ماں عالیہ بیگم کی طرف سے ایک جعلی خط ارسال کیا، جس میں اسے طلاق بھیج دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ تاکہ لوگ یہ طعن نہ کر سکیں کہ ان کی بہو کسی غیر کے گھر چلی گئی۔ پریشانی کے انہی دنوں میں میری ہمایوں کے بہت قریب ہو گئی اور پرنسپل صاحب مائیکل اور میری کے والد سر جون ایلیٹ کی رضامندی سے ان دونوں کی شادی کر دی گئی۔ انگلستان میں تقریباً دس برس گزارنے کے بعد ہمایوں اپنی "لیڈی" کے ہمراہ ہندوستان واپس آیا۔ سرکار نے اسے مجسٹریٹ کا عہدہ دیا۔ یہاں آکر اسے حقیقت حالمعلوم ہوئی کہ اس کی بچی نے اسے ماں کی جانب سے جعلی خط لکھا تھا۔ اور روشنک ابھی تک اس سے وابستہ ہے مگر اس کی مرضی کے خلاف حسینی بیگم اس کی شادی اپنے ایک اوباش بھتیجے لاڈلے میاں سے کر رہی ہے۔ اس بیاہ کے موقع پر روشنک نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈولی میں بیٹھنے کی بجائے ہیرا نگل کر خودکشی کر لے گی۔ اپنی ملازمہ نرگس کے سمجھانے پر اپنے شوہر ہمایوں کو ایک دلگداز خط لکھا جسے پڑھ کر وہ اپنی منکوحہ بیوی اور چچیری بہن کی مدد کو فوراً پہنچا۔ سیعنی بیگم اور لاڈلے میاں کی مزاحمت کے باوجود وہ روشنک کو اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ جہاں دوسرے تیسرے روز خاندان والوں نے سادگی کے ساتھ اُن کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد روشنک نے اپنی ادھوری نے تعلیم، مکمل کی اور انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ لاڈلے میاں نے انتقامی کارروائی کے طور پر پہلے ہمایوں کا اصطبل نذر آتش کیا۔ پھر

روشک کی بچی اغوا کی۔ ایک بار اس نے ہمایوں اور روشک دونوں کے ہلاک ہو جانے کی جھوٹی تار بھجوا کر ان کے گھر والوں کو ہراساں کیا۔ بالآخر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ بچی بھی برآمد ہو گئی۔

کچھ عرصہ بعد لندن میں میری کے والد سخت علیل ہوئے تو دونوں میاں بیوی ان کی عیادت کو پہنچے۔ لیکن چند روز بعد سر جون ایلیٹ چل بسے۔ ان کی وفات پر میری ایسی دل گرفتہ ہوئی کہ خود بھی بیمار ہو گئی۔ ہمایوں نے تین ہفتے اس کی تیمار داری کی لیکن بے چاری نہ بچ سکی اور باپ کے پیچھے پیچھے راہی ملک عدم ہوئی۔ روشک کو میری کی وفات کا ہمایوں سے بڑھ کر صدمہ ہوا تاہم اُس نے دل گرفتہ ہمایوں کی ڈھارس بندھائی اور میری کے اکلوتے بیٹے ظفر کو انتہائی محبت کے ساتھ پالا پوسا۔ روشک بیگم " - ابتدائی دور کے ان ناولوں میں غالبا سب سے زیادہ توانا اور دل پذیر ہے۔ یہ اس عہد کا ایک یادگار ناول ہے۔ اپنی دلچسپ کہانی، متنوع کردار خوبصورت اسلوب نگارش اور دلفریب منظر کشی کی بدولت یہ اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور اگر یہ حقیقت بھی نظر رکھی جائے کہ یہ قصہ آدھی صدی پہلے ضبط تحریر میں لایا گیا تھا تو اس کی اہمیت اور بھی دوچند ہو جاتی ہے۔ آج کا نقاد اگر "روشک بیگم کو ناول کی موجودہ ہیت اور تکنیک کے اعتبار سے " خالص ناول" تسلیم نہ بھی کرے تو کم از کم اسے یہ تو ماننا پڑے گا کہ اُردو ناول کی جو عمارت بعد ازاں تعمیر ہوئی مسز ا۔ ظ حسن نے اس کی ابتدائی خشت کاری میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

ہندوستان میں واجدہ تبسم اور جیلانی بانو نے ان موضوعات کا احاطہ کیا جو خواتین کے تجربے ہو سکتے ہیں۔ بیرون ملک لکھنے والی خوائین میں محسنہ جیلانی، نعیمہ ضیاء الدین، رفعت مرتضیٰ، پروین رحت اور دیگر کئی خواتین اچھی کہانیاں کھاری ہیں۔ افسانوں کے حوالے سے خالدہ حسین کا نام اس لئے بہت اہم ہے کہ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے افسانوی ادب کو جس مقام تک پہنچایا تھا خالدہ حسین نے وہاں سے ایک اور رخ کی طرف سفر اختیار کیا۔ ان کے افسانوں نے جدید ادب کے ناقدین کو اپنی جانب متوجہ کیا مگر ان کا اس طرح مطالعہ اب تک نہیں کیا گیا جیسا سواری " جیسی کہانی لکھنے والی کا ہونا چاہیے تھا۔ خالدہ حسین نے اس کہانی میں علامت اور واقعہ نگاری کا ایک ایسا امتزاج پیش کیا ہے جو معنی اور کیفیت دونوں سطح پر قاری کو متاثر کرتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک ایسی فضا ہے جس میں ہمارے دور کی تلخیاں دل میں غبار سا بکھیر دیتی ہیں۔ ایسے افسانے جس کی کچکچاہٹ دانتوں میں محسوس ہو سانحہ بھوپال کے بعد سواری" کی شدت کو پوری طرح محسوس کیا گیا۔ خالدہ حسین کی کہانیاں اس پر اسراریت کے شعور کو بیدار کرتی ہیں جس پر آرٹ کی بنیاد ہے۔ جس کی مثال تمام

بڑے شعرا اور فنکاروں کے یہاں ملتی ہے۔ تنقید میں خواتین کا نام صرف ممتاز شریں تک محدود رہ گیا۔ وہ اچھی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب کی بڑی نقاد بھی تھیں۔

منٹو کی کہانیوں کا انہوں نے تفصیل سے تنقیدی جائزہ لیا اور اس میں شک نہیں کہ منٹو کے کرداروں کے تجزیے سے ان کی کہانیوں کی جہتیں کھلتی ہیں اور بحیثیت افسانہ نگار منٹو کی قامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں نے منٹو کی کردار نگاری کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان مقامات کی نشاندہی بھی کی ہے جہاں ان کی گرفت کردار پر ڈھیلی پڑ گئی ہے جس کی وجہ ممتاز شیریں کے خیال میں غیر ضروری تفصیلات ہیں۔ وہ اس حوالے سے ایک کامیاب تجزیہ نگار ہیں کہ وہ کہانی لکھنے والے کو تبصرہ نگار نہیں دیکھنا چاہتیں۔ ان کے اس رویے میں ان کے افسانوی ادب کے مطالعے کا بڑا دخل ہے۔ مثلاً انہوں نے موپساں اور چیخوف کا تقابلی موازنہ کرتے ہو۔تے ہوئے منٹو کو موپساں کے قبیلے میں رکھا ہے۔ سارے مردانہ رشتوں کے حوالے اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ انیسویں صدی کے اختتام تک ادب کے میدان میں قدم رکھنا محال تھا۔ تاہم بیسویں صدی کے وسط میں خواتین ناول نگارں نے دو معرکہ انجام دیا کہ اردو ادب کی تاریخ ان کے ناول اور افسانوں کے حوالے کے بغیر لکھنا ممکن نہیں رہا۔ عصمت چغتائی کا ناول 'ٹیڑھی لکیر اور قرۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا اردو کے اہم ترین فن پاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے بیگم نذر سجاد حیدر اور بیگم حجاب امتیاز علی تاج کی تحریریں پڑھنے والوں کی توجہ حاصل کر چکی ہیں۔ مگر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور انسانوں نے قارئین اور ناقدین پر مطالعے کے نئے باب کھولے۔ عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر اور افسانہ 'لحاف' نسائی اظہار کی بہت واضح مثال ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں عصمت چغتائی نے بہت جرات سے اس نسائی شعور کا اظہار کر دیا ہے جو اس وقت تک نظر انداز ہوتا رہا ہے۔

قرعۃ العین حیدر کا ناول 'آگ کا دریا ایک ایسا ناول ہے جو پوسٹ ماڈرن فیمنسٹ نقادوں کے مطابق جن میں ژولیا کرسٹیوا سر فہرست ہیں، عورت کے تصور وقت کی مثال پیش کرتا ہے۔ قرعۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں نسائی شعور کا مکمل ادراک و اظہار ملتا ہے اور کہیں کہیں بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ اگلے جنم موہے بٹیانہ کی جیو اس کی مثال ہے۔ ترقی پسند تحریک خواتین کے لئے خصوصاً افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کے لئے بہت ساز گار ثابت ہوئی جس نے ڈاکٹر رشید جہاں، صدیقہ بیگم سہاروی، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور ہاجرہ مسرور جیسی لکھنے والیوں کو سامنے لا کر یہ غلط انہی دور کر دی کہ خواتین کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتیں۔ خدیجہ مستور کے ناول " آنگن کی پذیرائی ہوئی۔ ان کے فوراً بعد جمیلہ ہاشمی کے ناول

"تلاش بہاراں اور دشت سوس الطاف فاطمہ کا ناول " دستک نہ دو' رضیہ فصیح احمد کا ناول " آبلہ پا مقبول ہوئے۔ ہاجرہ مسرور، بیگم اختر جمال، شار عزیز بٹ، خالدہ حسین اور فرخندہ لودھی کی تحریروں نے ادبی مقام حاصل کیا۔ بانو قدسیہ اپنے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے ساتھ ادبی افق پر نمودار ہوئیں اور ایک معتبر حوالہ قرار پاہیں۔ زاہدہ حنا، رشید ورضویہ، فردوس حیدر، نیلم بشیر احمد، اور نعمت حسن افسانے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ حال ہی میں فہمیدہ ریاض کی کہانیوں کا مجموعہ خط مرموز اور عذرا عباس کا مجموعہ "راستے مجھے بلاتے ہیں" سامنے آیا ہے۔

افسانوں اور ناول میں کہانی کردار نگاری سے بڑھتی ہے اور کردار اپنے رویوں سے ابھرتے ہیں، مصنف کے تبصرے سے نہیں۔ ممتاز شیریں کا وسیع مطالعہ ان کے تنقیدی رویئے کی تشکیل میں مددگار رہے اور ان کے تخلیقی ذہن نے انہیں اس مقام تک پہنچایا جہاں نقاد اور تخلیق کار ایک ہو جاتا ہے۔ تنقید میں انہوں نے نئے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ منفی ناول (Anti Novel) وجودی نقطہ نظر مغربی رجحانات پوری تفہیم کے ساتھ ان کا موضوع بنے اور اس طرح انہوں نے اردو ادب میں نئے دریچے کھولے۔ ان کی تحریروں میں آج کے عہد کی حسیت نمایاں ہے جس میں مشرق و مغرب کا متوازن ثقافتی امتزاج جھلکتا ہے۔ آج جب کہ تنقید میں عالمی تناظر پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے ان کے مضامین کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ اردو کی پہلی نقاد ہیں جن کے یہاں عالمی تناظر ہے۔ بلاشبہ ممتاز شیریں نے تنقید کے شعبے میں خواتین کو صف اول میں لا کھڑا کیا ہے مگر ان کے بعد کوئی قابل ذکر نام سامنے نہیں آیا۔ خواتین ادیب و شاعرات کو اس جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے کہ تنقید کے شعبے کو متوازن کرنے کے علاوہ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ انہیں ایک ایسی صورت حال کا سامنا بھی ہے جو نسائی ادب کی تفہیم کے لئے بالکل ساز گار ہے۔ خواتین کی تحریروں کا بہتر تجزیہ خواتین ہی کر سکتی ہیں۔ مرد ناقدین کا رویہ یا تو سرپرستانہ ہے یا جانب دارانہ، اور یہ صورتیں تخلیقی ادب کے لئے نقصان دہ ہیں۔

بین الاقوامی صورت حال یہ ہے کہ ۱۹۶۰ء سے خواتین کی تحریک نے ادبی مطالعے کا رخ بدل دیا ہے۔ مغرب میں بھی تنقید کی ذمہ داریاں زیادہ تر مردوں کے کاندھوں پر تھیں لیکن اب جو خواتین نقاد سامنے آئی ہیں انہوں نے نسائی کلچر کو فائدہ پہنچایا ہے۔ اب تنقید خالصتاً مردانہ فلسفوں یا ادبی تھیوری کی بنیاد پر نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس نقطہ نظر سے بھی ادب کو دیکھا جارہا ہے کہ ان میں مردانہ اور نسائی اقدار کو کس حد تک سمویا گیا ہے اور نسائی تنقید ادبی تجزیے کی ایک اہم بنیاد بن گئی ہے۔ ہمارے یہاں نسائی تنقید پر سنجیدہ توجہ کی

بے حد ضرورت ہے کیوں کہ جب بھی نسائی ادب پر بات ہوتی ہے تو فوری رد عمل یہ سامنے آتا ہے کہ خواتین کا الگ ڈبہ بنایا جارہا ہے جس کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسرا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ خواتین کا مسئلہ کیا ہے ؟انہیں سب کچھ تو حاصل ہے وہ آخر چاہتی کیا ہیں ؟اور پھر اس بات پر اتفاق کر لیا جاتا ہے کہ نسائی ادب مغرب سے آنے والا فیشن ہے جسے کپڑوں اور میک اپ کی طرح خواتین نے اپنا لیا ہے۔ متعصب ناقدین جو کچھ بھی لیں اس بات کا کوئی منطقی جواب نہیں دے سکے کہ نسائی شعور کا مطالعہ کرنے والوں کو کس خانے میں رکھا جائے اور کیا خواتین کی تخلیقات کا مطالعہ سماجی اور تاریخی رویوں کو نظر انداز کر کے کیا جاسکتا ہے جو ان کی تحریروں پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور ان کی تحریروں کی جانب مرد تنقید نگاروں کے رویوں پر بھی مغرب سے آنے والی تحریکوں نے جب بھی ہمارے پورے ادب پر اثر ڈالا ہے اتنا شدید رد عمل کیوں سامنے نہیں آیا۔ مثلاً ترقی پسند جدیدیت ، وجودیت ، ساختیات کی رو کہاں سے آئی ؟ اب اگر خواتین مغرب میں لکھی جانے والی نسائی تنقید کو اپنے یہاں ادبی رویوں پر منطبق دیکھ رہی ہیں تو اسے صرف مغرب کی تقلید کہنے کا کیا جواز ہے ؟کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں خواتین کا نام نہیں ملتا ؟کیا یہ درست نہیں کہ ادا جعفری کا ذکر صرف یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ وہ پہلی شاعرہ ہیں جس نے اردو شاعری میں اپنا مقام بنایا۔ مردانہ ڈبے میں یہ مقام کہاں ہیں ؟اس پر خاموشی ہے۔

نسائی ادب، اردو ادب کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ اپنی قدیم روایات کے مطابق ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں یونیورسٹیاں، مدرسے اور کتب لڑکیوں کے لئے قائم کرو یہاں تک کہ ہندستان میں ایک عورت بھی تعلیم سے محروم نہ رہ سکے اور کوئی عورت ایسی نہ مل سکے جو اپنے بچے کو تعلیم دینے کے حق سے محروم ہو۔ اپنی ماں کی ابتدائی ہدایت کی برکات حاصل کرو اور یاد رکھو کہ اس کی مقدس رہنمائی زندگی کے پیچ دار مرحلوں میں سے صاف گزار دے گی۔ جب تک ایسا نہ کروگے تو کامیابی مشکل ہے۔ تمھاری مشکلات کا یہی اور صرف یہی ایک حل ہے۔ گزشتہ صدی کے آخری دو عشروں سے مسلمانوں میں عورتوں کی جو تعلیمی تحریک شروع ہوئی اس کی رفتار تیزی سے تو نہیں تاہم بڑھتی رہی۔ ہر جگہ ایک محدود جماعت اس تحریک کی علم بردار بن گئی۔ اس کی کوششوں اور اخبارت در سائل کے مضامین نے ان خیالات پر بہت اثر ڈالا اور اس کی مخالفت سے بھی تائید ملی جو بعض حلقوں میں جاری تھی۔ علی گڑھ کی آواز جو کانہیں اس کشمکش اور جرات کے نتیجے میں پھر عورتوں کی شرکت پر کوئی کے پلیٹ فارم سے بلند ہوتی تھی اور اخباروں کے ذریعے ہر گوشے تک پابندی نہیں رہی اور وہ آزادانہ شریک ہونے لگیں حتیٰ کر ضمنی اجلاس پہنچتی تھی کچھ کم موثر نہ ہوئی تم سب سے حکم اور زبردست اله

عالم اسلامی کی زبانہ تحریکوں کا ہوا جن کے حالات عموماً مصر و بیروت کے عربی اخبارات در سائل سے ہندوستان میں شائع ہوتے رہیں ہیں۔

نسائی شعور کی روایت ہمارے ثقافتی رجحان کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ خواتین کے اور اک و شعور کی آئینہ دار ہے۔ نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ نسائی ادب و تنقید نہ تو مغرب کی نقالی ہے نہ اس کا کوئی تصادم ہمارے اقدار سے ہے بلکہ یہ ہماری آبادی کے نصف حصے کی ذہنی و فکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ یہ خواتین قلم کاروں کے نقطہ نظر کو پیش کر رہا ہے اور آج ادب میں نقطہ نظر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد جدیدیت کے مختلف اسکول نسائی شعور کے نقطہ نظر پر متفق ہیں۔ زنانہ تعلیم کے لئے موزوں ہوں بہت کی تھی۔ اس کو پورا کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں مولانا نذیر احمد دہلوی) کی مراۃ العروس بنا البنفش محصنات، رویائے صادقہ، ایانے معرکے کی کتابیں تھیں۔ مولانا حالی نے بھی ایک یاد گار کتاب مجالس النساء لکھی تھی جو کچھ عرصے تک پنجاب کے مارس میں داخل نصاب رہی اور عرصہ دراز تک خانگی تعلیم میں اس سے بڑا نہیں پہنچتا رہا۔

مولانا سید احمد دہلوی نے بھی چند کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ نواب شاہجہاں بیگم (خلد مکان) نے ایک ضخیم کتاب تہذیب النسواں و تربیت الانسان کے نام سے تالیف کی جو بنیادی طور پر مستورارت اور بیگمات کی تعلیم و تربیت کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس دور میں متعدد اخبارات بھی اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر جاری کئے گئے۔ چنانچہ مولوی سید احمد نے لاہور سے اخبار النسا جاری کیا۔ اس حوالہ سے ایک اجلاس بھی منعقد ہوا جس میں صدر اجلاس محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار اور مولوی سید ممتاز علی نواب عماد الملک نے حصہ لیا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے بھی اپنی تقریر میں وسائل و ذرائع تعلیم اور اُستانیوں کی نایابی کا تذکرہ کیا اور آخر میں رزولیوشین اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ آپ نے تہذیب نسواں جاری کیا۔ حیدر آباد دکن سے مولوی محب حسین نے رسالہ تعلیم نسواں اور اخبار نسواں کی اشاعت کی۔ ان اخباروں نے اشاعت تعلیم میں سب سے زیادہ امداد بہم پہنچائی۔ مولوی سید احمد کی تصانیف اور اخبارات و رسائل نے عواتوں کی تعلیم میں اہم کردار ادا کیا۔

حوالہ جات

۱. اشرف، کنور محمد، ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطی میں، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۴، ص ۳۲۴

۲. وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، جولائی ۱۹۶۰۔ ص ۱۱۴

۳. یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد۔ دسمبر ۱۹۷۳، ص ۱۵۹

۴. نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۳۶

۵. قرۃالعین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳، ص ۲۰۲

۶. رازق الخیری، سوانح عمری علامہ راشد الخیری، مشمولہ: عصمت سالگرہ نمبر، شمارہ نمبر ۲،۱، جولائی ۱۹۶۴، ص ۴۶۱

۷. نذر سجاد حیدر، آہِ مظلوماں، مشمولہ: ہوائے چمن میں خیمہ ء گل، مرتبہ: قرۃالعین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴، ص ۳۸۲

۸. نذر سجاد حیدر، آہِ مظلوماں، مشمولہ: ہوائے چمن میں خیمہ ء گل، مرتبہ: قرۃالعین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴، ص ۳۷۲

۹. ایضاً، ص ۳۸۹

۱۰. ایضاً، ص ۴۱۴

۱۱. ایضاً، ص ۳۸۵

۱۲. ایضاً، ص ۳۹۶

۱۳. نذر سجاد حیدر، حرماں نصیب، مشمولہ: ہوائے چمن میں خیمہ ء گل، مرتبہ: قرۃالعین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴، ص ۳۲۲

۱۴. راشد الخیری، شامِ زندگی، عصمت بک ڈپو، دہلی، ۱۹۳۹، ص ۱۶

۱۵. رازق الخیری، سوانح عمری علامہ راشد الخیری، مشمولہ: عصمت سالگرہ نمبر، شمارہ نمبر ۲،۱، جولائی ۱۹۶۴، ص ۴۶۳

۱۶. راشد الخیری، شامِ زندگی، ص ۲۴

۱۷. حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ و تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸، ص ۳۲

۱۸. راشد الخیری، شامِ زندگی، ص ۳۹

۱۹. عبد الماجد دریابادی، مولانا، راشد الخیری کی ناول نگاری، مشمولہ، عصمت، جولائی ۱۹۳۹، ص ۲۶

۲۰. جرار نقوی، راشد الخیری کے ناولوں میں کردار نگاری، مشمولہ، عصمت ۱۹۶۴، ص ۲۶۵

۲۱. راشد الخیری، شامِ زندگی، ص ۵۲

۲۲. ایضاً، ص ۴۶۲

۲۳. راشد الخیری، شامِ زندگی، ص ۴۳

۲۴. محمد سعید، مرزا، خوابِ ہستی، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷، ص ۱۰-۱۱

۲۵. حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ و تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸، ص ۵۴

۲۶. محمد سعید، مرزا، خوابِ ہستی، ص ۱۸

۲۷. قمر رئیس، ڈاکٹر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۴، ص ۱۵۲

۲۸. رام رتن بھٹناگر، ڈاکٹر، پریم چند (ہندی)، مشمولہ: قمر رئیس، ڈاکٹر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۴، ص ۲۰۸

۲۹. پریم چند، منشی، بیوہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۵۵، ص ۱۱۲

باب چہارم:

نذر سجاد اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں کا تصور: خواتین کے سماجی کردار کے تناظر میں تقابلی مطالعہ

الف : خواتین کے سماجی کردار کی بحثیں اور ناولوں میں پیش کردہ مؤقف:

عورتوں کی حقیقی حیثیت کے تعین کے لیے قومی اور ریاستی اعداد و شمار سے مدد لینا بے معنی ہے۔ ان مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ کون کون سے گروپ ہیں جو سماجی و معاشی حیثیت یا ایک علاقے میں رہتے یا ایک مذہب رکھنے کی بناء پر حقیقت بن گئے ہیں۔ مثلاً قلت خوراک اور شرح اموات اور ایسے ہی دوسرے اعداد کی تحقیقات کے سلسلے میں اس کو جانچنا ضروری ہے کہ ان رجحانات میں کیا فرق ہے جو سماج کے مختلف طبقوں میں ملتے ہیں، اسی سے صحیح اندازہ ہو سکے گا۔ اس قسم کے جائزوں سے ہندوستان میں عورتوں اور مردوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے باہمی تناسب میں جو فرق ہے کہ اس کے وجوہ آخر میں کچھ بھی ہوں لیکن یہ سب سے بڑا اختلاف ہے کہ مجموعی طور پر ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت مرد کے مقابلے میں کم تر ہے۔

اگر خواندگی کی بات کی جائے تو ابھی تک عورتوں کی خواندگی کی ترقی مسلسل تاریک تصویر پیش کر رہی ہے۔ ان میں سے وہ خواتین جو ابھی خواندہ ہیں وہ ایسی تعلیم یافتہ نہیں جو اپنے عہد ہی کے معیار پر پوری اتر سکیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں عورت کی جو تصویر سامنے آتی ہے وہ جہان کی ایک اوسط درجے کی کمتر حیثیت کی حامل خاتون ہے، عورت کی حیثیت کو بہتر کرنے کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان کی ناکامی کا اندازہ ضروری مواقع کی کمی سے اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔ ملک کے اندر نقل مکانی مردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ ہے، جو دیہات سے دیہات اور شہروں سے دیہات میں نقل مکانی کرتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اب مزدوری کی تعریف بدل گئی ہے۔

> "لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورتوں کی مزدوری کی شرح میں برابر کمی ہو رہی ہے، اس
> میں کسی اختلاف کی گنجایش نہیں ہے"(۱)

البتہ متوسط طبقے میں مرد اور عورت کے کاموں کو واضح طور پر الگ رکھا گیا ہے۔ وہ کام جو خانہ داری سے متعلق ہیں ان میں اور وہ کام جو روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر کیے جاتے ہیں بہت واضح امتیاز برتا جاتا

ہے۔ اول الذکر کام صرف عورتوں کے کرنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ خاندانی کاروبار مثلاً پرچون کی دوکان، درزی یا بنائی کا کام کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنا اور ان کو محفوظ کرنا ان کاموں میں گھر میں رہ کر عورتیں جو مدد کرتی ہیں اس کو اضافی سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی خدمت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ان کے نام مردم شماری میں مزدور پیشہ لوگوں کی فہرست میں نہیں لکھے جاتے۔ ان طبقوں کی عورتوں کے لیے جنھیں کوئی اور کام نہیں آتا ہے اور اس قسم کے کاموں کو وہ اپنی روزی کمانے کا ذریعہ بناتی ہیں۔ یہ قابل افسوس بات ہے کہ عورتیں دوسروں کے چھوٹے موٹے کام کریں، اس سے خاندان کے وقار کو بڑھاوا نہیں دے سکتیں۔

> "آج کے ترقی یافتہ دور میں عورتوں کے لیے کرسی نشین ملازمتیں حاصل کرنے سے یہ روایتی تصور بدل رہا ہے۔ پہلے لڑکیوں کی ملازمت پر جو روک تھام ماں باپ کی طرف سے ہوتی تھی وہ بھی اب ہٹتی جارہی ہے۔ ان صورتوں میں خاص طور سے جبکہ لڑکیاں کام کر کے اپنی روزی کماتی ہیں، کبھی اپنے جہیز اور شادی کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہنوں کا بوجھ اٹھاتی ہیں اور اس لیے نچلے متوسط طبقے میں ایسی صورتیں جن میں آمدنی چلے جانے کے ڈر سے والدین ان کی شادیاں ہی نہیں کرنا چاہتے"(۲)

خوش حال گھرانوں میں نوکروں کے ہونے سے عورتوں کے گھرداری کے بوجھ میں کچھ کمی ہو جاتی ہے لیکن ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ زیادہ اچھی طرح سے گھر کا نظام چلا سکتی ہیں۔ اب اگر عورتوں کو سماج میں مردوں کی برابری کا درجہ حاصل ہوتا ہے، تو سماج کو انھیں معاشی، سماجی اور نفسیاتی تحفظ کی ضمانت دینی ہوگی۔ ان کو اس غیر مساوی اور استحصال کی بدترین شکل سے بچانا ہوگا۔ بڑے شہروں اور دوسرے شہری علاقوں میں عصمت فروشی کے پھیلتے ہوئے دائرے سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں اس کی مانگ بہت بڑھ رہی ہے دوسرے اس کاروبار کے فروغ میں بہت سے دھڑے پیدا ہو گئے ہیں، جو اس سے منافع کماتے ہیں اور اس منافع کے لالچ سے نہ صرف قبائلی عورتوں بلکہ دوسرے طبقوں کے لوگوں کو شہ ملتی ہے کہ ان عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسائیں۔ پولیس کے بڑے عہدیداروں کے مطابق قانون میں اس کمی اور پیچ امر کی وجہ سے کہ چھاپہ مارتے وقت عورت گواہوں کی موجودگی ضروری ہے، پولیس کے اختیارات اس پیشے کو دبانے کے سلسلے میں بہت محدود ہیں۔ جس معاشرے میں تبدیلیاں ہو رہی ہوں اور جس

کے اندر آپس میں تہذیبی اختلافات ہوں، سماجی اداروں اور قدروں کو بدلتی ہوئی ضرورت کے مطابق بنانے کی رفتار سست ہو تو اس میں طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے میں لوگوں کے رویے میں ایک ایسی کج روی نظر آتی ہے، کہ جنھیں سماجی، معاشی نظام کے ڈھانچے میں تبدیلی لائے بغیر دور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسائل عصمت فروشی، قیدی عورتوں، کنواری ماؤں اور ضعیف عورتوں کے مسئلوں پر مشتمل ہیں۔

یہ درست ہے کہ سماج کے ادارے اور رویے تیز نہیں مگر عورتوں کی فلاح وترقی کے عمل میں تیزی اس طرح سے لائی جا سکتی ہے کہ ان میں سوچ بچار کے بعد منصوبہ بندی کی کوششیں کی جائیں۔ اس کی ذمہ داری ریاست سماج اور ان سب لوگوں پر یکساں عائد ہوتی ہے، جو عورتوں اور مردوں میں مساوات کے قائل ہیں۔ ان سب کو تاکید کی جائے کہ وہ اس بارے میں رائے عامہ کو ہموار کریں اور ان کوششوں کو تقویت پہنچائیں جو کئی طرح کے رواجوں، جیسے کم سنی کی شادی، تعدد ازدواج، جہیز اور شادی میں لیے جانے والے اصراف کے انسداد کے لیے کی جا رہی ہیں۔ اور انھیں بڑھاوا دینا چاہیے کہ عورتوں میں اپنے قانونی حقوق کا زیادہ سے زیادہ شعور ہو۔ اخبار، ریڈیو، فلم جنھوں نے اب تک لوگوں کی توجہ صحیح رخ کی طرف موڑنے کی کوشش نہیں کی ہے؛ عورتوں کو ان کے حقوق و فرائض کے بارے میں بنیادی معلومات بہم پہنچانے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے؛ انھیں اس پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ اس معاملے میں زیادہ سرگرمی دکھائیں۔ خاص طور پر فلم بنانے والوں اور اشتہار دینے والوں کے خلاف ان شکایات پر بھی توجہ دینا چاہیے جو ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے عورت کا ذلت آمیز تصور پیش کرتے ہیں۔ اس طرح کہ وہ عورت کا محض جنسی پہلو دکھاتے ہیں، جس سے جنسی جرائم اور بے راہ روی کو شہ ملتی ہے اور عورت کی سماجی حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

ب: روایتی سماج میں خواتین کی سماجی حیثیت و کردار:

"سماج" سنسکرت زبان کا لفظ ہے جو اس زبان کے دو الفاظ سے مل کر بنتا ہے یہ لفظ ہیں سم" اور" آج"۔ "سم" کے معنی ہیں مجتمع، اکٹھا یا ایک ساتھ اور "آج" کے معنی ہیں رہنا۔ یعنی سماج کے لغوی معنی ہیں ایک ساتھ رہنا۔ سماج کے لیے انگریزی میں "Society " لفظ کا استعمال ہوا ہے لفظ Society لاطینی زبان کے Socias سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اکٹھا ہونا۔ اس خیال سے جہاں افراد ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں وہیں سماج بن جاتا ہے۔ مارس گینسبرگ (Morris Ginsberg) کے الفاظ میں:

"سماج افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو مخصوص تعلقات اور برتاؤ کے طریقوں میں
بندھے ہوئے ہوتے ہیں اور اسی بنیاد پر ان دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں
جو ان تعلقات کو اختیار نہیں کرتے یا جو ان میں سے الگ ہیں"(۳)

اس طرح گنبرگ (Morris Ginsberg) اور گڈ نٹس (Giddings) اس امر پر متفق ہیں کہ سماج انسانوں کا ایک منتظم گروہ ہے جس کے اغراض و مقاصد میں مماثلت اورمشابہت پائی جاتی ہے۔مادری نظام کے حامل سماج میں بعض باتوں میں کچھ لازمی تضاد پائے جاتے ہیں۔ اقتدار خاندان میں مردوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے لیکن گروپ کا تین عورتیں کرتی ہیں۔ شوہر بیوی کی برادری میں شامل نہیں کیا جاتا ہے اور بیوی بچوں پر اس کے حقوق کم سے کم ہوتے ہیں۔ جائداد پر بیوی کے باپ بھائیوں یاماموں چچاکا کنٹرول ہوتا ہے۔ بیٹے کی ضرورتوں کے تحت نقل مقام اور معیشت کے نظام کی تجدید کے نتیجے میں اگر بیوی بچے ساتھ ہوں تو ان پر شوہر کے حقوق بڑھ جاتے ہیں، لیکن اس کی وجہ سے مادری نظام میں خلل پڑتا ہے، نائو اور ترار بدوں کا توشیرازہ ہی بکھرتا نظر آتا ہے، کچھ تو سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے اور کچھ شادی کے قوانین نے ہر فرد کو یہ حق دیدیا ہے کہ املاک سے وہ اپنے حق کا مطالبہ کرسکتا ہے، عورتوں نے تعلیم کے مواقع سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس بناء پر کہ وہ صاحب ملکیت اور نسل کی پالنے والی ہیں بدستور حرمت دی جاتی ہے بر خلاف اور مادری نظام رکھنے والی قوموں کے قائد عورتوں پر ایک خاص قسم کی پابندیاں تھیں جو انھیں گھر میں رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ دوسرے انھوں نے شادی کے برہمنی طور طریقے، جیسے جہیز کا دستور اختیار کر لیا ہے، اس لیے سوچ میں ان کی حیثیت کم ہوگئی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کی آبادی کی اکثریت پوری سلسلہ نسب کے نظام کی پدری نظام پر ہے۔ مرد کو نسل اور خاندان کے نام کو اونچا رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کا جہیز دوسرے خاندان میں چلا جاتا ہے۔ اس لیے نظام میں اس پر زور ہوتا ہے کہ شادی کے وقت لڑکی اپنے شوہر کی برادری میں منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کا اثر عورت کی سماجی حیثیت اور قانونی حقوق پر پڑتا ہے۔ صرف بیٹا ہی اپنے خاندان کے لیے ضروری مذہبی رسمیں ادا کرسکتا ہے۔ سماجی اور تہذیبی دباؤ کی وجہ سے لڑکی کا شادی کرنا لازمی ہے۔ ہندوستانی سماج کی توقع کے مطابق خواتین اپنے متعدد رول ادا کرسکیں۔ دستور نے عورتوں کو جن حقوق اور مواقع کی ضمانت دی ہے ان کی اکثریت اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہی ہے۔ جہیز اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا بڑھتا ہوا رواج جن سے عورت کی سماجی حیثیت گھٹ جاتی ہے؛ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تحریک آزادی کے زمانے میں

عورتوں کی حیثیت کے جو معیار قائم ہوئے تھے وہ اب رجعت کی طرف مائل ہیں۔ پچھلی دو دہائیوں میں عورتوں اور ان کے مسائل کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔

I- ہندو اور دیگر مذہبی سماج میں خواتین کی سماجی حیثیت:

ہندو سماج میں جو احتجاجی تحریکیں چلیں، جیسے بدھ مت، جین مت، کینوست دبیر شورت، اور سکھ مت ان کے اثر سے ملک کی سماجی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ خاص طور سے روحانی رسوم وعبادات کے معاملے میں مگر ان کے یہاں بھی عورت کا بنیادی کردار ماں اور بیوی کا رہا۔ مرد کے مقابلے میں عورت کا درجہ کمتر ہی رہا، بدھ مت میں بھکشی کے مقابلے میں بھکشو کی حیثیت اونچی ہے لیکن جین مت میں ان کو خوب برا بھلا کہا گیا ہے ۔اگرچہ اجتماعی زندگی میں ان کو جائز مقام دیا گیا۔ ویرشیو مت میں عورت کو طلاق اور دوبارہ شادی کی اجازت ہے۔ چونکہ بھگتی تحریک نے بغیر کسی وسیلے کے عورت کو روحانی تسکین حاصل کرنے کی اجازت دیدی۔ اس میں نہ ہی تعلیم مادری زبان میں دی جاتی تھی اس لیے عورتیں اس قابل ہو سکیں کہ سنت سادھو اور نہ ہی رہنما بن سکیں۔

بہر حال یہ تحریکیں بھی سناتن دھرم اور دوسرے چھوٹے چھوٹے فرقوں نے عورت کو جو کمتر درجہ دیدیا اس میں کوئی قابل ذکر اصلاح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور بعد میں جو مذاہب آئے جیسے اسلام، عیسائیت اور زرتشتی مذہب۔ وہ عورت کے بارے میں اپنے الگ تصورات رکھتے تھے۔ لیکن یہاں رہ کر انھوں نے بھی اپنے کو ہندوستان کے ماحول کے مطابق کر لیا اور اکثر صورتوں میں انھوں نے ان رسم ورواج کو اختیار کر لیا جن کا عام چلن تھا۔ ذات اور خاندان کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے عورتوں پر بہت سی پابندیاں ہیں لیکن جن مذاہب اور قوموں میں عورتوں کو نقل وحرکت کی زیادہ آزادی حاصل رہی ہے اس لیے وہ روزی کی فراہمی میں مدد کرتی ہیں۔ عورتوں کی اس جہد مسلسل کو ادیب ایک مختلف نظریہ زندگی قرار دیتی ہیں اس زندگی ہی کو ادب کا ساتھی بتایا ہے۔ اطہر پرویز نے ادب اور زندگی کو ہمسفر قرار دیتے ہوئے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:-

> "انسان نے جب تہذیبی اور تمدنی زندگی کی طرف قدم اٹھائے تو ادب نے انسان کی مدد کی۔ چنانچہ زندگی کے اس قافلہ میں ادب کی حیثیت مسفر کی بھی رہی ہے اور راہبر کی بھی ہے"[۴]

II۔اسلام میں خواتین کی سماجی حیثیت و کردار

مطالعہ ءدین اسلام سے واضح ہوتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے کو فطری تقاضوں کی روشنی میں ارتقاء کے اصول فراہم کرتا ہے۔ معاشرتی ترقی میں چاہے اس کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبے سے ہو کسی طرح کے جنسی امتیاز کو روا نہیں رکھتا۔ اس نے تو عورت اور مرد دونوں کو سماجی زندگی میں مساوی مقام دیا ہے، دونوں کے لئے ترقی کی راہیں یکساں طور پر متعین کی ہیں، دونوں کو تعلیم و تعلم، اجتماعی زندگی کے تمام امور میں انہیں یکساں ذمہ دار قرار اور حق دار قرار دیا ہے۔ اور ہر طرح کے قبائلی اور علاقائی رجحانات کو اپنا کر انسانی حقوق کی کسی بھی خلاف ورزی کو جائز قرار نہیں دیتا۔ معاشرتی زندگی میں اسلام مرد و خواتین کو برابر حقوق عطا کرتا ہے اس حوالے سے قرآن حکیم کا ارشاد ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۔

عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں"۔ (۵)

درج بالا آیت کریمہ پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رفیع اللہ شباب تحریر کرتے ہیں:

"ان حقوق کی وجہ سے عورت کو اجازت دی گئی کہ وہ کام کاج کی غرض سے گھر سے باہر جا سکتی ہے اور کاروبار زندگی میں حصہ لے سکتی ہے اس سلسلے میں مردوں کو یہ تاکید گئی ہے: کہ جو مسلمان عورتیں کام کاج کے لئے گھروں سے باہر تھیں انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔"(۶)

معاشرے کی تمدنی ترقی کے لئے محنت کرنا ایک فطری عمل ہے جو انسانوں کے لئے ضروری ہے مرد ہو یا عورت دونوں کی برابر ذمہ داری ہے کہ معاشرے کی فلاح و بہود کے لئے کام کرے چاہے وہ معاشیات اقتصادیات کا میدان ہے یا کوئی اور معاشرتی ضرورت کا میدان، خواتین بھی معاشرے کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ قرآن حکیم فطرت کے آفاقی اصولوں کے مطابق معاشرے کو پروان چڑھانے کے اصول مہیا کرتا ہے ان فطری اصولوں کی روشنی میں عصری تقاضوں اور تغیر پزیر حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے قوانین وضع کرنا یہ فقہا کی ذمہ داری ہے۔ خواتین کی ملازمت کے مسئلے کے حوالے سے بھی قرآن حکیم کی اساسی فکر اور روح سے رہنمائی لے کر آج کے دور کے صنعتی اور ٹیکنالوجی کے ارتقاء سے دوچار معاشرے کے تقاضوں کے مطابق قانون سازی کی جا سکتی ہے اور خواتین کے لئے نئے اقتصادی نظاموں میں اس طرح کا سیٹ اپ بنایا جا سکتا ہے جس کے ذریعے ان کی معاشی خود کفالت اور استحکام بھی ہو سکے اور انہیں ہر طرح کا سماجی تحفظ بھی

حاصل ہو سکے اور خواتین قرآن کی اصل روح کے مطابق آزادی اور خود مختاری کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں استوار معاشرے میں خواتین تمدنی زندگی کے ارتقاء میں بھرپور کردار کرنے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہوتی ہیں۔

اسلام نے عورتوں کی جدوجہد کو فقط علمی اور فکری حدود میں بند نہیں کیا بلکہ اسے عملی میدانوں میں جدوجہد کی وسعت پذیر فضا مہیا کی ہے اسے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ صنعت، تجارت اور تداعت وغیرہ کے میدانوں میں ترقی کر سکتی ہے اس کو مختلف پیشے اور ملازمتیں اختیار کرتی اور قومی خدمات انجام دینے کی مکمل اجازت دی گئی ہے اسلام کے اولین معاشرے میں اس کی مثال موجود ہے آنحضرت نے جس معاشرے کی بنیا در کھی وہاں خوشی کو دور جہالیت کی رسومات اور جمود سے نکال کر انہیں مردوں کے ساتھ قومی ہی تعمیر وترقی میں بارشرکت کے لئے تیار کیا۔ انہیں اعتماد مستقل مزاجی اور مختلف فنون انھیں حاصل کرنے کی آزادی عطا کی، آپ کے اقوال اور عمل اس کا ثبوت ہے۔

عہد نبوی کا عہد نبوی میں ہجرت کے بعد رسول کریم علیہ التحیہ والسلام تعلیم نے خود ہی مسلمانوں کا ایک نظام تعلیم قائم فرمایا تھا جس کی نظارت بھی اپنی ہی ذات مقدس سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نظام تعلیم میں عورتوں کی تعلیم بھی داخل تھی۔ ہفتے میں ایک دن آپ عورتوں کے خصوصی مجمع میں تشریف لے جاتے ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کے جواب دیا کرتے۔ ایک حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک خاتون سے خواہش فرمائی کہ وہ آپ کی ایک بی بی کو لکھنے پڑھنے کی تعلیم دیں۔ آپ کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہ کو فقہ اور دیگر اسلامی علوم، نیز ادب، شاعری اور طب میں بڑا دخل تھا یہاں تک کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ آدھا علم عائشہ سے حاصل کرو۔ اہل بیت ازواج مطہرات میں حضرت حفصہ اور حضرت ام سلمہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں حضرت حفصہ نے یہ فن خاص آنحضرت ﷺ کے حکم سے شفا بنت عبد اللہ عد سے سیکھا تھا۔ حضرت فاطمہ علاوہ علومِ قرآن وحدیث کے فصاحت و بلاغت اور عروض میں ماہر تھیں اور فصیح و بلیغ تقریر کرتی تھیں۔ اسی طرح ان کی صاجزادیاں حضرت زینب اور حضرت کلثوم اور پوتیاں حضرت سکینہ فاطمہ صغریٰ بھی زیور علم سے آراستہ تھیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ (جن سے آنحضرت ﷺ نے حصول علم کی ہدایت فرمائی تھی) اسلام میں سب سے پہلی معلمہ تھیں۔

آٹھویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامہ میں (جس کا اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے) ایشیاکے کوچک کے مشہور سلطان محمد اوزبک خاں ترکی کے تذکرے میں حرم سلطانی کے جو حالات لکھے

ہیں ان میں اس بات پر اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ان ممالک میں عورتوں کو غیر معمولی عظمت حاصل ہے اور وہ مردوں کے مقابلہ میں زیادہ شان و شوکت رکھتی ہیں۔ اس نے سفر میں بیگمات کی سواریوں کے جلوس اور ان کی خدمت میں اپنی باریابی و مفصل تذکرہ کیا ہے۔ ایک خاتون کی ملاقات کے بیان میں لکھتا ہے:(وہ ایک خاتون) ایک مسند پر بیٹھی ہوئی قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ میں نے اسے سلام کیا اس نے بہت اخلاق سے سلام کا جواب دیا اور مجھ سے ہم کلام ہوئی۔ ہمارے ساتھ جو قاری تھا اس نے قرآن پڑھا تو خاتون نے اس کی بہت تعریف کی۔ بنت السلطان کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے: جب میں اس کے پاس حاضر ہوا تو اس نے فقہا، قضا، جماعت طلبا مشائخ، فقرا در سید شریف ابن عبد الحمید کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اس کا شوہر امیر عیسی بھی حاضر ہوا اور ایک ہی فرش پر خاتون کے پاس بیٹھا۔ میں نے اس خاتون میں طرح طرح کے مکارم و محاسن اخلاق دیکھے۔ ابن بطوطہ نے عام دربار اور دربار عید وغیرہ کی عظمت اور ترتیب کا نظارہ بھی دکھایا ہے۔ جس میں خواتین اور بنت السلطان بھی شریک تھیں اور لکھا ہے کہ یہ سب مراسم بلا پردہ برائے العین لوگوں کے سامنے ادا ہوتے ہیں نیز یہ کہ خواتین شاہی کے جملوں عورتیں گھوڑوں پر سوار چلتی ہیں۔ اس سفر میں وہ خوارزم بھی گیا جہاں امیر کی بیگم خاتون صالحہ تراب نے اس کی دعوت کی۔ دعوت کے حال میں لکھتا ہے: اس دعوت میں تمام فقہا اور مشاہیر شہر جمع ہوئے تھے۔

میری یہ دعوت اوزبک نے اپنی خانقاہ میں کی جس کو اس نے بنوایا تھا اور جس میں ہر وار د و صادر کو کھانا دیا جاتا ہے؟ ایران کی تاریخ میں بھی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے شواہد موجود ہیں۔ ہم دور نہیں بلکہ قریب زمانہ کی دو خواتین کو پیش کرتے ہیں:۔ ضیاء السلطنت، فتح علی شاہ کی لڑکی تھی۔ تحریر و تقریر میں یگانہ روزگار تھی۔ احکام خاقانی کے جو خط ہوتے تھے اس کے قلم سے ہوتے تھے۔ مریب کی قابلیت اور کمالات کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ المعتز باللہ عباسی نے جو فن بدیع کا موجد اور عرب کے شعرا کا خاتم ہے مریب کے حالات میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ مامون کی ایک دوسری کنیز جس کا نام "بذل" تھا موسیقی کے مشہور استادوں میں تسلیم کی گئی ہے۔ علامہ ابوالفرج اصفہانی نے مریب وبدل کے دل آویزہ حالات کے لئے اپنی بے نظیر کتاب الاغانی کے میلوں صفحات نذر کئے ہیں۔ تعلیم یافتہ کنیزیں عموماً امراء وخوش حال لوگوں کے حرم میں داخل تھیں اور چونکہ ان کے حقوق معاشرت عملی طور سے ہر خاندان میں اصلی ازواج کے برابر بلکہ بڑھ کر تھے اس لئے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور آزادی کا مسا بہت کچھ ان کی بدولت حل ہو گیا تھا۔ "خواتین کے علم مراتب کمالات بوران خلیفہ مامون الرشید کی بیگم زیر دست عالم تھی۔ یونانی اور لاطینی زبانوں پر قدرت تھی۔

فلس یونان کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا علم ہیئت میں بھی کال تھی اور تعمیر کردہ رصد گاہ میں اجرام فلکیہ کا مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ استنصر باللہ کے زمانے میں عورتوں کی تعلیم عام تھی۔ ایکئے۔ جو پوری عالم حساب اور دیگر فنون میں ماہر تھی اچھی مصنف تھی اور خوشنود میں نیکتا تھی۔ شاہی صیغہ راز کی مراسلت لکھنے پر مامو سیقی یعض خوشنویس خواتین اپنے ہاتھ سے کتاب وکتابہ لکھ کر بطور تحفہ دوربار میں پیش کرتی تھیں۔ ایک خاتون، قاذفہ بنت جعفر نامی نے ایک بڑا ذخیرہ کتب جمع کیا تھا بنت ابی یعقوب مشہور علمہ تھی اس کا ایک مدرسہ تھا جس ہیں لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں۔ رضیہ جو نجم سعیدہ کے لقب سے مشہور تھی شاعر ہونے کے علاوہ فن تاریخ میں امتیاز کھتی تھی۔ اس نے سفر بھی کئے اور علما فضلا سے ملاقاتیں بھی کیں اور ان کو اپنی قابلیت کا معترف بنایا۔

پانچویں صدی میں شیخہ سیدہ فخر النسا جامع مسجد دادمی نمایند حاضرین کے روبرو علم کلام، شاعری اور ادب پر بڑے بلیغ خطبے دیا کرتی تھی جن کی وجہ سے اس کا خطاب فخر النسا ہو گیا۔ کان پور میں ایک نیک دل خاتون عائشہ بی بی نامی کا مکتب محلہ مینا بازار میں تھا جس میں وہ خود قرآت کے ساتھ لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں۔ تا ہم ایک خاندان میں چند عورتیں بخوبی پڑھی لکھی تھیں اور عربی کی نہ ہی کتابیں بذریعہ ترجمہ پڑھی تھیں۔ بہت سی لڑکیاں کو قرآن مجید کی تعلیم دیتی تھیں کتب دینی بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ لڑکیاں گھروں میں عمدہ طریقے پر پڑھتی تھیں۔ کسی غریب سے ایک پیسہ بھی نہ لیتی تھیں بلکہ غریب لڑکیوں کی اپنے پاس سے مدد کرتیں۔ انہوں نے چار ہزار روپے کی جائداد مکان اور دکانیں بھی اسی مقصد سے وقف کیں۔ غالبا تعلیم نسواں کے لئے وقف کی یہ پہلی شان تھی۔ چین میں ایک بزرگ حکیم سید احمد حسین صوفی نے مشنریوں کی سرگرمی اور اس کے نتائج سے ماشہ ہو کر لڑکیوں کی تعلیم میں زبردست کوششیں کیں ایک مدرسہ قائم کیا۔ ایک طریقہ تعلیم ایجاد کیا اور اس کے مطابق کتابیں تصنیف کیں ترجمہ قرآن مجید کیا صرف ونحو ک دو منظوم رسالے لکھے بیبین لڑکے اور لڑکیاں ایک سال سے لے کر تین سال تک کی مدت میں کلام مجید یا ترجمہ پڑھنے لگے۔ اس کے علاوہ اردو اور مذہبی تعلیم بھی تھی۔ اکثر اصحاب نے لڑکیوں کا امتحان لیا جو پانچ سال سے آٹھ سال تک عمر کی تھیں۔

سرسید نے بھی زمانہ قیام پٹنہ میں اس طریقہ تعلیم کا معائنہ کیا۔ ضلع علی گڑھ کی رپورٹ خود سرسید نے مرتب کی تھی جو سب سے زیادہ فیصل تھی۔ سرسید لکھتے ہیں کہ نسبت اور قوموں کے شروانی پٹھانوں میں عورتوں کی تعلیم کا زیادہ رواج ہے جو کسی قدر آسودہ بھی ہیں۔ توجہ کرتے ہیں۔ عورتیں قرآن مجید اور اردو اکثر پڑھی ہوئی ہیں متوسط درجے کے لوگوں میں اُستانیوں کے نوکر رکھنے اور پڑھانے کا رواج ہے۔ معزز خاندانوں

میں ایسی عورتیں بھی موجود ہیں جو سوائے امرود کے فارسی کی سلیس کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ دو تین عربی بھی پڑھی ہوئی ہیں۔ شروانی پٹھانوں کی خواندہ عورتوں کو عموماً لکھنا نہیں آتا مگر اب اس کا بھی رواج ہوتا جاتا ہے۔

مذہبی روایات کا عورت کے رول اور حیثیت پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہندو مذہب میں بے شمار عیوب عورتوں سے منسوب کر دیے گئے ہندو مذہب ہیں۔ ان کو بھی شدروں کی طرح ویدوں کو پڑھنے کی اور قربانی میں حصہ لینے کی ممانعت ہے۔ مددھرم شاستر کی رو سے بچپن میں عورت کو باپ کے زیر فرمان بہ بنا چاہیے، جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے انتقال کے بعد بیٹوں کے وہ خود مختار کبھی نہیں رہ سکتی۔ اس کا تصور محض ماں اور بیوی کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اور اس کے یہی رول مثالی سمجھے جاتے ہیں۔ ایک مثالی ہیرو، وفادار اور بے زبان ہوتی ہے۔ اس کا محرم شوہر کی خدمت ہے۔۔ لڑکی کی شادی میں کنیا دان اور بیٹوں کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ ان سے نسل چلتی ہے۔ اس قسم کی چیزوں نے ہندو مذہب کے پدری سماجی ڈھانچے کو تقویت دی ہے۔ ماہواری اور زچگی کے زمانے میں عورت کے ساتھ نجاست کا تصور وابستہ کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اوند اسی رسومات میں حصہ نہیں لے سکتی ہیں۔ ان پابندیوں سے اس تصور کو تقویت ملتی ہے کہ فطری طور پر عورتیں مردوں کے مقابلے میں کمتر ہیں۔ چونکہ عورت کے لیے شادی کرنا اور ان بنا لازمی ہے اس لیے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بیٹوں کی سلامتی و حفاظت کے لیے برت رکھے۔ دوسری طرف بیوہ کے ساتھ بدقسمتی کا تصویر وابستہ ہے اور اس کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ وہ سماجی اور مذہبی تقاریب میں حصہ نہیں لے سکتی۔ اس لیے کہ اس کی منجو بیست دوسروں کو نہ لگ جائے۔ ساتھ دھرم کی رو سے اونچی ذات کی بیواوں کو دوبارہ شادیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ قانونی طور پر ان کو اس کی اجازت مل گئی ہے۔ یہاں شوہروں کو دوسری شادی کی اجازت ہے، وہاں اس پر دوسری طرف پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ مثلاً دوسری شادی اہتمام اور دھوم دھام سے نہیں ہوتی ہے

ج: جدید سماج میں خواتین کی سماجی حیثیت:

معاشرے میں عورت کا تصور کسی بھی فرد کے لیے معاشرے میں اپنی شناخت اور اپنا مشخص کرانا آسان کام نہیں، قدم قدم پر دیگر افراد کے شخصی رویے، سماجی ضوابط، علی اقدار، اخلاقی معائیر، ملکی قوانین اور مذہبی اور امر دوشی مراسم ہوتے ہیں۔ یوں فرد خود کو مختلف النوع پابندیوں میں جکڑا محسوس کرتا ہے۔ قطع نظر اس امر سے کہ ان میں سے کتنی جائز اور واجب ہوتی ہیں اور کتنی بر عکس۔۔ مگر ایک خاص نوع کے معاشرے میں زندگی بسر کرنے والا فرد نہیں ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں قبول کیے جانے کے لیے

اتنی قیمت تو بہر حال ادا کرنی ہی ہوتی ہے۔ عورت اس معاملے میں اور بھی زیادہ مجبور، بے بس اور پا بہ زنجیر ہوتی ہے جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے سماج، گھر، رشتوں حتی کہ وجود تک کی تشکیل مرد کے ساختہ قواعد و ضوابط، مرد کی عاید کردہ پابندیوں اور قدغنوں اور مرد کے مدون کردہ قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ عورت کے انفرادی وجود کی اساس اس کی شخصیت کی نمو اور ذات کی متنوع جہات کے فطری تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کے بجائے اسے ایسے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے یا اس سے ایسے سانچے میں ڈھلنے کی توقع کی جاتی ہے جو ہر لحاظ سے مرد کے لیے سود مند ہوتا ہے۔ معاشرے کی "نیک پروین" سے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ مرد کے لیے محبوبہ سے لے کر باندی تک ہر کردار خوشی خوشی اور خوش اسلوبی سے ادا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ اس مقصد کے لیے اس رشتوں سے غیر مرئی. زیورات پہنائے جاتے ہیں وہ ماں، بہن، بیٹی، بیوی جو کچھ بھی ہو ہمیشہ مردانہ خواہشات کے تابع رہتی ہے۔ اس لیے ہمارے معاشرے میں عورت کا بحیثیت دوست تصور مفقود ہے۔ دوستی یک طرفہ نہیں، دوطرفہ ہوتی ہے اور دوستی میں جذباتی لین دین برابری کی سطح پر ہوتا ہے جبکہ بقیہ تمام پاکیزہ اور خوبصورت رشتوں میں مرد فائدے میں اور عورت خسارے میں رہتی ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر خاندانی تنظیم مشترکہ خاندان کی صورت میں نظر آتی ہے جو مردوں پر مشتمل ہے۔

ان کا حق ملکیت مادی اور آمدنی و خرچ کا بجٹ مشترک ہوتا ہے۔ ساتھ رہتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ اگر چہ یہ طرز زندگی نئے زمانے کے طور طریقوں، شہروں میں سکونت اختیار کرنے اور سماجی و معاشی تبدیلیوں سے بہت کچھ متاثر ہوا ہے۔ مشترکہ خاندان کا طرز زندگی زیادہ تر زمینداروں کاروباری لوگوں، اور دوسری اونچی ذاتوں کے خاندانوں میں پایا جاتا ہے۔ قبائلی لوگوں میں جداگانہ گھر بار کا طریقہ خاندانی تنظیم کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ اپنے آپ کو وہ سسرال کے طریقوں کے مطابق ڈھال لے جہاں وہ شادی کے بعد جا کر رہتی ہے۔ سسرال میں اس پر کئی قسم کی پابندیاں لگا دی جاتی ہیں، گھر کے اہم فیصلوں میں اس کا بہت کم یا بمشکل دخل نہیں ہوتا ہے۔ وہ بلا واسطہ اپنی ساس کے تابع فرمان رہتی ہے۔ گھر میں اس کی حیثیت اس پر منحصر ہوتی ہے کہ گھر کی آمدنی میں اس کے شوہر کا کتنا حصہ ہے۔ اونچے اور متوسط طبقے میں اس کا ابھار اس پر ہوتا ہے کہ وہ جہیز کتنا لائی ہے۔ متوسط طبقے میں بڑی بوڑھی مائیں عزت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ خاندان کے اہم فیصلوں میں ان کی رائے مانی جاتی ہے۔ ہمارا پس ماندہ معاشرہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ اور غیر تخلیقی ہونے کی بنا پر ذہنی بنجرپن کا شکار نظر آتا ہے۔ اس پر مستزاد ملایت اور بنیاد پرستی کے

منفی مظاہر۔ جن کے منفی کردار کے لیے خصوصی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اخبارات ہی گواہی کو کافی ہیں۔

شہروں میں تو صورت حال قدرے بہتر ہو گئی مگر جاگیر داری نظام کی وجہ سے دیہات میں جو روح فرسا حالات ملتے ہیں عام شہری ان کی شدت اور جبر کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتا۔ مذہبی منافقت اور قول و فعل کے تضادات نے بھی اب اہم سماجی وقوع کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اگرچہ ایسی صورت حال ے معاشرے میں بھی پریشان ہوتے ہیں مگر عورت کا مسئلہ اس بنا پر مزید شدت اختیار کر جاتا ہے کہ خود مرد بھی تو اس کے لیے ایک مسئلہ ہوتا ہے یوں عورت ہمیشہ معاشرے اور مرد کی چکی کے دو پاٹن بیچ پستی رہتی ہے۔ تخلیقی عمل اور خواتین تخلیق کار معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے اس لیے وہ سب کے لیے چشم و گوش اور دست ولب کا کردار ادا کرتا ہے۔ اسے یہ کردار سمجھتا بھی ہے کہ وہ دل دردمند اور حساس شخصیت کا حاصل ہوتا ہے۔ ہر چند کہ تخلیقات اور تخلیق کاروں کو ادب کی زیل کے زنانہ اور مردانہ ڈبوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا تاہم وجودِ زن کی تصویر کے متنوع رنگوں کے مطالعے کے نکتہ نظر سے خواتین اہل قلم کی تخلیقی کاوشوں کا مطالعہ۔ گھائل کی گت گھائل جانے۔ کے مصداق زیادہ موثر معنی خیز اور زیادہ پر بصیرت نظر آتا ہے اور اسی لیے "پاکستانی ادبیات میں خواتین کا کردار" کے ضمن میں خصوصی مطالعے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے تا کہ کورس میں شریک طلبہ و طالبات کو اس امر کا ادراک ہو سکے کہ خواتین افسانہ نگاروں کی تحریروں سے تشکیل پانے والے "آئینہ" میں پاکستانی عورت کے جو نقوش ابھرتے ہیں۔۔۔ کیا دلکش اور دل آویز ہیں یا مسخ اور مریضانہ؟ ان افسانوں کے مطالعے سے کسی حد تک یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستانی عورت اس معاشرتی صورت حال میں خوش، مطمئن اور آسودہ ہے یا دکھ اندوہ اور حزن میں زندگی بسر کرتی ہے؟ اس کے نفسیاتی مسائل کیا ہیں؟ اس کی جذباتی الجھنوں کی نوعیت کیا ہے؟ اس کے ہیجانی تموجات میں کیسے مدوجزر اٹھتے ہیں اور جسمانی عدم آسودگی کے نتیجے میں وہ کیسے اعصابی کرب.ے دوچار ہوتی ہے؟ الغرض! ان افسانوں کا موضوع ہے۔ عورت۔ اپنے انگ، رنگ اور ڈھنگ کے ساتھ۔ اب یہ الگ بات کہ بعض صورتوں میں یہ افسانہ محدب شیشہ ثابت ہوتے ہیں تو بعض اوقات ان پر نقوش مسخ کرنے والے آئینوں کا گمان بھی ہوتا ہے۔

ایک طویل زمانہ جس میں عورتوں نے سماجی زندگی کی بھاگ دوڑ سنبھالی ہوئی تھی اس وقت مرد بھی اس تگ و دو میں تھے کہ کسی طرح عورت کی اس مرکزیت کو معاشرے سے ختم کر دیا جائے۔ دراصل مرکزیت کی اسی کش مکش نے مادری نظام کو ختم کر کے پدری نظام کی داغ بیل ڈالی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب

معیشتیں بہتر ہونے لگیں اور مردوں نے رفتہ رفتہ معاشی وسائل پہ قبضہ جمانا شروع کیا اور پھر اپنی طاقت کو جمع کر کے سب سے پہلے عورت کو اقتدار سے بے دخل کیا اور پھر اس کی مرکزیت کو معاشرے سے ختم کرنے کے لئے مذہب، توہمات، نظریات کے ملغوبوں کو استعمال کرتے ہوئے ایک ایسی بساط بچھا دی جس کے تحت عورت کو پیدائشی گنہگار، شیطان کی آلہ کار، اور کم تر درجے کی مخلوق قرار دیا۔ اور اس پر سچائی کی مہر ثبت کرنے کے لئے مذاہب کے اعلانات کئے گئے، مذہبی کتابیں بنائیں گئیں، فلسفے اور دیومالائی کہانیاں گھڑی گئیں، امتیازی قانون بنائے گئے اور ان سب کو خدا کے ساتھ منسوب کر کے معاشرے کو ایک نئی ڈگر پہ ڈال دیا گیا جہاں مرد کے مقابلے میں عورت کی حیثیت کو کمزور بنا دیا گیا۔ مردوں نے عورت سے اقتدار چھینا، مرکزیت چھینی، عزت و ناموس چھینی اور پھر اس پہ بھی انہوں نے صبر نہیں کیا، بلکہ اب ایسی اقدار، ایسی تہذیب متعارف کروادی جس کے تحت انسان کا لفظ صرف مرد کے وجود ہی پر پورا اترتا ہے، عورت کو ناقص جنس قرار دیا گیا۔ یہ سب کچھ عقیدوں میں ڈھالنے کے لئے ریاستی نظاموں، مذہبی کتابوں، ملکی قوانین کو استعمال کیا گیا۔ مشرقی و مغربی معاشرے میں عورت کے استحصال کی نوعیتیں: دنیا بھر کے اخبارات و الیکٹرانک میڈیا عورتوں پہ مظالم کے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں، یہ وہ واقعات ہیں جو رپورٹ ہوتے ہیں، ایسے لاتعداد واقعات اور سانحات ہو رہے ہیں جو میڈیا کی رسائی سے دور ہیں، ایسے ایسے مظالم ڈھائے جاتے ہیں کہ روح کانپ جاتی ہے ان واقعات سے ایسا لگتا ہے کہ عورت کی عزت، عصمت اور جان کی کوئی اہمیت نہیں۔

> "پسماندہ معاشروں میں سے ایک ہمارا معاشرہ بھی ہے جہاں حالت یہ ہے کہ عام زندگی کے معاملات ہوں یا زندگی کے اہم فیصلہ جات ہوں عورت کی رائے مرد کی رائے کے مقابلے میں اپنی حیثیت کھو دیتی ہے، انہیں کسی سماجی، سیاسی اور معاشی شعبے یا دارے میں کسی قسم کا قائدانہ کردار کی نہ تو اجازت ہے اور نہ ہی مناسب مواقع۔ بیٹی کی پیدائش ہوتے ہی سارا خاندان فکر مند ہو جاتا ہے، عدم تحفظ کا احساس ہمہ وقت بیٹی کے ساتھ منسوب رکھا جاتا ہے"۔[۷]

بیٹی کو اول دن سے خوف اور دباؤ کے ایک ایسے ماحول میں رکھا جاتا ہے جہاں وہ اپنے آپکو مردوں کے مقابلے میں کم صلاحیت، کم حوصلہ اور کم طاقت ور سمجھتی ہے، اسے نفسیاتی اور جسمانی طور پر اس قدر کمزور کر دیا جاتا ہے کہ خوف اور کم ہمتی کے سائے ہمیشہ اس کا پیچھا کرتے ہیں، معاشی تعلیمی سہولیات اور حقوق کے حوالے سے بیٹا اور بیٹی میں فرق معاشرے میں عام ہے، زندگی کا ہر شعبہ اور ادارہ مردوں کے رحم و کرم پہ چلتا

ہے۔ نام نہاد غیرت، شادی، طلاق، گھر کے نام پر عورت کو نا کردہ گناہوں کی اس طرح سزائیں سنائی جاتی ہیں کہ وہ عمر بھر سسک سسک کر گزارتی ہے، یا موت کو گلے لگا دیتی ہے۔ اس سارے ظالمانہ، غیر منصفانہ اور جاہلانہ کردار کو تحفظ دینے کے لئے بہت سے جواز گھڑے جاتے ہیں۔ یہ تو حالات وہ ہیں جو ہم جیسے پسماندہ معاشروں کے ہیں۔ جہاں اکثریت ان پڑھ اور جاہل ہے۔ ہم نام کے مسلمان ہیں، جس دین نے عورت کو ماں، بیٹی اور بہن کے رشتے کو مقدس بنایا، جس نے یہ اعلان کیا کہ تم میں سے کسی کو فوقیت اگر ہے تو وہ صرف تقویٰ کی بنیاد پہ نہ کہ کسی اور امتیازی تفریق کی بنیاد پر۔ آج ہم اسی دین کے نام لیوا اپنے معاشرے میں خواتین کا وہی حال کر رہے ہیں جو دور جہالت میں کیا جاتا تھا۔ اس وقت دنیا میں ایک دوسرا معاشرہ بھی ہے جو زرعی دور سے نکل کر اس وقت صنعتی اور کمپیوٹر ایج میں پہنچ چکا ہے یعنی یورپ اور امریکی معاشرہ اس کے ہاں عورت کی حالت اگرچہ کہ پسماندہ معاشروں سے کچھ مختلف ہے عورتوں کو کاروبار، ملازمت، پراپرٹی کی ملکیت کی اجازت ہے۔

لیکن عملی طور پہ معاشرے میں انہیں مردوں کی اجارہ داری کی وجہ سے کافی مشکلات اٹھانی پڑتی ہیں، زندگی کے مختلف شعبوں میں انہیں آزادانہ کام کرنے کی اجازت اور سہولت ہے لیکن امتیازی سلوک سے پھر بھی گذرنا پڑتا ہے، مردوں سے عدم تحفظ کا احساس ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ خاتون ملک کے انتہائی اعلیٰ عہدوں پہ پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اگر یورپ کی ترقی و کمال میں عورت کے کردار کا تجزیہ کیا جائے تو تخلیقی و قائدانہ کردار کم اور ایک حض نفس کی تسکین کا ذریعہ اور سرمایہ کے حصول کے لئے آلہ کار کا کردار زیادہ نظر آتا ہے، عورت کو زیادہ سے زیادہ سرمائے کے حصول کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے، اس کے لئے انہوں نے جدید خطوط پر استوار جامع حکمت عملی اپنائی ہے۔ یورپ نے کیوں کہ مذہب کو ریاست سے جدا کر دیا ہے، لہذا جو مذہبی نظریات تھے کے عورت کو جسم ڈھانپنا چاہئے، جس کی مثالیں ہمیں پرانے یورچین معاشرے میں نظر آتی ہیں، جہاں عورتیں جسم کو ڈھانپ کر رکھتی تھیں، اگرچہ کہ پرانے دور میں عورت کا جسم تو ڈھانپا ہوتا تھا لیکن اس کی سماجی حیثیت وہی غلامانہ ہی تھی، دور جدید میں مذہب کو ریاست سے الگ بھی مردوں نے کیا اور اب ایک نیا کردار عورت کو دینے کے لئے انہوں نے اسے ایک نیا روپ دیا۔

ترقی پسندی اور لبرل ازم کے نام پہ بچیوں کو شروع دن سے ہی بیٹوں کے مقابلے میں کم کپڑے پہنانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس طرح کے مناظر آج یورپ اور امریکہ میں نظر آتے ہیں، کوئی کھیل کا لباس ہو یا عام زندگی کا لباس عورت کے لئے اس کے اعضاء کو ننگا رکھنے کا مزاج بنا دیا گیا۔ اب عورت کو ایک

طرف تو امتیازی قوانین کا سامنا ہے، مردوں کی اجارہ داری کے اس معاشرے میں اسے ویسے بھی عدم تحفظ کے احساس کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ پاکستان میں عورتوں کی سماجی حیثیت یوں تو کبھی بھی قابل فخر نہیں رہی لیکن ضیاء الحق نے ان کا آئینی استحصال کر کے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ۱۹۷۹ میں نافذ ہونے والے نام نہاد اسلامی قوانین میں خواتین کو دوسرے درجے کا شہری بنا دیا۔ قانون شہادت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی گئی۔ حدود آرڈیننس میں خواتین کے خلاف زیادتی کی انتہا کر دی گئی کہ ریپ (زنا) اور زن با لجبر میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ زیادتی کا شکار ہونے والی خاتون کو خود ہی جرم کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے ورنہ وہ خود مجرمہ بنا کر جیل پہنچا دی جاتی ہے۔ حد کی سزا کے لیے صرف چار مسلمان مردوں کی گواہی کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی اگر قتل یا ریپ صرف خواتین اور غیر مسلم مردوں کی موجودگی میں ہو تو حد کی سزا نہیں دی جا سکے گی۔ ان سراسر غیر منصفانہ قوانین کا شدید نقصان خواتین کو پہنچا ہے۔ سینکڑوں کی تعداد میں غریب عورتیں جن میں ۱۶ سے ۲۰ سال تک کی خواتین شامل میں از زنا آرڈیننس میں جیل جا چکی ہیں۔ جنھیں ان کے شوہر، سسرال والوں یہاں تک کے والدین نے بھی اپنی مرضی سے شادی کرنے یا بدلا لینے کی خاطر پولیس میں شکایت کر کے جیل میں پہنچا دیا۔

یہ درست ہے کہ ایک عرصہ جیل میں گزارنے کے باوجود ان کا جرم ثابت نہ ہونے پر رہا کر دیا گیا لیکن اس معاشرے میں جو عورت ایک بار جیل جا چکی ہے کیا اس کا گزارہ ہو سکتا ہے؟ ایک طرف تو پاکستانی خواتین کا مسئلہ ان پر بہیمانہ تشدد ہے جو گھروں میں، گھروں سے باہر، پولیس لاک آپ میں اور پبلک لائف میں ہوتا ہے۔ ناول اپنے مزاج اور کردار کے اعتبار سے سماج اور سیاست سے بے حد قریب ہے۔ ناول کے وسیع اور طویل کینوس میں جس طرح زندگی اور سماج سمٹ آتا ہے، شاید کسی اور دوسری صنف میں اس طرح کے امکانات نہیں شاید اسی لیے تاریخی واقعات، سماجی تصادمات اور انسانی نفسیات کا جتنا بہتر اور فنکارانہ عکس ناول میں نظر آتا ہے؛ کسی دوسری صنف میں ممکن نہیں۔ اسی لیے ادبی اصناف میں ناول کا سماجیات اور سیاسیات سے گہرا رشتہ ہے۔ انہیں رشتوں کے بارے میں تو لوکاچ نے کہا تھا کہ ناول اور سماج کا رشتہ حقیقت پسندی تک پہونچنے کا ایک راستہ ہے اور یہ ایک ایسی طاقت ہے جو کردار اور انسانی رشتوں کو آزاد زندگی سے جوڑتی ہے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے بقول ناول صرف فنکار ہی نہیں بلکہ زندگی کے تجربوں کو پڑھنا ہے ایک اعلان ہے، ایک اندرونی تصویر ہے، ایک خبر ہے۔ خیر و شر کے واقعات کی صحت و ترتیب، دلچسپ انداز بیان،

تخیل کی رنگ آمیزی نکھر کر سامنے آتی ہے۔ تو وہی چیز حقیقت میں افسانوی ادب کی تاریخ میں آجاتی ہے۔ اس لیے ناول میں تجربات و مشاہدات کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی سے عورت کی حیثیت ، تعلیم، سماج میں اس کا مقام، مذہبی حوالے سے اس کی حقیقت کا تعین، ملکی قانون، معاشی زندگی میں اس کا مناسب حصہ ،وراثت، عائلی زندگی میں اس کے حقوق کے حوالے سے مختلف تنظیمیں بنا شروع ہوئیں۔ جنہوں نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود جدوجہد جاری رکھی اور کسی نہ کسی حوالے سے عورت کے حقوق کے لیے کام کیا۔ جرمنی، فرانس، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کے ساتھ ساتھ بر صغیر میں بھی سیاسی، معاشرتی، اصلاحی اور تعلیمی حوالے سے اٹھنے والی تحریکوں کے منشور میں بھی تعلیم و آزادی نسواں کو شامل کیا گیا۔ اگر چہ ان کی رفتار ست رہی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں اضافہ ہوا اور بر صغیر کی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی ومذہبی زندگی میں عورت کا تصورو کردار بدلتا چلا گیا۔ ادیب جس معاشرے میں سانس لیتا ہے اس کے سماجی عوامل اور معاشی حالات پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کی دور رس نگاہوں سے سماج کا کوئی بھی گوشہ پوشیدہ رہ جائے۔ یہی سماجی شعور اس کی تخلیقات کو اپنے عہد اور ماحول کا ترجمان بناتا ہے۔ اسی سماجی شعور کی بدولت درباروں سے وابستہ رہتے ہوئے بھی وہ عوام کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو آج میر اور غالب کی شاعری، اور میر امن اور رجب علی بیگ سرور کی تخلیقات اپنی معنویت کھو چکی ہوتیں۔

یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے خاتمے سے پہلے ہی بر صغیر میں تعلیم یافتہ خواتین کے حوالے سے ایسی خواتین سامنے آئیں کہ جنہوں نے کسی نہ کسی حوالے سے اس شعور کو عام کیا کہ عورتوں کو اپنی حیثیت منوانے کے لیے جد و جہد کرنی ہو گی۔ تمام تر رکاوٹوں کے باوجود دن دن عورت کے حوالے سے تنظیموں میں اضافہ ہوا، پدرسری معاشرے میں مرد کی بالا دستی کے باوجود عورت نے سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی ومذہبی سطح پر اپنی حیثیت منوانے کی جدوجہد جاری رکھی اور اب مختلف این جی اوز اور عورت فاؤنڈیشن جیسی تنظیمیں زیادہ فعال کردار ادا کر رہی ہیں۔ بر صغیر میں عورت کی حیثیت منوانے کے لیے مردوں نے بھی شانہ بشانہ کام کیا۔ بر صغیر میں اردو ناول کی ابتداء انگریزی نظام حکومت کے تسلط کے بعد سے ہوتی ہے۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد، جب ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی زندگی میں ایک زیر دست تبدیلی رونما ہوئی تو اس کا نمایاں اثر

ادب پر بھی پڑا۔ چنانچہ اس دور کے ادیبوں، فن کاروں اور دانش وروں نے ادب کو نئی زندگی اور نئے حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ اردو کہانی جو ایک مدت تک داستانوں کی رنگین رومانی اور تخیلی دنیا میں سانس لے رہی تھی۔ مولوی نذیر احمد کی رہبری میں حقیقت کی دنیا میں داخل ہوئی اور ناول کے نام سے جانی پہچانی جانے لگی۔ اس طرح ناول جو انگریزی لفظ ہے، انگریزی زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ ہمارے یہاں آیا اور دیکھتے دیکھتے سارے ادب پر چھا گیا۔

اردو میں اس فن کو مستقل حیثیت دینے میں انگریزوں کا قابل قدر حصہ رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بدلے ہوئے ماحول میں ادیبوں اور فن کاروں نے زندگی کے مطالبے اور تقاضے کو ایک مخصوص زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ داستانوں کی پر کشش اور مبالغے سے بھری ہوئی پُر تکلف، رومان پرور زندگی کی جگہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کے پس منظر میں انسانی زندگی کی حقیقوں کی عکاسی کی جانے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ناول کا آغاز ان سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی رہین منت ہے۔ جن سے انیسویں صدی کے اختتام پر ہندوستانی معاشرہ دوچار تھا۔ سر سید نے بعض سیاسی اور معاشی مصلحتوں کی بناء پر جو پیروی مغرب پر زور دیا تھا وہ رجحان بھی ادب میں جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ وطن پرستی کی وجہ سے اکبر الہ آبادی کی مغرب بے زاری اور مشرق پرستی بھی جاری رہی۔ اقبال، چکبست اور کئی دوسرے شاعروں کی قومیت اور وطن پرستی بھی ایک اہم ادمی رجحان بنتی جا رہی تھی۔ سیاسی میداری کی بدولت اقلیت پسندی بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی نئی اور پرانی اقدار کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ یہ تمام رجحانات ناول میں پوری طرح نظر آتے ہیں۔ مغرب اور دوسرے ملکوں سے رابطہ پڑھنے سے مغربی اور دیگر ملکوں کے ادبی رجحانات اردو ادب میں پھیل رہے تھے۔ جمالیاتی تحریک جو انیسویں صدی کے آخر میں فرانس میں شروع ہوئی اور انگلستان میں والٹر پیٹر اور آسکر وائلڈ کی وجہ سے مقبول ہوئی اردو ادب میں رومانوی تحریک کی بنیاد کی بنی۔ جس کے زیر اثر نذر سجاد حیدر یلدرم، بیگم حجاب امتیاز علی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری اور ابو الکلام آزاد کی تحریر میں منظر عام پر آئیں۔ دراصل اس تحریک کا مقصد ہی نہ صرف ادب کو ہندوستانی سماج میں رونما ہونے والی انقلابی تبدیلیوں کے مطابق بنانا تھا بلکہ سائنس اور اقلیت پسندی کو بھی رواج دینا تھا۔ ترقی پسندی کے رجحان نے ادیب کو بڑی حد تک وہ آزادی عطا کی جس کے ذریعے وہ اپنا مافی الضمیر بلا جھجک ادا کر سکے۔ ڈاکٹر یوسف سر مست لکھتے ہیں:

"ادیب کی اس آزادی نے ادب میں بعض ایسی باتوں کو بھی عام کر دیا جو اب تک شجر ممنوع سمجھی جاتی تھیں۔ اس انقلابی اور باغیانہ رجحان نے ادیب کو جو آزادی بخش دی تھی، وہ تحریک یا تنظیم سے وابستہ ادیبوں تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ ادب کی ساری فضا پر چھا گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ادیب راست طور پر اس تحریک یا تنظیم سے وابستہ نہیں رہے، وہ بھی اس کے زیر اثر آ گئے "(۸)

آزادی کے بعد ہندوستان میں تحریر کیے جانے والے اردو ناولوں کا اگر ہم جائزہ لیں تو اس سے ہمیں اس کی ترقی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ عورت کی سماجی حیثیت اردو ناولوں کا اب بھی موضوع ہے مگر اب اس کی نوعیت دوسری ہے۔ آزادی کے بعد جو معاشرہ وجود میں آیا اور اس میں عورت کو کن کن مختلف حالات سے گزرنا پڑا اور اس کے مسائل میں بھی تبدیلی آئی۔ آزادی اور حقوق نسواں کا مفہوم بدلا ہے۔ اب عورت نے بنیادی حقوق حاصل کر لیے ہیں مگر ان حقوق کو حاصل کر کے جب وہ ترقی کی اگلی منزل کی طرف گامزن ہے تو اس کو بدلتے معاشرے اور بدلتے رول میں دوسری نوعیت کے مسائل درپیش ہیں۔ مثلاً مردوں کے ساتھ کام کرنے کے مسائل، آزاد تعلیم یافتہ خود مختار عورت کے گھریلو مسائل، صدیوں سے عورت کی کم تر حیثیت کے تصور کی وجہ سے مرد اور عورت کا ٹکراؤ، اس سلسلے میں مردوں کی نفسیاتی گتھیاں، جذباتی طور پر مردوں کا ان کو بلیک میل کرنا، آزادی کے نام پر ان کا مختلف سطحوں پر استحصال اور ان ہی مسئلوں کو ناولوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ صغرا مہدی لکھتی ہیں:

"اب عورت کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کو کمانے کا حق تو مل گیا ہے مگر اس کی اپنی کمائی پر اس کا حق نہیں ہے نہ اس کو اپنی پسند کے مطابق خرچ کرنے کی اجازت۔ اب اس کو باہر نکلنے کی اجازت تو ہے مگر اس شک میں مبتلا ہو کر کہ وہ جانے کس کس سے ملتی ہے، کہاں کہاں جاتی ہے، ہنستی ہے، بولتی ہے۔ ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں۔ عورت سے متعلق جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آج کی عورت کا مسئلہ اس کا تشخص اور اس کی شناخت ہے۔ اس کے باوجود کہ قانوناً ان کو ہر طرح کی آزادی ہے مگر ان کی ترقی کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات ہیں کیونکہ قانون اور سوشل ریلیٹی میں بہت فرق ہے۔ ان مسئلوں کو اردو ناول نگار آج بہت اچھی طرح پیش کر رہے ہیں "(۹)

ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ اس کی ترقی کی راہ میں بہت سی مشکلات ہیں۔ یہی معاملہ عورتوں کی آزادی اور ان کے حقوق کا ہے کہ وہ سب اسکیمیں، وہ سب منصوبے، وہ سب کمیشن عورتوں کی ترقی اور فلاح و بہبود کے وہ سب ادارے پورے طور پر ہندوستانی عورت کو وہ مقام نہیں دلا سکے ہیں جس کی وہ مستحق ہے اور اب بھی ہمیں عورتوں کی سماجی حیثیت میں ایک تضاد ملتا ہے اور اس ترقی اور آزادی میں شدید قسم کا عدم توازن ہے مگر اس کے ساتھ اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں ہے کہ عورتوں کی آزادی اور حقوق کی جدوجہد جس کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا تھا اب جب کہ بیسویں صدی ختم ہو رہی ہے عورت کی سماجی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔

اصولی طور پر اس کو مان لیا گیا ہے کہ عورت اور مرد دونوں برابر ہیں اور سماج میں ان کا مساوی درجہ ہونا چاہیے۔ عورت چار دیواری کو پھاند کر باہر نکل آئی ہے۔ یہ حیثیت قانون داں، اداکار، آرٹسٹ، موسیقار عورتوں نے ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ وہ یا ہے۔ وہ ڈاکٹر ہیں، اسٹیج ڈائرکٹر ہیں، پولیس میں ہیں، انجینئر ہیں، ایئر ہوسٹس ہیں، کم ہی سہی مگر حکومت میں ہیں۔ وہ اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کرتی ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں اور غیر ممالک کو جانے والی ثقافتی وفود کی سربراہی کرتی ہیں اور ان میں شرکت کرتی ہیں۔ بین الاقوامی کانفرنسوں اور غیر ممالک کو جانے والی ثقافتی وفود کی سربراہی کرتی ہیں اور عورت کے ساتھ جو ناانصافی ہوتی ہے ظلم و تشدد ہوتا ہے۔ اس کے خلاف عورتیں آواز اٹھاتی ہیں۔ اخباروں میں عورتوں کے خلاف ہونے والی ناانصافی، ظلم و تشدد کو جلی حرفوں میں چھاپا جاتا ہے۔ ان کو اخباروں میں نمایاں مقام ملتا ہے۔ اس کے مسائل پر کانفرنسیں ہوتی ہیں، جلوس نکلتے ہیں، اس کی حمایت میں ہر کونے سے آوازیں آتی ہیں اور عورت کی آزادی، ترقی اور سماجی برابری کے لئے فضا پوری طرح بن چکی ہے اور اس فضا کو بنانے اور عورت کو سماجی رتبے کو بڑھانے میں ہماری اردو ناولوں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے لکھنے والے اردو کے اہم ناول نویس تو تھے ہی جن میں سے کچھ نے براہ راست عورتوں کی سماجی حیثیت کو اپنی ناولوں کا موضوع بنایا۔ بعض نے بالواسطہ اپنی ناولوں میں اس سے متعلق مسائل کو اٹھایا۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے صرف آزادی نسواں کی حمایت کے لیے ناول تصنیف کیے اور ان ناول نگاروں میں خواتین ناول نگاروں کی بھی بڑی تعداد تھی جنھوں نے اس زمانے میں سارے سماجی قیود اور نامساعد حالات کے باوجود ناول تصنیف کیے اور عورت کی سماجی حیثیت کو موضوع بنانے کی مساعی کی۔

نذر سجاد حیدر کے ناولوں میں خواتین کا سماجی کردار:

جاں باز

"جانباز" (۱۹۲۹ء) میں تحریر کیا ہوا نذر سجاد حیدر کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول اپنے وقت کا مشہور ناول ہے۔ حب الوطنی اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔ ناول کا مرکزی کردار زبیدہ کا ہے۔ زبیدہ صحیح معنوں میں ایک وطن پرست لڑکی ہے۔ وہ وطن کی محبت کے لازوال جذبے سے سرشار ہے۔ وہ ایک نوجوان قمر سے منسوب ہو چکی ہے جو مغربی تہذیب و معاشرت اور طرز زندگی کا حامی ہے۔ زبیدہ اور قمر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ زبیدہ چوں کہ حب وطن کے جذبے سے سرشار ہے اس لیئے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ہندوستانی ہے۔ قمر کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بدیشی فیشن میں نہیں ڈھال سکتی ہے جو قمر کو ناگوار گذرتا ہے۔ اس دوران قمر کی ملاقات اپنی ہم خیال اور مغرب زدہ لڑکی نجمہ سے ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں اور قمر زبیدہ کو چھوڑ کر نجمہ سے شادی رچاتا ہے۔ نجمہ جو کہ ایک آزاد خیال لڑکی ہے گھریلو کام کاج سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ہے۔ قمر اس کی بے راہ روی اور بے جا آزادی سے بے زار ہو کر اس سے علاحدہ ہو جاتا ہے۔ اب قمر کو زبیدہ کی قدر معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے اعمال پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اس لیئے وہ پھر زبیدہ کے قریب ہو جاتا ہے لیکن نجمہ کو ان کا ملاپ ایک آنکھ نہیں بھاتا ہے اور وہ فریب سے قمر کو قید کرواتی ہے لیکن بالآخر نجمہ ناکام ہوتی ہے۔

"جاں باز" کا مرکزی کردار زبیدہ (ہیروئن) سیاسی تحریک سے متاثر ہو کر کھدر پہنتی ہے اور غیر ملکی اشیاء کا استعمال ترک کر دیتی ہے۔ جبکہ اس کا منگیتر قمر کپتان پولیس مغربیا طوار اور رہن سہن کا شیدا ہے۔ وہ امن سبھائیں قائم کرتا ہے اور ظاہری چمک دمک اسے پسند ہے۔ چنانچہ وہ اپنی منگیتر کو چھوڑ کر ایک خوبرو ماڈرن دوشیزہ نجمہ سے شادی کر لیتا ہے۔ نجمہ شادی کے بعد بھی کمتر درجے کے کلبوں میں جاتی ہے اور غیر مردوں کے ساتھ ڈانس کرتی ہے۔ شوہر اسے منع کرتا ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی۔ حتی کہ ایک بار بنک سے قمر کے جعلی دستخطوں کے ساتھ کئی ہزار روپے بھی نکلوا لیتی ہے۔ بالآخر اس کی روز روز کی بدکاریوں سے تنگ آکر قمر اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ اور خود کچھ عرصہ کے لئے رخصت لے کر قومی جلسوں میں شرکت کرنے لگتا ہے. ایسے ہی ایک جلسہ میں اس کی زبیدہ اور اس کے گھر والوں سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ وہ زبیدہ سے نادم ہوتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔ زبیدہ چونکہ اب بھی اسی سے پیار کرتی ہے اس لئے معاف کر دیتی

ہے۔ نجمہ ایک اور باری شخص میٹن جی کی دولت کے لالچ میں آکر قمر سے طلاق لے لیتی ہے اور پھر قمر زبیدہ سے شادی کرلیتا ہے۔

ثریا

"ثریا" (۱۹۴۰ء) کا تحریر کردہ نذر سجاد کا ایک مختصر معاشرتی ناول ہے جس میں بغیر مرضی کی شادی کے مہلک اثرات اور نتائج کو ظاہر کیا گیا ہے۔ اس ناول میں جس مسئلے کو چھیڑا گیا ہے وہ نہ صرف اس زمانے کا اہم مسئلہ تھا بلکہ یہ مسئلہ آج کے دور کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے کیونکہ آج بھی اکثر والدین اپنے بچوں کی شادی صرف اپنی مرضی کے مطابق کرتے ہیں، بچے اس شادی کا زہر زندگی بھر پیتے رہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کی زندگی تلخیوں کا شکار ہوتی ہے اور کئی لوگوں کی زندگیوں کا انجام عبرتناک ہو جاتا ہے۔

نذر سجاد کے ناول "نجمہ" کے علاوہ ان کا ایک اور ناول "ثریا" ہے۔ "ثریا" ایک یتیم لڑکی ہے جس کا اس دنیا میں ایک دادی کے سوا اور کوئی نگہباں نہیں ہے اس ناول کا اہم اور مرکزی کردار بھی "ثریا" کا ہے۔ ثریا ایک حسین و جمیل لڑکی ہے۔ والدین کی موت کے بعد وہ دادی کی سرپرستی میں آجاتی ہے۔ اسے مصوری کا بے حد شوق ہے اور وہ اس فن میں کامیاب بھی ہے کسی سہارے کے نہ ہونے کے باوجود زندگی گزارنے کا اسے ایک خاص سلیقہ آتا ہے۔ اس کی سب سے عزیز ترین سہیلی میں سوہنی ہے میں خوشی کا بھائی سندولال کئی سال لندن میں گزار کر آرہا ہے اس لئے پریم لاج جو سر سینہ دلال کی کوٹھی ہے، ہر طرح آراستہ کی گئی ہے۔ سندر لال کے دوستوں میں نواب غنی صاحب بھی ہیں۔ جس دن سندر لال ہندوستان پہنچا تو جشن میں غنی صاحب نے ثریا کو دیکھا۔ وہ اس کمسن دوشیزہ کو دیکھ کر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پہلے تو ثریا نے اسکی باتوں پر کچھ دھیان نہیں دیا۔ لیکن جب نواب نے اپنے جذبات کا اظہار کر دیا تو ثریا کے دل میں جو عزت تھی وہ کم ہونے لگی اور اس نے صاف لفظوں میں یہ کہہ دیا کہ وہ نواب سے ملنا نہیں چاہتی، وہ نواب کو بھائی جانی اور بزرگ کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ لیکن آخر رفتہ رفتہ وہ نواب صاحب کے قریب ہوتی چلی جاتی ہے اور غنی صاحب کو اپنی دادی سے ملواتی ہے۔

یہاں نذر سجاد حیدر نے ایک تصادم کی فضا پیدا کر دی ہے۔ جس سے ناول میں ایک ڈرامائی کیفیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ نواب غنی صاحب اور ڈپٹی کلکٹر محمد حسین سے ثریا کی رشتہ داری ہے اور نواب غنی اپنے بیٹے قمر الزماں سے ثریا کا رشتہ چاہتے ہیں۔ قمر الزماں خوبصورت تعلیم یافتہ ہیں۔ ڈپٹی صاحب بھی ثریا کے امیدوار ہیں۔ ثریا کی دادی جان ثریا کا رشتہ قمر الزمان سے طے کر دیتی ہے لیکن ثریا اعلیٰ تعلیم کا بہانہ بنا دیتی ہے

بڑی بیگم کو حالت کا علم ہے اس لیے وہ ثریا کی ضد کے آگے نواب سے اسکا رشتہ کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ یہاں کہانی بہت سست رفتار ہو جاتی ہے۔ اور ایک کشا کش پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کیوان قدر کے والدین اس بات پر تیار نہیں ہیں۔ کیوان قدر کے سامنے دو راستے ہیں اگر وہ ثریا کو اپنا لیتے ہیں تو جائداد سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اور اگر والدین کی مرضی کے مطابق شادی کر لیتے ہیں تو پھر ثریا سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

مومنم اور سنور دو اکار سہ شتر اس کی دوستی بنگالی گھرانے کی لڑکی موہنی سے ہوتی ہے۔ موہنی کے بھائی سندر لال کے دوست نواب قدر سے ثریا کی ملاقات ہوتی ہے، یہ ملاقات محبت میں بدل جاتی ہے اور دونوں خاموشی سے شادی کر لیتے ہیں۔ جب نواب قدر کے گھر والوں کو اس بات کا پتہ چلتا ہے تو وہ نواب قدر کو طلاق دینے کی دھمکی دیکر اس کی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔ ثریا کی زندگی ویران ہو جاتی ہے۔ وہ نواب قدر کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ وہ لکھنو کو چھوڑ دیتی ہے اور انتہائی کسم پرسی کی حالت میں ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے۔ اسی اثنا میں اس کی ملاقات نواب قدر سے ہو جاتی ہے۔ وہ اب اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا اہل ہے۔ وہ والدین کی مرضی سے بیاہی ہوئی بیوی کو ان کے پاس ہی چھوڑ دیتا ہے اور خود ثریا کے ساتھ زندگی گزارنے کا ارادہ کرتا ہے۔ نذر سجاد لکھتی ہیں:

"کیوان قدر کا تبادلہ مراد آباد ہو جاتا ہے۔ جس سے شادی کی تاریخ طے کر دی جاتی ہے اور وہ چار دن کے لئے آگرہ چلی جاتی ہے۔ جس دن ثریا آگرہ جاتی ہے اسی دن ٹرین سے ایک بیگم صاحبہ اترتی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ کیوان قدر اس حسین عورت کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں میں نے آپ کو پہچانا نہیں کون ہیں؟ اور کہاں سے تشریف لائی ہیں۔ بیگم صاحبہ رف کے قریب آجاتی ہیں۔ اور یہ شعر پڑھتی ہیں

ڈل بے تاب نے آخر کو نہ پیچھا چھوڑا
بعد مدت کے انہیں ڈھونڈ نکالا گیا

کیوان قدر کہتے ہیں خدا کے لئے جلد بتایئے کہ آپ کون ہیں کیونکہ آپ کی شکل میرے ایک رشتے دار سے ملتی ہے۔ جسے دنیا سے رخصت ہوئے دس سال ہو چکے۔ وہ پھر ایک شعر پڑھتی ہے۔

سر گزشت بلانشاں نہ سنو

نہ سنو میری داستاں نہ سنو

کیوان قدر اس سے معذرت کرنے لگتے ہیں اور تب وہ خود کو ظاہر کر دیتی ہے پہلے نواب صاحب کو یقین نہیں آتا لیکن جب وہ رف کے سامنے ثریا کو لباس میں دکھائی دیتے ہیں تب انہیں یقین ہو جاتا ہے۔ کیوان قدر نے ثریا اور بیٹے کو پانے کے بعد اپنے والدین کو اس سے آگاہ کر دیا کہ اب وہ ثریا کو پا چکے ہیں اور۔ اپنی بیگم بچوں کو ساتھ میں رکھ سکتے ہیں وہ کلکٹر کے عہدے پر فائز ہیں اس لیے اپنی تنخواہ پر بخوبی گزارا کر سکتے ہیں۔

مذہب اور عشق

ناول "مذہب اور عشق" (۱۹۳۵ء) کا موضوع ہندو مسلم شادی ہے۔ یہ نذر سجاد کا وہ ناول ہے جس میں انھوں نے سماجی زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے عورتوں کے حقوق اور اسلام میں پردے کے معنی پر توجہ دلائی ہے۔ ان کے یہ ناول اگر چہ آزادی سے قبل اعلیٰ متوسط، روشن خیال، تہذیب و معاشرت، افکار و اقدار کا آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان میں عام عورت کے دل کی دھڑکن بھی سنی جا سکتی ہے۔ جو ہر جگہ اپنے آپ کو سماج اور مذہب کی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرتی ہے۔ عورت کی تعلیم و تربیت کا معاملہ ہو یا شادی بیاہ کا یا پھر دیگر معاملات زندگی ہوں۔ ہر جگہ مذہب اور سماج اس کی راہ کا پتھر بنا ہوا ہے۔

نذر سجاد نے اپنے ناول "مذہب اور عشق میں شادی کے وقت اور مذہبی طور پر آزادی کو ضروری قرار دیا ہے۔ سریش چندر مکھرجی ایک مشہور بیرسٹر ہیں جو کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں اور ان کا بیٹا ہریش چندر بھی بیرسٹر ہے اور ان کی دو بیٹیاں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ بڑی بیٹی سوشیلا پانچ سال ہی کی کم عمر میں تعلیم و تربیت کی غرض سے انگلینڈ بھیج دی گئی تھی اور تیرہ سال بعد تعلیم حاصل کر کے بمبئی لوٹتی ہے اور اس تعلیم یافتہ لڑکی کے خیر مقدم کے لئے سر مکھرجی کے قلبی دوست، سر لقمان، ان کی بیوی اور ان کی بیٹی رتن بائی بھی اپولو بندر گاہ پر پہنچتے ہیں اور یہ بھی لوگ شاداں و فرحاں سوشیلا کو لیکر گھر آتے ہیں۔ حالانکہ اس طریق سے سوشیل تعلیم و تربیت تو اچھی حاصل کر سکی مگر اتنی کمی رہ گئی کہ وہ اپنے مذہب اور ہندوستانی زبانوں سے ناواقف رہ گئی۔ سر گھرجی کے قلبی دوست مسٹر لقمان کے پرائیوٹ سکریٹری مسٹر شبیر ایک قانون داں باصلاحیت بیرسٹر ہیں۔ جو چندر محل میں اپنی ذاتی مجبوریوں کے تحت قیام پذیر ہیں۔ سوشیلا بائی مسٹر شبیر سے اُردو زبان پڑھنے لگتی ہے۔

مس میو جو ایک امریکن خاتون ہیں ہندوستان کی سیاحت اور یہاں کی معاشرتی کیفیت دیکھنے کے لئے آئی ہوئی ہیں۔ بمبئی میں سر لقمان جی سے شبیر صاحب کی لیاقت اور وسعت مطالعہ کا تذکرہ کیا۔ اس لئے جس میو نے اپنے وہ تمام مسودات شبیر صاحب کو مطالعہ کے لئے دیتے ہیں جو انھوں نے ہندوستان کی سیاحت میں یہاں کی معاشرت اور رسم ورواج کے متعلق مرتب کیا ہے۔ شبیر صاحب اس مسودے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور سوشیلا کی دلچسپی کے پیش نظر اسے بھی ان قصوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ جو مس میو نے لکھے ہیں اور ساتھ ساتھ ہی وہ عربی تمدن کے عروج میں عورتوں کی آزادی اور قابلیت کے جوہر بھی بتاتے ہیں کہ عرب میں بعض عورتیں شہسواری، تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر افگنی وغیرہ میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں اور آج بھی ان کی نظیر نہیں ملتی۔ سوشیلا ان باتوں میں خاص طور پر شبیر سے اسلام مذہب کے بارے بتانے کے لئے اصرار کرتی ہے اور اسلام مذہب کے بانی محمد مکی سوانح حیات کے بارے میں پوچھتی ہے اور شبیر نہایت مؤثر پیرایے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ اور سلام مذہب کی اچھائیوں کے بارے میں سوشیلا کو بتاتا ہے۔ سوشیلا کے تیرہ سال کے تعلیمی دور میں کم از کم سات آٹھ بار یہ والدین اپنی بیٹی سے ملنے لندن جاچکے تھے۔ سر کھر جی کا بیٹا بھی کم وبیش نو سال وہاں رہ چکا تھا۔

میوے کی تحریرات ہندوستانی مذاہب اور خاص طور پر عورتوں کی سماجی حیثیت کے متعلق ہیں۔ شبیر انھیں مسودوں میں سے محمود ابدالی کا قصہ سناتا ہے۔ سوشیلا کو بتاتا ہے کہ محمود ابدالی ایک ولی صفت شخص تھے اور انھوں نے اسلام پور آباد کیا تھا۔ جہاں کبھی دینداری اور حلال کمائی کے ساتھ گزر بسر کیا کرتے تھے مگر ایک لمبے عرصے بعد جب انگریزوں کے دور میں اسلام پور کی مالی حالت کمزور ہوگئی تو بہت سے بنئے ادھر متوجہ ہوئے۔ بے چونکہ فطرتاً کنجوس بزدل اور حریص ہوتے ہیں اور سود کے کاروبار کو بہت اچھا سمجھتے ہیں۔ انھوں نے چالبازی سے اس شہر میں اپنی آبادی بڑھائی اور ساتھ ساتھ ہی سود جیسی حرام چیز کا کاروبار بھی شروع کر دیا اور انھیں بنیوں اور ایک بابورام بھی تھا۔ بابورام کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا مگر اس کی ایک بیٹی اور ایک بیوہ بہن تھی۔ بابورام اپنی بیٹی نرملا کو تاریک فضا میں قید رکھتا ہے اور اسے باہر کی دنیا سے کوئی آشنائی نہیں ہوتی۔ نرملا کی بوڑھی پھوپھی سروجنی اسے صرف مورتیوں کی پوجا اور انھیں خوش رکھنا سکھاتی ہے۔ مگر نرملا کی فطرت اسی محدود زندگی پر اکتفا نہیں کرتی۔

وہ ان مورتیوں سے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتی تھی اور وہ ان کی پوجا کرنے سے منع کرتی ہے۔ نرملا کی بوڑھی پھوپھی سروجنی اس کے خیالات جان کر اسے ڈانٹتی ہے اور اگلے دن بابورام سے نرملا کے متعلق

بات کرتی ہے کہ تونے لڑکی کا بُر ڈھونڈنے میں اتنی دیر کر دی۔ دیوتا ناراض ہو کر اس کو تباہی کی طرف لے جارہے ہیں۔ بابو رام یہ سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور بازار کی طرف نکل جاتا ہے۔ راستے میں لوگ اس کی طرف دیکھ کر طنز کرتے ہیں۔ اگر بابورام نے جلد ہی اپنی لڑکی کا بُر تلاش نہیں کیا تو اسے برادری سے چھانٹ دیا جائے گا۔ بابورام گھر آکر نرملا کو کوستا ہے کہ وہ پیدا ہی کیوں ہوئی تھی۔ کیونکہ بابورام اپنی بخیل فطرت کی بنا پر اس کا بر تلاش نہیں کر پایا تھا اور وہ اس صورت حال سے پریشان رہنے لگتا ہے۔ مگر جلد ہی اسے اپنی پریشانی کا حل مل جاتا ہے۔ وہ کشیپ دست (جو کہ دمے اور گٹھیا کا مریض ہے اور سن بھی ساٹھ سے اوپر کا ہے) سے نرملا کی شادی کرنے کا سوچتا ہے اور ایک نائی کے ذریعے اپنی بات کشیپ دت تک پہنچا دیتا ہے۔ کشیپ دت نہ صرف راضی ہو جاتا ہے بلکہ بابورام کو تین ہزار روپے بھی تحفہ دینے کو کہتا ہے اور اس طرح سودا پنگا ہو جاتا ہے۔ چند دن بعد نرملا اپنی بوڑھی پھوپھی کے ساتھ بازار سے گذرتی ہے اور خواہش ظاہر کرتی ہے کہ اسے اس کے ہونے والے شوہر کی ایک جھلک دکھادی جائے۔

سروجنی پھوپھی جب اس جوہری کو دکھاتی ہے تو وہ مارے حیرت اور غصے کے سروجنی کا ہاتھ چھڑا کر بھاگنے لگتی ہے اور بھاگتے بھاگتے مسجد کی سیڑھیوں پر گرنے لگتی ہے۔ تبھی دو مضبوط ہاتھ اسے سہارا دیتے ہیں۔ نرملا نظر اٹھا کر دیکھتی ہے۔ وہ ایک خوبصورت اور صحتمند نوجوان تھا۔ نرملا اس کا خوبصورت سراپا دیکھ کر کہتی ہے۔ تم کرشن بھگوان ہو، اجنبی قہقہہ لگا کر کہتا ہے۔ نہیں، میں شیر علی خاں کا فرزند محمد خاں ہوں اوراس شہر میں اجنبی ہوں۔ نرملا پھر اس سے سوال کرتی ہے۔ " تم مسلمان ہو"۔ (مسجد کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے) یہ تمہارے دیوتاؤں کا گھر ہے؟" محمد خاں کو پھر ہنسی آگئی نہیں یہ خدا کا گھر ہے اور وہ اکیلا ہے۔ اُدھر بوڑھی سروجنی نرملا کو ڈھونڈتے ہوئے گھر پہنچتی ہے تو دیکھتی ہے کہ نرملا گھر میں موجود ہے۔ وہ اسے برا بھلا کہتی ہے اور بابورام کو یہ بات بتاتی ہے اور بابورام نے اس پر سختی کی اور اسے پھر قید کر دیا۔

> "تیری بچی نے اسلام قبول کر لیا ہے اس نے تجھے اور تیرے بتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ اب شیر علی خاں کے لڑکے محمد خاں کی منگیتر ہے۔ وہ ابھی کچھ سال گھر کی عورتوں میں علیحدہ رکھی جائے گی اور جب مکمل عورت بن جائے گی تو اس وقت اس کا نکاح ہو گا۔ تا کہ آنے والی نسل نامرد نہ ہو بلکہ مکمل مرد ہو اور اگر تجھے منظور نہ ہو تو مقابلے کے لئے تیار ہو جا۔ بابورام اس شخص کی بات سن کر بزدلی سے اس کے قدموں میں گر گیا اور کہا لڑکی آپ کی نذر ہے"(۱۰)

سو شیل شبیر بیر سٹر سے یہ کہانی سن کر اسلام مذہب سے بہت متاثر ہوئی اور شبیر سے بانی اسلام سے واقفیت کرانے کو کہتی ہے۔ شبیر فی الحال ملتوی کر دیتا ہے مگر اگلے سوشیلا کے اصرار پر اگلے دن شبیر سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی اور اسلام مذہب کے پھیلاؤ کے بارے میں بتاتا ہے۔ آپ محمد کی سیرت کے بارے میں بتاتا ہے کہ کس طرح امین اور حق گو تھے اور اتنی مخالفتوں کے باوجود حق پر قائم رہے۔ تسوشیلا یہ باتیں سنتی ہے باور اس کا دل اسلام مذہب کی طرف مائل ہونے لگتا ہے اور یہاں تک کہ وہ دوسرے مذہب کی ہو کر شبیر سے محبت کرنے لگتی ہے۔ شبیر کو جب معلوم ہوتا ہے تو وہ اسے سمجھاتا ہے کہ اتنی جلد بازی اچھی نہیں وہ ہندو مذہب کی کتابوں کا بھی مطالعہ کرے اور اس کی خوبیوں پر نظر کرے۔ مگر سوشیلا کو یہ ساری باتیں بر کا لگتی ہیں اور دن بہ دن وہ اسلام مذہب کے قریب ہونے لگتی ہے اور ایک دن شبیر سے عورتوں کے حقوق اور پردے کے معنی پوچھتی ہے۔ شبیر شریعت کا حوالہ دیکر اسے سمجھاتا ہے کہ اسلام مذہب کو عورت کو بہت زیادہ احترام دیا جاتا ہے اور پردے کے معنی سمجھاتا ہے کہ یہ حفاظت ہے، جبر نہیں۔ سوشیلا ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی ہے مگر شادی جیسے اہم فریضہ میں اسے مذہب کا حائل ہونا ناگوار گزرتا ہے اور مختلف واقعات و نوعیت کی بنا پر وہ مذہب اسلام اور شبیر کے قریب آجاتی ہے۔ سوشیلا کے گھر والوں کو جب اس کے مذہبی خیالات کا پتہ چلتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے کیونکہ وہ نہ صرف مسٹر شبیر کی شریک حیات بن چکی ہوتی ہے بلکہ وہ اسلام مذہب بھی قبول کر چکی ہوتی ہے۔ اس پر اس کے والدین اسے اور مسٹر شبیر کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہزار روشن خیال ہوں مگر مذہب جیسے پابند دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے اور ان کی اپنی بیٹی کا اسلام قبول کرنا ان کے لئے باعث شرم تھا۔ لیکن سوشیلا اپنے اس فعل سے مطمئن تھی اور اس نے اپنی نئی زندگی کا پُر مسرت آغاز کیا۔

نرملا (جو کہ پتھر کی مورتیوں کی عبادت سے عاجز آگئی تھی) نے صحن میں سبھی مورتیوں کو سر کے بل ایک قطار میں کھڑا کیا اور ان کے سامنے دوزانو ہو کر بولی۔ میں تمہاری لونڈی نہیں ہوں مجھے تم سے نفرت ہے میں تمہارا حکم نہیں مانتی۔ تمہیں مجھے مارنا ہے تو مار اور مجھے مرنا قبول ہے۔ مگر اس بڑھے سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ کہتے ہوئے اس کا دل بھر آیا اور وہ گلیوں میں غائب ہو گئی اور بھاگتے اس ول آویز اور کشادہ مسجد میں پہنچ گئی اور اس نوجوان کو ڈھونڈنے لگی۔ اتفاق سے وہ نوجوان اسے مسجد ہی میں مل گیا اور اس نوجوان نے اس سے پوچھا وہ یہاں کیا کر رہی ہے۔ نرملا جواب دیتی ہے کہ: "مہاراج میں آپ کے خدا کو ڈھونڈنے آئی ہوں۔ جو مجھے اس بڑھے سے شادی کرنے سے بچائے۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ملائمت سے اسے مسجد

کے اندر لے گیا۔ ادھر جب بابو رام نے اپنی لڑکی کے غائب ہونے کی خبر سنی تو وہ گھر کی طرف گیا اور ایک جم غفیر بھی اس کے ساتھ ساتھ قیاس آرائیاں کرتا ہوا چل پڑا۔ کسی نے کہا کہ اس نے خودکشی کر لی اور کسی نے کہا کہ شاید اسے کوڑھ تھی اور اس نے شرم کے مارے میں خودکشی کر لی۔ بابو رام سب کی باتیں سنتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے آپ ملامت کرنے لگا اور ہذیانی انداز میں چیخنے لگا کہ تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو میری بیٹی بہت خوبصورت تھی اور میں نے تین ہزار روپے میں اس کا سودا بھی کر لیا تھا۔ یہ سن کر سبھی موجود لوگ ہنسنے لگے اور سب کے ہنسنے پر بابو رام چیخنے لگا اور سب کو ڈانٹ کر بھگانے لگا۔ دو دن بعد ایک شخص بابو رام کے دروازے میں داخل ہوا۔ جس کے داخل ہونے سے بابو رام کے گھر میں روشنی پھیل گئی۔ اس شخص نے بندوق بغل میں دبا رکھی تھی۔ وہ ایک بارعب اور جیم شیم شخص تھا۔ بابو رام اس کو دیکھ کر لرز گیا۔ اس شخص نے بابو رام سے کہا میں سردار شیر علی خاں کی طرف سے آیا ہوں مصنفہ قارئین تک اپنے خیالات کا اظہار ناول کے کردار کے ذریعے کرتی ہیں:

> "اگر شادی سے قبل لڑکا یا لڑکی کسی اور سے محبت کرتے ہوں اور شادی دوسری جگہ ہو جائے تو دونوں کی زندگی عذاب ہوتی ہے شریف اور نیک میاں بیوی تو رو دھو کر بسر کر لیتے ہیں۔ مگر بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے خلاف بزرگوں کا حکم نہیں مانتیں اور اپنے چاہنے والوں کی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی۔ ان لڑکے اور لڑکیوں سے جو کچھ سرزد ہوتا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ شادی ہمیشہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی سے ہونی چاہئے "(۱۱)

اور اس کے بعد ہی دوسرا کردار کہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی رائے سے رشتہ کرنا ضروری ہے لیکن بعض وقتیں ایسی پیش آتی ہیں کہ ان کے خلاف بھی کرنا پڑ جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر اس زمانہ میں لڑکیوں کی رائے کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر لڑکے لڑکیوں کو بھی چاہئے کہ اپنے خاندانی حالات اور والدین کی مجبوریوں کا خیال کر کے اپنے میں قوتِ برداشت پیدا کریں۔

مگر والدین کی لاپرواہیوں سے ان میں یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ ناول پڑھتی ہیں، سنیما دیکھتی ہیں، کالج کے لڑکے لڑکیاں مل کر ڈرامے کرتے ہیں۔ ان سب باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہے۔ جو ہم روزانہ دیکھتے ہیں اور سنتے ہیں اور یہ سب واقعات نتیجہ ہیں اس کے کہ ہماری اخلاقی حالت بہت کمزور ہے اور یہ کمزوری مذہبی تعلیم

کے نہ ہونے کی وجہ سے لاحق ہے اور جن گھروں میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں کبھی بدمزگی و بدامنی پیدا نہیں ہوتی۔

معاصرین نذر سجاد کے ناولوں میں خواتین کا سماجی کردار

شامِ زندگی

راشد الخیری کے دوسرے ناولوں کی طرح اس ناول "شامِ زندگی"(۱۹۱۸ء) میں بھی کوئی واقعہ نسوانی اصلاح سے خالی نہیں ہے، راشد الخیری نے گن گن کر وہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں جن سے ایک لڑکی شادی ہونے کے بعد روبرو ہو سکتی ہے۔ انھوں نے صرف نسوانی زندگی میں پیش آنے والے مسائل ہی نہیں بیان کیے بلکہ ان کا معقول حل بھی پیش کیا ہے۔ "نسیمہ "راشد الخیری کا آئیڈیل کردار ہے اور وہ ہر ایک کو ایسا ہی بننے کی دعوت دیتے ہیں، اس کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ ناول میں خوابوں اور چھوٹے چھوٹے قصوں کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے مقصد کی تکمیل کسی وعظ یا کسی بزرگ کے خط کے ذریعہ سے کر لیتے ہیں۔ راشد الخیری قاری کی اس دکھتی رگ سے واقف تھے کہ قاری کو رنج والم میں مبتلا کر کے ہی وہ اپنے مقصد کو پاسکتے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے ہر ناول میں منی واقعات کے ذریعہ منگین فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

> "اللہ کی بے شمار رحمتیں نازل ہوں اس انشا پرداز کے قلم پر جس نے یوں گد گدا گدگدا کر رلایا اور رلا ڈلا کر گرگدایا۔ کتنے بگڑے ہوئے گھر انھیں تحریروں سے سدھرے ہوں گے اور ظلمت کدوں میں انسانیت اور خدا ترسی کی شعاعیں انھیں روزنوں سے پہنچی ہونگی اور افسانہ نویسی کے اجر بے حساب اور مردے بے اندازہ کا اندازہ کون کر سکتا ہے "(۱۲)

یہ انسانی فطرت ہے کہ اس کی توجہ اور ہمدردی مظلوم کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت ظالم کے۔ علامہ نے اپنے کرداروں کو اکثر اوقات مظلوم سے مظلوم تر بنا کر پیش کیا، "نسیمہ " بھی اس مظلومیت سے مبرہ نہ رہ سکی۔ سسرال میں اس کے ساتھ جس طرح برتاؤ کیا گیا وہ کسی ذہنی ظلم سے کم نہیں، ساس نندوں اور جٹھانی کی تلخیاں اس کے دل پر جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ گراں گزرتی ہیں۔ "شام زندگی" کا پلاٹ خانگی زندگی کے ڈھانچے پر بنا گیا نہایت دلچسپ پلاٹ ہے۔ جو عورت کی زندگی کو ہر زاویہ سے اجاگر کر کے اس کی خامیاں اور خوبیاں ظاہر کرتا ہے لیکن مصنف صرف خامیاں یا خوبیاں ظاہر کرنے ہی میں فخر نہیں محسوس

کرتا۔ بلکہ مصلحانہ تدبیریں کر کے ان کا مداوہ بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں پیش آنے والی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اخذ کیے گئے پلاٹ کی ترتیب نہایت دلچسپ باقاعدہ اور منظم ہے اور پڑھنے والے کو اصلی کا دھوکہ ہوتا ہے پلاٹ کے علاوہ واقعات اصل اور فطری معلوم ہوتے ہیں۔ راشد الخیری کی درد انگیزی کے سبب ہی ناول اس قدر کامیاب نہ ہوا تھا بلکہ اس میں نسیمہ کی خانگی زندگی اور سماجی کردار کی سلیقہ شعاری کے وہ مرقع بھی شامل ہیں جن کو پڑھ کر اس عہد کی ایک ایک تصویر آنکھوں میں جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ مثلاً

> "یہاں پہنچ کر نسیمہ دیکھتی ہے تو گھر کا رنگ ہی کچھ اور ہے۔ نوکروں نے تو وہ ٹس مچار کھی ہے کہ الٰہی توبہ۔ اول تو تمام جنس بنئے کے یہاں سے اجابت لاتا ہے وہ بھی روز کے روز تیسرے دن ایک روپے کی لکڑیاں ختم ہو رہی ہیں گھر کی حالت عجیب ہے۔ ایک میاں کے سونے کا نواڑی پلنگ تو خیر لیٹ رہنے کے قابل ہے باقی جو ہے وہ ہے جھانگا جہیز کی بڑی بڑی چاندنیاں جو نسیمہ نے ساتھ کر دی تھیں۔ ان پر سائن کے چکتے چوہوں نے کاٹ کاٹ بخارے ڈال دیئے ہیں۔ غرض کہ جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہے ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے۔"(۱۳)

راشد الخیری نے سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنا موضوع بنا کر جس خوب صورت انداز سے پیش کیا ہے اس سے ان کے عمیق مطالعہ اور دور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزوں کی کوری تقلید سے ہمارا معاشرہ کس قدر برباد ہو چکا ہے اس کی اصلاح کی کیا اور کیونکر تدبیریں ممکن ہو سکتی ہیں۔ اس کی سعی کی اپنے انکشافات سے سماج کی رسموں پر بھی روشنی ڈالی جن سے سماج میں خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں مثلاً رابعہ کی شادی اسکی واضح مثال ہے بہت جتن کے بعد رابعہ کی شادی ایسے شخص سے طے ہوئی، اور جس لڑکی کے ساتھ دس ہزار کی جائداد اور دریا باد کا آدھا موضع۔ اور ایک کے بدلے چار زیور ہوں اس کے خواستگار ایسے صاحب زادے ہوئے۔ عمر کے ادھیڑ صورت کے حبشی مزاج کے خاصے سو روپے کے نوکر تین بچوں کے باپ لنگڑے رنڈوے پردیسی رابعہ کے شوہر کی اس حقیقت سے بھی ناول نگار کو کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ وہ اس کو رابعہ کے لیے سنہرا موقع ہی تصور کرتا ہے کیوں کہ رابعہ شادی کے بعد اپنی زندگی کو عیش و عشرت سے گزارتی ہے۔ شوہر اور بیوی کے ازدواجی تعلقات کے متعلق علی عباس حسینی راشد الخیری کے ناولوں کے حوالے سے رقم طراز ہیں:۔

"انھوں نے اپنی تصانیف "صبح زندگی "شام زندگی" اور "شب زندگی" میں تعدد نسوانی کی مکمل مرقع کشی کی ہے اور ان کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ شوہر اور بیوی کے تعلقات اچھے ہیں تو گھر جنت ہے۔ اور اگر تعلقات برے ہیں تو گھر جنم ہے۔ عورت کو نہ صرف اپنی زندگی کی تعمیر و تخریب کا اختیار ہے بلکہ اس کے قابو میں اس کے شوہر اور اس کے بچوں کی زندگی بھی ہے یعنی عورت چاہے تو مرد کی زندگی قابل رشک بن سکتی ہے "(۱۴)

زبان و بیان کے لحاظ سے علامہ کا یہ ایک مکمل ناول ہے۔ انھوں نے دلی کی عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر ایسے فقروں سے کام لیا ہے جو پڑھنے والے کو اپنی گھریلو زندگی میں پیش آتے ہیں خلا قسیم کا نسیمہ سے پلول چلنے کی لیے کہنا۔ اور پھر نسیمہ کا منع کرنا اور اعتراف کرنا، نسیمہ کے اس جواب میں قسیم کی ماں کے لیے عزت بھی ہے اور احترام بھی۔ مصنف نے اسے فقروں کو خاص نسوانی انداز میں پیش کیا ہے: مجھے چلنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے مگر اماں جان سے پہلے صلاح کرا وا گر وہ بھی تشریف لے چلیں تو بہت اچھا ہے قسیم کی آنا کانی پر نسیمہ مزید اپنے فیصلے کو آگے بڑھاتی ہے۔ فقط ذکر سے تو کام نہ چلے گا پہلی مرتبہ کا چلنا ہے ان کی بلا اجازت ٹھیک نہیں اس مرحلے کو تو تم ہی طے کروگے۔ ان کے اشخاص قصہ فطرت انسانی کے خاص مرقع ہیں اور یہ ان کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اپنے ناولوں میں جابجا طرز معاشرت کا نقشہ صداقت کے ساتھ کھینچا ہے جن میں ہر قسم کے کیرکٹر نشو و نما پاتے ہیں نسیمہ اور تقسیم کے خیالات میں بعد المشرقین تھا۔ نسیمہ ناتجربہ کار کم عمر بھولی سیدھی ہے اور پہلو میں ایسا دل جس میں ہمدردی کا دریا ہر وقت لہریں لے رہا ہے۔

نسیمہ ناول کا مثالی کردار ہے اور اپنی نقل و حرکت سے دوسروں کے لیے مشعل راہ بھی ثابت ہوتی ہے۔ نسیمہ کے علاوہ ناول میں دوسرے کردار بھی اپنا پارٹ ادا کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں لیکن قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پاتے۔ ناول کا کوئی بھی منظر یا واقعہ ہو اس کا تعلق خواتین سے ضرور ہے۔ لیکن اس میں زندگی کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ اور مسلم معاشرت میں رائج وہ تمام ضرب الامثال کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے، جس کا واسطہ معاشرت کے ہر طبقہ کے فرد سے پڑتا ہے۔ علامہ نے جزئیات نگاری کی کامیاب ذمہ داری نبھاتے ہوئے ہر شے پر اپنی گہری نظر رکھی ہے یہاں کے ہے یہاں تک کہ کھانے پینے کے آداب، دستر خوان کا سلیقہ، گوشت، بریانی، پلاؤ وغیرہ بنانے کی ترکیبیں آٹا گوندھنے کا

طریقہ، میٹھے چاول بنانے کا طریقہ، یہاں تک کہ پاندان اور پیک دان کے رکھ رکھاؤ کا سلیقہ۔ دھوبی کو کپڑے دینے اور اس کو لکھ لینے کی ہدایت وغیرہ کو اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ جس کی مدد سے مسلمان بیاں بخوبی اپنی زندگی کو سنوار کر اپنے متعلقین کا دل جیت سکتی ہیں۔

یاسمین:

یاسمین(۱۹۳۵ء) مرزا محمد سعید کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے۔ غضنفر علی اپنے بیٹے اختر کی تعلیم وتربیت اور پھر شادی بھی اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کر دیتے ہیں۔ اختر اس زور وزبردستی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے لیکن غضنفر علی اس کی توجہ ہٹانے کے لیے اس کو اپنے دوست رئیس الدولہ کے پاس کلکتہ سیر وسیاحت کی غرض سے بھیج دیتے۔ کلکتہ میں اس کی ملاقات یاکمین سے ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں اور یہ قربت محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ محبت کا بھوت ان پر اس طرح سوار ہوتا ہے کہ ایک دن کشتی میں بیٹھ کر بے سروسامانی کے عالم میں دونوں بھاگ جاتے ہیں اور ایک ایسے گاؤں میں پہنچتے ہیں جہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ دونوں محبت کو بھول کر مصیبت زدہ لوگوں کی خدمت میں جٹ جاتے ہیں۔ ان کی خدمت گذاری کے صلے میں گاؤں کے لوگ ان کی رہائش کے لئے ایک مکان تعمیر کرتے ہیں لیکن چند ذاتی وجوہات کی بناء پر وہ اس مکان میں رہ نہیں پاتے ہیں اور دونوں واپس کلکتہ آتے ہیں۔ کلکتہ میں یاسمین کی ملاقات ایک مصور پھول چندر سے ہوتی ہے۔ دونوں کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے۔ یاسمین پھول چندر کو پہلے تو محبت کا یقین دلاتی ہے لیکن پھر اس کو جھٹک دیتی ہے۔ پھول چندر ایک غیرت مند نوجوان ہے اس لیے اپنی ذلت برداشت نہیں کر پاتا ہے اور خودکشی کر تا ہے۔

ادھر اختر یاسمین کی حرکتوں سے خوش نہیں ہے۔ وہ رشک وحسد کی آگ میں جل جاتا ہے۔ اس لیئے اس غم کو غلط کرنے کے لئے خود سے انتقام لیتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے اور اس طرح ان حرکات سے اپنے ہوش وحواس کے ساتھ اپنی عزت بھی گنوا دیتا ہے۔ پولیس کے ہاتھوں ذلیل ہو جاتا ہے اور آخر کار گھر واپس آجاتا ہے جہاں اس کی بیوی صفیہ اب بھی اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ اس کو سنبھال لیتی ہے۔ لیکن اختر یاکمین کو بھول نہیں پاتا ہے۔ اس کے دل میں یاسمین کے لیے اب بھی محبت ہے لیکن جب وہ سنتا ہے کہ یاسمین نے کسی اور سے شادی کی ہے تو اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے اور بیوی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ناول کے نسوانی کرداروں میں یاسمین اور صفیہ کے کردار قابل ذکر ہیں۔

وہ ایک پیچیدہ شخصیت کی مالک ہے اس لئے ایک طرح سے مجموعہ اضداد ہے۔

یاسمین کے کردار میں خواب ہستی کی شمیم کی کئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شمیم کی طرح یامین بھی ایک دغاباز اور شاطر عورت ہے۔ محبت، شادی اور ازدواجی زندگی اس کے لئے کوئی مفہوم نہیں رکھتی ہے۔ وہ ایک رنگین مزاج لڑکی ہے۔ چونکہ اس کی ماں یہودن ہے اس لئے اس کی طبیعت میں سیمابی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ماں کی طرف سے دی ہوئی بے جا آزادی، انگریزی تعلیم اور مردوں کے ساتھ بے تکلف میل جول نے اس کو حد درجہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ مرد بدلنا اس کی فطرت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیاض سے عشق کیا اور اس کی جان عذاب میں ڈالی۔ اختر کو محبت کا بھروسا دے کر چھوڑ دیا۔ پھول چندر سے تعلقات بڑھائے اور اسے خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ مردوں کو ستانا اس کا شوق ہے۔ مردوں کو خود پر مرتے دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ ان کے جذبات سے کھیلنا اسے خوب آتا ہے۔ خود پسندی میں مبتلا ہے۔ یہ اس کے کردار کا ایک تاریک رخ ہے لیکن اس کا دوسرا رخ تابناک ہے۔ وہ ایک دردمند دل بھی رکھتی ہے اور بعض انسانی قدروں پر کامل یقین رکھتی ہے۔ اس میں ترحم کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے جس کا واقع ثبوت اس وقت فراہم ہوتا ہے جب وہ اس گاؤں میں پہنچتی ہے جہاں وبائی بیماری پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس ناگہانی مصیبت میں شکار لوگوں کی بے بسی اس سے دیکھی نہیں جاتی ہے۔ وہ اختر کی محبت کو بھول کر دل و جان سے ان کی خدمت گذاری اور تیمارداری میں جٹ جاتی ہے۔ خدمت گذار یاکمین کو جب اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اختر چیچک جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہے تو وہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہے۔ کیونکہ اس نے صحت مند اور وجیہ اختر کو چاہا ہے۔ اس اختر سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے جو چیچک کی بیماری میں تڑپ رہا ہے۔ اس نے تو ہمیشہ مرد کے توانا جسم سے محبت کی ہے۔ یاسمین ایک عجیب کردار ہے۔ جسکے کئی رخ ہیں۔

اگرچہ ہندوستانی ریاست نے عورتوں اور مردوں میں باتیں کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن عملی طور پر سماج میں ان کے رول میں واضع طور پر اختیار کیا جاتا ہے حقیقی مسادات اس وقت مکن ہو سکتی ہے کہ جب آئیتی مسالت کو لوگ دل سے مانیں۔ باوجود علاقائی اختلافات کے ہندوستان میں عورت مرد کے بنیادی رول کا تصور بڑی حد تک ایک ہے۔ عورت سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اصلی کام خانہ داری کے امور کو انجام دے۔ گھر والی اور ماں کی حیثیت سے گھر کی دیکھ بھال کرے۔ لوگوں کے تہذیبی طرز فکر کے مطابق بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال صورت ہی کا کام ہے۔ عورت کھیتوں میں کام کرے یا فیکٹری میں نکان کی تعمیر کے کاموں میں ہاتھ بنائے یا دفتر وغیرہ میں کام کرے، اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خانہ داری کا کام اسی طرح انجام د۔ دے جس طرح وہ عورتیں کرتی ہیں، جن کا واحد کام یہی ہے۔ گھر کے باہر عورت کا وہ ت کا وہ بول قابل قبول نہیں

ہے۔ جو مردوں کا ہے۔ جماعت کے معاملات ہوں یا امور حکومت کو انجام دینا ہو ہے بلا شرکت غیرے پیروں کا مخصوص میدان سمجھا جاتا ہے۔ گاؤں کی پہنچا نہیں یا ذات برادری کی کا نہیں مردوں ہی پر مشتمل ہیں (جن میں بعض مسلم ذات پر اوریاں بھی شامل ہیں۔ مرد گھر کے باہر تو ہاتھ کا کام کر سکتے ہیں۔ مگر دہی کام گھر میں کرنا اپنے لیے کسیر شان سمجھتے ہیں، اور اس کے انجام دینے کی توقع عورتوں سے کی جاتی ہے۔ مرد کھانا پکانا، کپڑا سینا پیشے کے طور پر تو اختیار کر لیتے ہیں لیکن گھر میں یہ کام عورتوں کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ عورتوں سے نہیں قسم کے اور میں مقدار میں کام کی توقع کی جاتی ہے وہ مختلف ملاتوں میں اس قدر مختلف ہے کہ یہ تصور کہ کچھ کا کم مردوں کے لیے مخصوص ہیں اور کچھ عورتوں کے لیے من گھڑت معلوم ہوتا ہے۔ شمال مشرقی علاقوں میں کپڑا نے کے کام پر بلا شرکت غیرے عورتوں کا قبضہ ہے، لیکن ہندوستان میں کچھ ایسے بھی حصے ہیں کہ جہاں عورت کرگھے کو چھو بھی نہیں سکتی ہے۔ اس لیے ایسے والدین جن کی کئی لڑکیاں ہوتی ہیں مجبور دوہرے خرچ سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلاتے ہیں۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکی اگر پڑھی لکھی ہوتی ہے تو اس کے والدین کو زیادہ جہیز دینا ہوتا ہے کیونکہ اور اس کے لیے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکا چاہیے جو زیادہ چیز کی توقع کرتا ہے۔ ہمارے خیال میں جہیز کا تصور علاوہ اس کے کہ عورتوں کے لیے ذہنی کوفت اور دماغی خلل کا سبب بن سکتا ہے، ایک سوشلسٹ سماج کے مقصد کے منافی ہے۔ اس سے جنگ کرنے کے لیے متعدد طریقے اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ عورتوں اور مردوں میں بیداری پیدا کر دی جائے۔ شادی بیاہ کے رسوم میں اصلاح کی جائے عورتوں کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کے مرد کے طفیلی بن کر رہنے کے تصور کو قابل ملامت قرار دیا جائے۔ خانہ داری سے متعلق کاموں کی قدر و قیمت پر نظر انی کی جائے اور اس کو معاشی لحاظ سے پیدا اور کام دیا جائے۔ تحفوں اور اجمیر یکی نمایش اور شادی میں شان و شوکت کے اظہار کے لیے بہت زیادہ خرچ کرنے پر پابندی لگادی جائے۔ اور عورتوں کی انجمنوں اخبار، ریڈیو اور تنظیم کو اس رواج کی مخالفت میں خاص طور سے زور شور سے حصہ لینا چاہیے۔ اور عورتوں میں یہ شعور پیدا کرنا چاہیے۔

ذات شریف:

یہ ناول مرزا ی ہادی رسوا کا ناول ہے جو بنیادی طور پر بیمار و انتشار زدہ لکھنوی تہذیب و ثقافت کا عکاس ہے۔ رسوا نے چونکہ لکھنؤ کی زندگی کے بہت قریب سے رہے، اس لیے ان کی نظروں میں سماج کا ہر طبقہ بھی رہا، وہ ہر کسی کی عادات و اطوار سے واقف تھے اسی لیے انھوں نے اپنے ناولوں میں، جس طبقے کی ترجمانی کی، وہ

ان کے سماجی و ثقافتی شعور کا پتہ ہمیں دیتا ہے۔ زیر نظر ناول "ذات شریف" میں بھی رسوا نے دوسرے ناولوں کی طرح لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے، انھوں نے، لکھنو کے بیمار اور انتشار پذیر سماج کا نقشہ کھینچنے کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی ہے جو اس عظیم الشان تہذیب کی تباہی کا باعث بنیں ، گویا لکھنو کی مٹتی ہوئی سماجی قدریں اور نوابین کے لٹے ہوئے طبقے کی ذہنی، معاشی، اخلاقی اور سماجی پستی اس ناول کا موضوع ہے، اس ناول میں رسوا کی کردار نگاری کافی عمدہ ہے۔ مگر اس ناول میں کسی بھی کردار کو مثال بنا کر پیش نہیں کیا گیا۔ اس ناول کے نسوانی کرداروں میں کلثوم بیگم ایک نمایاں کردار ہے جس سے اودھ کی بیگمات کی زندگی کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ گو یہ ناول امراو جان کی طرح دل چسپ نہیں لیکن انسانی فطرت کا نفسیاتی تجزیہ اس ناول کی اہم خصوصیت ہے۔ ذات شریف کے تین اہم کردار ہیں بخشی، امامن اور امجد جن کے اخلاق و عادات امیروں کی اتباع اور مادی ضروریات کی تگ و دو میں بگڑ چکے ہیں اور وہ ریاکاری، تن آسانی، سستی اور کاہلی کا شکار ہیں جبکہ اس ناول کا ایک کردار نواب زادہ ہے یہ ایک ایسی زندگی کا مرقع ہے جس کی زندگی کو گھن لگ چکا ہے۔

حوالہ جات

۱. احتشام حسین، سید، "ادب اور سماج"، کتب پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی، ۱۹۴۸ء، ص ۲۰

۲. صالحہ زریں، "اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ابتدا سے ۱۹۴۷ تک"، سرسوتی پریس، الہ آباد، ۲۰۰۰ء، ص ۴۷

۳. محمد حسن، ڈاکٹر، "ادبی تنقید"، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء، ص ۱۳

۴. اطہر پرویز، "ادب کا مطالعہ"، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۴۳

۵. القرآن، ۲۲۸، ۲

۶. رفیع اللہ شہاب، پروفیسر، "عورتوں کے بارے میں قرآنی احکام"، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۹۷

۷. صالحہ زریں، "اردو اردو ناول کا سماجی اور سیاسی مطالعہ ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک" ص ۸۲

۸. یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی مین اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد۔ دسمبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۸۲

۹. صغرا مہدی، اردو ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۹۶

۱۰. نذر سجاد حیدر، "مذہب اور عشق" مشمولہ: ہوائے چمن میں خیمہء گل، مرتبہ: قرۃالعین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۵۸۲

۱۱. ایضاً، ص ۶۱۰

۱۲. رازق الخیری، سوانح عمری علامہ راشد الخیری، مشمولہ: عصمت، فروری ۱۹۳۹ء، ص ۲۶

۱۳. راشد الخیری، شامِ زندگی، عصمت بک ڈپو، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۲۹

۱۴. حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ و تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۱۱۲

باب پنجم:

ماحصل، نتائج، سفارشات، کتابیات

الف۔ ماحصل:

اردو کے ابتدائی ناول نگاروں نے اپنی تخلیقات کو عصری تقاضوں کے تحت تعلیم کی اشاعت بلکہ سماج کی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ بنا کر پیش کیا۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی معاشرہ نئی تبدیلیوں سے دوچار تھا، انگریزی نظام حکومت کا تسلط ہو چکا تھا۔ اس وقت مسلمان نہ صرف اقتدار واختیار سے محروم ہو گئے تھے بلکہ انتہائی ذلیل و خوار زندگی گزار رہے تھے کیونکہ برسراقتدار قوم کا عتاب براہ راست مسلمانوں پر ہی تھا۔ دوسری طرف مسلمان بھی انگریزوں سے حد درجہ متنفر تھے کیونکہ مسلمانوں سے حکومت چھیننے والے انگریز ہی تھے، فارسی کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی تھی۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مقابلے میں اپنی کمر باندھنی پڑی اور جدید تعلیم کے فقدان کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ انگریز جدید علم خصوصاً سائنس ٹکنالوجی اور دیگر علوم وفنون میں ہندوستانیوں سے سو سال آگے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی دانشوروں نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ اب تک انگریزی زبان سے پوری واقفیت نہ ہو گی اس وقت تک ترقی کی راہیں ہموار نہ ہوں گی، سرسید احمد خاں نے کہا تھا کہ قومی ترقی کا کوئی منصوبہ اس وقت تک شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک کے مغربی علوم پر پوری دسترس حاصل نہ کر لی جائے۔ چنانچہ غدر کے بعد ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ صرف جدید تعلیم کے حصول کا نہیں بلکہ تعلیم سے عام بیزاری کو بھی دور کرنا تھا۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا اور تعلیم کی توسیع واشاعت کے لیے ایک جاندار منصوبہ تیار کیا گیا، ان کی کوشش کسی حد تک بار آور ہوئی۔ علی گڑھ تحریک کا خاطر خواہ فائدہ ہوا، لوگ تعلیم کی طرف راغب ہونے لگے، ڈاکٹر، بیرسٹر اور سرکاری افسروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا لیکن بدقسمتی سے ان ساری کوششوں کے نتیجے میں تعلیم نسواں کی گنجائش یا تو بہت کم تھی یا سرے سے تھی ہی نہیں۔ عورتوں کی اکثریت نہ صرف جاہل تھی بلکہ فرسودہ خیالات و عقائد اور غلط رسم ورواج کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ مردوں کی ایک جماعت تو جدید تعلیم سے آراستہ ہو کر تیار ہو چکی تھی لیکن عورتیں وہی لکیر کی فقیر بنی ہوئی تھیں۔ اس تفریق نے ان کی ازدواجی زندگی میں شدید ناہمواری پیدا کر

دی تھی، بد قسمتی سے اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کے لیے نہ تو بہتر ادارے تھے اور نہ ہی ایسی کتابیں دستیاب تھیں جن کی بنیاد پر کوئی نصاب درس تیار کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ پردہ کی سختی کی وجہ سے لڑکیوں کو لڑکوں کے اسکول میں بھیجنا ناممکن تھا اور پھر زیادہ تر یہ کیوں کی شادی کم عمری میں ہی کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس سماجی پس منظر میں سرسید کے رفقاء میں کچھ لوگوں نے تعلیم نسواں کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ ایسے لوگوں میں مولوی نذیر احمد کا نام سرفہرست آتا ہے اس مقصد کے لیے انہوں نے ناول کو آلہ کار بنایا۔ اردو کا پہلا ناول "مراۃ العروس" ہے، جسے مولوی نذیر احمد نے مستورات کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لئے لکھا۔ مولوی نذیر احمد کے بعد دوسرا اہم نام علامہ راشد الخیری کا ہے۔ راشد الخیری اردو کے منجھے ہوئے افسانہ نگار و ناول نگار تھے۔ ان کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے تھا۔ چنانچہ علامہ راشد الخیری نے بھی ان کے زیر اثر اپنے ناولوں میں صنفِ نازک کے حقوق کی بحالی اور ان کو اپنی اصلاح و ترقی کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ایسے موضوعات کو برتنے کی کوشش کی جو اس زمانے میں عورتوں کے حالات اور اصلاح پر مبنی تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے جس زبان کا انتخاب کیا، وہ بے حد دھلی دھلائی زبان ہے۔ ان کا اسلوب کافی دلکش ہے۔ زیر نظر تحقیق میں راشد الخیری کے جن ناولوں پہ کلام کیا گیا ہے ان ہیں "شام زندگی"، "صبح زندگی" ہیں۔ ان ناولوں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راشد الخیری ناول قلمبند کرتے ہوئے ہر کردار کے لیے رقت کی فضا میں پیدا کرتے ہیں جس سے ان کے ناولوں میں درد کی کیفیت ابھر کر سامنے آتی ہے راشد الخیری کے نزدیک عورت وقار، خلوص، ایثار، قربانی، پاکیزگی اور سچائی کا ایک مجسمہ ہے۔ راشد الخیری نے اپنے ناولوں میں صنف نازک کے ساتھ ہونے والی زیادتیاں اور امتیازی سلوک پہ خصوصی توجہ دلائی ہے۔ وہ ہندوستانی عورت کو انتہائی مظلوم مخلوق تصور کرتے تھے۔ اور اس ظلم سے نکالنے کے لیے انھوں نے اپنے تہیں عورتوں کی بہبود کے لیے اپنے قلم کا خوبصورت استعمال کیا ہے وہ بنیادی طور طبقۂ نسواں کے مصلح تھے اور یہ ان کے ناولوں سے بھی عکاس ہے۔

مرزا ہادی رسوا کا شمار بھی نذر سجاد کے معاصرین میں ہوتا ہے، ان کے دو ناولوں اختری بیگم اور ذات شریف پہ مقالہ ھذا میں تقابلی جائزہ میں گفتگو کی گئی ہے۔ مرزا ہادی رسوا کے ناول "اختری بیگم" (۱۹۲۴ء) کو اردو ادب کے ابتدائی ناولوں میں کلیدی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر لکھنو کی تہذیب کے زوال پذیر طبقے کا نمائندہ ہے جہاں سماجی اقدار ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی ہیں۔ اس ناول کی کہانی ایک لڑکی کے گرد گھومتی ہے جس کا نام "اختری بیگم" ہے۔ اختری بیگم کا واسطہ اس ناول میں جن نسوانی کرداروں سے پڑتا ہے

اور جن کی مدد سے اس کا کردار پھلتا پھولتا ہے ان میں جعفری بیگم، ہرمزی بیگم، اور نادری بیگم شامل ہیں۔ مرزاہادی رسوانے اس ناول میں اپنے کرداروں کے زریعہ انسان کے فطری جذبات کی عکاسی کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ناول اس دور میں لکھا گیا ہے کہ جب برِصغیر میں تعلیمِ نسواں ایک عیب سمجھا جاتا تھا لیکن مرزاہادی رسوا نے ناول" اختری بیگم "زریعے معاشرے میں اصلاح نسواں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور پوری جرات کے ساتھ معاشرے کے ان ناسوروں کی بھی نشاندہی کی ہے جو عورتوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ اس حوالہ سے مرزاہادی رسوا کا دوسرا ناول ذات شریف ہے۔ زیر نظر ناول "ذات شریف" (۱۹۰۰ء) میں بھی رسوانے دوسرے ناولوں کی طرح لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کی بھر پور عکاسی کی ہے اور اس بیمار اور انتشار پذیر معاشرے میں عورت کی مظلومیت پر خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔ لکھنو کی مٹتی ہوئی سماجی قدریں اور نوابین کے لٹے ہوئے طبقے کی ذہنی، معاشی، اخلاقی اور سماجی پستی اس ناول کا موضوع ہے، اس ناول میں رسوا کی کردار نگاری کافی عمدہ ہے۔ لیکن اس بات میں کافی حد تک سچائی پائی جاتی ہے کہ "ذات شریف" میں وہ کیف و کم نہیں ہے جو عموما مرزاہادی رسوا کے دوسرے ناولوں کا خاصہ ہے۔

مرزاہادی رسوا کے علاوہ نذر سجاد کے معاصرین میں ایک اہم نام پریم چند کا ہے جنھوں نے اپنے ناولوں میں عورتوں کے حقوق کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں بے شمار نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے جن کے زریعہ عورت کے مختلف مسائل کو ابھارا ہے عورت کی پامالی، شکستگی اور کسمپرسی ان کے ناولوں کا ایک خاص موضوع ہے۔ اس حوالہ سے ان کے دو ناول زیر نظر تحقیق میں زیر بحث آئے ہیں جن میں ایک نرملہ اور دوسرا ناول بیوہ ہے۔ نرملا میں پریم چند نے عورتوں کی زندگی سے متعلق کئی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے مثلا بیوگی، بے جوڑ شادی اور جہیز سے پیدا ہونے والے مسائل وغیرہ جن کے نتیجے میں ایک پاکیزہ عورت بھی طوائف بن جاتی ہے۔۔ اس ناول میں جہیز کی رسم پہ شدید نقد کیا گیا ہے اور ان تقاضوں کی اہمیت کو عیاں کیا گیا ہے جن کی پاسداری ازدواجی اور سماجی زندگی کو خوشگوار بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پریم چند کا دوسرا ناول بیوہ ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے ہندوستانی معاشرے میں بیوہ کی زندگی کی تلخیوں کا بیان پوری فنی بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔ پریم چند کا کمال یہ ہے وہ اپنے تخلیق کردہ کرداروں میں عورت کو اس کی تمام تر فطری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے نسوانی کرداروں کی تشکیل میں ہر کردار کی نفسیات کا جس ڈھنگ اور خوبی سے خیال رکھا ہے اس نے پریم چند کے

کرداروں کو زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔ مذکورہ بالا ناول نگاروں کے علاوہ اس صف میں ایک نام مرزا محمد سعید کا ہے۔ مرزا سعید کا شمار ان محدود چند ناول نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے تحلیل نفسی کو بنیاد بنا کر اپنے ناولوں کے کرداروں کی نفسیاتی پیش کش پہ خصوصی توجہ دی۔ ان کے دو اہم ناول اس مقالہ میں زیر بحث رہے ہیں ان میں ایک خواب ہستی اور دوسرا ناول یاسمین ہے۔ خواب ہستی بنیادی طور ہر ایک اصلاحی ناول ہے جس میں مرکزی حیثیت حسن افروز کو حاصل ہے جو طوئف ہونے کے باوجود فطرتاً معصوم عورت ہے سنجیدگی، خدمت گذاری اور شوہر پرستی اس کے ہر عمل میں نمایاں ہے۔ جبکہ مرزی سعید کا دوسرا ناول یاسمین جو ایک کرداری ناول ہے۔ اور اس ناول کے زریعہ مرزا سعید نے دو کردار تخلیق کیے ایک یاسمین ہے جس کے نام پہ یہ ناول ہے اور دوسرا کردار صفیہ ہے۔ یاسمین مرزا سعید کے پہلے ناول خواب ہستی کے کردار شمیم کی کاپی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں چند ایسی خوبیاں بھی ہیں جو اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ یاسمین تمام تر خامیوں کے باوجود فطرت کے تقاضوں کی باغی نہیں مثلاً وہ ایثار، رحم، خدمت گذاری کے جذبات وغیرہ کی حامل بھی ہے۔

ایک سوال سطحِ ذہن پہ جنم لیتا ہے کہ آخر ناول ہی کو کیوں اس عظیم مقصد کے لئے چنا گیا؟ اس سلسلے میں مولوی نذیر احمد خود ہی فرماتے ہیں: ان عورتوں کے خیالات کی اصلاح اور ان کے عادات کی تہذیب ہو اور کسی دلچسپ پیرایہ بیان میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے"۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ نا پختہ ذہن کو ایسے دقیق مسئلے کی طرف متوجہ کرنے کے لئے عام فہم اور دلچسپ پیرایہ بیان استعمال کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ اس وقت عورتوں کی ذہنی صلاحیت کسی ادق فلاسفی اور خشک مضامین کی اہل نہ تھی۔ اگر اس مقصد کے حصول کے لیے لمبے چوڑے مضامین یا تقاریر کا سہارا لیا جاتا تو شاید کامیابی کی یہ صورت نظر نہیں آتی کیونکہ مضامین یا تقاریر کو لوگ اپنے اوپر لادی جانے والی چیز سمجھ کر اس سے گھبراتے اور کتراتے لیکن جب ان ہی باتوں کو کہانی کی شکل میں انسانی کردار کے ذریعے ان کے سامنے پیش کیا گیا تو لوگ اس سے خاصے متاثر ہوئے۔

اردو کی ابتدائی ناول نگاری کے اس عبوری عہد میں داستانوں کی رنگین رومان پرور فضاؤں سے انحراف کر کے دیو پریوں کے بجائے عام انسانی کرداروں کو منظر عام پر لانا کوئی آسان کام نہ تھا لیکن عصری تقاضوں کے تحت اس عہد کے مصلحین دانشوروں اور مفکروں کے ساتھ ساتھ جب فنکاروں اور ادیبوں نے بھی معاشرتی اور تہذیب زندگی کے مختلف مسائل کا مطالعہ شروع کیا تو ادب ایک نئے مفہوم سے روشناس ہوا

جس سے نہ صرف اس کی ہیت میں تبدیلی آئی بلکہ اس کے مواد اور اسلوب میں بھی تبدیلی آنی شروع ہوئی۔ داستانوں کی جگہ ناول نگاری کی ابتدا ہوئی، دیو پریوں کی رومان پرور قصوں کے بجائے انسانی زندگی کے مختلف سماجی اور تہذیبی مسائل کو ناول کا موضوع بنایا گیا۔ اس عہد کا ایک اہم مسئلہ تعلیم خصوصاً تعلیم نسواں تھا۔ چنانچہ اردو کا پہلا ناول "مراۃ العروس، تعلیم نسواں کے موضوع پر لکھا گیا، اس عہد کے بیشتر ناول نگار جہالت کو ہندوستانی مسلم خواتین کی زبوں حالی اور پستی کی تنہا وجہ تصور کرتے تھے، وہ اس بات پر متفق تھے کہ جہالت نے ان کے اندر احساس کمتری رجعت پسندی انا قاعات اندیشی، روایت پرستی اور تنگ نظری جیسی برائیاں پیدا کر رکھی تھیں چنانچہ ناول نگاروں نے جہالت کے خلاف ایک نعرہ بند کیا اور ناول کو اس مقصد کے حصول کے لیے ایک نہایت ہی موثر وسیلہ بنا کر پیش کیا، اس عہد کے ناول نگاروں نے جن نسوانی کرداروں کا انتخاب کیا ان میں عموماً دو طرح کے کردار ہوتے تھے۔ ایک اچھائیوں کا پیکر ہوتا تو دوسرا برائیوں کا مظہر، ناول نگار ان ہی دو طرح کے کرداروں کا موازنہ کرکے قارئین کے ذہن کی تربیت کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح ایک انسان اچھی تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول ایک مخصوص عہد کی پیداوار ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اردو کہانی اس کا شاید داستانوں کی رنگین وادیوں میں بلکتی رہتی ہیں۔ ہم ان تمام قلم کار اور دانشوروں کا ذکر ثقافت اور تعلیم عوام کی نشاندہی کے لیے کرتے ہیں جنھوں نے اردو کہانی کو داستانوں کی عجیب و غریب فضا سے نکال کر ناول کے نئے سانچے میں ڈھال دیا چنانچہ ان ناولوں نے نہ صرف اس عہد کی اکتسابی ضرورتوں کو پورا کیا بلکہ ہندوستانی مسلم خواتین کو بدلے ہوئے حالات کے تحت زندگی کے نئے مفہوم سے آشنا کیا اور ان کے ذہن کو جدید علوم و فنون کی روشنی سے منور کیا۔

ب۔ نتائج:

زیرِ نظر تحقیق میں میں نے نذر سجاد حیدر، راشد الخیری، مرزا ہادی رسوا، پریم چند اور مرزا محمد سعید کے منتخب کردہ نادلوں سے استنباط کیا ہے جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ ایسے نفس مضمون سے ہے جن کے ذریعے ہندوستانی مسلم خواتین کو جدید علوم و فنون خصوصا مغربی علوم سے واقفیت کرانے اور معاشرے میں اصلاحِ نسواں کی روشنی پھیلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہندوستانی مسلم خواتین کے لیے ایک تاریخی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے انھیں رجعت پسندی، تعصب، جہالت پس ماندگی

عقائد اور رسومات کی تنگ و تاریک فضا سے نکال کر روشن خیالی، وسعت نظری اور اعلی فکری اور عملی دنیا سے روشناس کیا۔ ان ناولوں سے نہ صرف اس عہد کے معاشرے کی دھڑکنوں کو کھوجا جا سکتا ہے بلکہ ہم اپنے تہذیبی ا ثقافتی او تعلیمی سفر کا بھرپور جائزہ بھی لے سکتے ہیں اور اس پس منظر میں ہم اپنے موجودہ معاشرے کے رجحانات کی بہتر نشاندہی بھی کر سکتے ہیں۔

I ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے مسلمانان ہند کی ترقی کے لیے جہاں اور بہت سی تدابیر کیں اصلاحِ نسواں بھی ان کا ایک بہت بڑا مقصد تھا۔ اگر اس زمانے کی مسلم عورت کا تصور کیا جائے تو گھر کی چار دیواری میں بند علم و عقل سے بے بہرہ زندگی کے مسائل سے بے خبر اور محض بچے جننے والی ایک مشین کا ہیولا ابھرتا ہے۔ حالانکہ اس وقت آزادی نسواں کی تحریک پورے ایشیا میں زور پکڑ چکی تھی۔ اور ترکی کی نامور ادیبہ خالدہ ادیب خانم اور ہندوستان کی مسز سروجنی نائیڈو اسی ضمن میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی تھیں۔ لیکن مسلم معاشرے کا حال برا تھا۔ لوگ اپنی بچیوں کو مدرسوں میں بھیجنے پر آمادہ نہ تھے۔ پردے کی پابندیاں اپنی جائزہ حدود سے سے کہیں آگے تھیں اور یہ مسلمانوں کے انحطاط کا ایک بڑا سبب تھا۔ اس سنگین مسئلے کو پیش نظر رکھ کر اصلاحِ نسواں کا نعرہ بلند کیا اور مرد ناول نگاروں نے ناول لکھے۔ بلاشبہ یہ قصہ نما ناول عورتوں کے لکھے ہوئے نہیں ہیں اور ان کے لکھنے میں مردوں نے پہل کی مگر پھر بھی یہ حقیقت فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا موضوع عورتوں ہی کے مسائل ہیں۔ تعلیم مفقود ہونے کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں جو جہالتیں پیدا ہو چکی تھیں زیادہ تر طبقہ اس کا شکار تھا۔ بے شمار ہندوانہ توہمات اور رسومات نے اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ اور مسلمانوں کے گھرانوں کی عورتیں گمراہی اور شرک کی حد تک جا پہنچی تھیں۔ معاشرے میں نئی روشنی کی بدولت بدلتے ہوئے حالات سے مرد تو براہ راست متاثر ہوئے تھے لیکن گھر کی چار دیواری میں بند پردہ نشینوں کو یہ موقع نہ ملا تھا۔ جہیز اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا بڑھتا ہوا رواج جن سے عورت کی سماجی حیثیت گھٹ جاتی ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ تحریک آزادی کے زمانے میں عورتوں کی حیثیت کے جو معیار قائم ہوئے تھے وہ اب رجعت کی طرف مائل ہیں۔

علاقائی زبانوں کے رسالوں کے مضامین کے تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پچھلی دو دہائیوں میں عورتوں اور ان کے مسائل کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ نئے سماجی قوانین سے بہت سی عورتیں اب بھی ناواقف ہیں۔ یہ درست ہے کہ سماج کے ادارے اور رویے تیزی سے نہیں بدلے مگر عورتوں کی فلاح و ترقی کے عمل میں تیزی اس طرح سے لائی جا سکتی ہے کہ انہیں میں سوچ بچار کے بعد منصوبہ بندی کو ششیں کی

جائیں۔ اس کی ذمہ داری ریاست سماج اور ان سب لوگوں پر یکساں ماند ہوتی ہے، جو عورتوں اور مردوں میں مساوات کے قابل ہیں۔ ہم ان سب کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ اس بارے میں رائے عامہ کو ہموا کریں اور ان کوششوں کو تقویت پہنچائیں جو رہیں طرح کے رواجوں، جیسے کم کنی کی شادی، تعدد ازدواج، بہتر اور شادی میں لیے جا اصراف کے انسداد کے لیے کی نجارہی ہیں۔ اور انھیں ہیں ہمیں پھلائی چاہیں کہ عورتوں میں اپنے قانونی حقوق کا زیادہ سے زیادہ شعور ہو۔ اخبار، ریڈیو ہم فلم جنھوں نے اب تک لوگوں کی توجہ صحیح رخ کی طرف موڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

II مجموعی طور پر ہم کہ سکتے ہیں کہ مولوی نذیر احمد نے کئی اور آئیڈیل کرداروں کا انتخاب بھی کیا ہے جن میں خاص طور پر یہاں جس کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے وہ ہے "حسن آراء، جو اصغری کے بالکل برعکس ہے اور انسانی خصوصیتوں کا پیکر اس کردار میں اچھائیاں بھی ہیں اور انسانی کمزوریاں بھی۔ اس کردار کے جلو میں مولوی نذیر احمد نظر نہیں آئے بلکہ یہ کردار بذات خود ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ اس سے لغزش بھی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی اصلاح بھی کرتی ہے، کم و بیش دوسرے ناول نگاروں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے، ان تمام ناولوں میں اصلاح اور مقصدیت کا رنگ ہوتے ہوئے بھی ان کے نسوانی کرداروں میں ایک انفرادیت کا احساس پایا جاتا ہے۔ اختر النسا کا کردار بھی اصغری سے بالکل ملتا جلتا ہے، اس کردار میں بھی ایک ارتعاشی کیفیت ہے۔ اصغری کی طرح جانی اور سپاٹ نہیں، یوں راشد الخیری نے بھی نسیمہ کے کردار کو اصغری کے رنگ میں پیش کیا ہے لیکن نسیمہ کا کردار اصغری سے زیادہ متحرک اور جاندار ہے۔ اسی طرح طلعت آرا بیگم کے کردار کو کردار نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ کہنا بیجانہ ہوگا کیونکہ اس کردار میں انسانی لوازمات کی پوری جلوہ گری ہے۔ اپنی عمر اور حالات کے مطابق وہ بتدریج آگے بڑھتی ہے دراصل وہ عہد ایک اسلامی عہد تھا۔ ناول نگاروں نے ایک مقصد کے تحت ناول لکھنا شروع کیا انہوں نے اپنے ناولوں میں کرداروں کو بھی اسی انداز سے پیش کیا تاکہ ہندوستانی مستورات اور ان کا اثر خاطر خواہ ہو اس کے علاوہ ناول نگاری کا وہ دور بھی ایک ابتدائی دور تھا۔ داستانوں کی رنگین وادیوں کو چھوڑ کر ناول نگاری کی روایت شروع کی گئی۔ اس مثبت رویے کا اثر یہ ہوا کہ ناول نگار زندگی کے مسائل اور اس کی حقیقتوں کو موضوع بنانے لگے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں لکھے جانے والے ناولوں میں خواتین کی تعلیمی، سماجی، اور اصلاحی حیثیتوں اور اس راہ میں حائل رکاوٹوں کو موضوع بنایا گیا۔

مذکورہ بالا تمام ناولوں میں کہانی کا مرکزی کردار عورت اور اس کی زندگی سے جڑے تمام تر مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے بلکہ ان مسائل کے اسباب اور ان سے چھٹکارا پانے کے طریقے بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔ نذیر احمد، حالی اور آزاد نے بالخصوص قصے اور کہانی کو قومی مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا۔ یہ بات نہایت واضح طور پر ان تصانیف سے معلوم ہوتی ہے جن میں ادیبوں کا فکری رجحان تقریباً ایک جیسا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے اسلوب میں جدا کسی مقصد میں ہم آواز ضرور ہیں۔ نذیر احمد کی مراۃ العروس ۱۸۶۹ء حالی کی مجالس النساء "کریم الدین کی تعلیم النساء ۱۸۷۴ء اور آزاد کی نصیحت کا کرن پھول "۱۸۶۴ء معاشرتی اصلاح کے نظریے ہی میں وحدت فکر کی حامل نہیں بلکہ ادب میں بھی اس نظریاتی ہم آہنگی کا پتا دیتی ہیں جو غدر کے بعد ہندوستانی ادیبوں میں پیدا ہو رہی تھی۔ یہ کتابیں بچے بچیوں کی اخلاقی ذہنی اور معاشرتی تربیت کے اس نظام کو پیش کرتی ہیں جس پر مشرقی تہذیب کا مکمل اثر ہے اور ان مسائل کو بیان کرتی ہیں جو اس وقت کی زندگی کا موضوع تھے۔ تعویذ گنڈوں پر بے جا اعتقاد نے عورتوں کی عقلی ترقی پر جو پہرے بٹھا دیئے تھے ہندوستان کی قومی زندگی پر اس کا اثر برا پڑ رہا تھا اور یہ وہی عورتیں تھیں جو نئی تعلیم کو گمراہی خیال کرتی تھیں اور بیٹیوں کا پیدا ہونا نحوست جانتی تھیں اور اپنی بے عقلی سے نئی زندگی کی اچھائیوں کو بھی بڑا سمجھتی تھیں۔

اُردو کی پہلی باقاعدہ ناول نگار خاتون رشیدہ النساء بیگم ہیں جنہوں نے ایک اصلاحی سماجی اور مقصدی ناول "اصلاح النساء" تحریر کیا۔ اس کا سن اشاعت ۱۸۹۴ء ہے لیکن چونکہ مصنفہ نے دیباچے میں تیرہ برس مسودہ پڑے رہنے کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے اس کا سن تصنیف ۱۸۸۱ء بنتا ہے۔ اس زمانہ میں خواتین کا پڑھنا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور مسلم معاشرے کی ایک روایت یہ تھی کہ شریف زادیاں اپنا نام نہیں ظاہر کرتی تھیں اس لئے پٹنہ صوبہ بہار کی اس خاتون نے بھی اصلاح النساء" میں اپنا تعارف اصل نام کے بجائے یوں کرایا ہے: والدہ محمد سلیمان بنت سید وحید الدین خال و ھمشیرہ سید امداد امام اثر۔ تاہم بعض محققین نے رشیدہ النساء کا دوسرا نام خدیجتہ الکبریٰ بھی بیان کیا ہے۔ یہ خاتون اُردو کے نامور ادیب محقق اور مذہبی اسکالر امداد امام اثر اثر کی بہن تھیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے "اصلاح النساء" مسلمان بیبیوں کی اصلاح کے لئے ضبط تحریر میں لایا گیا۔ اس کا بڑا مقصد مسلمان گھرانوں میں در آنے والی لغو رسومات اور توہمات کا در آنا تھا۔ جبکہ نذر سجاد حیدر نے ہندوستانی عورت کی پستی، تعلیم کی کمی اور دیگر سماجی مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا جو اصلاحِ نسواں کی حد تک ان کے معاصرین سے مشترک اور اسلوبِ بیان اور کرداروں کے رویے اور ترجیحات کی بنا پر ان سے مختلف ہے۔

III نذر سجاد حیدر کے تذکرے کے بغیر اُردو کی اولین قصہ گو خواتین کا بیان نامکمل رہے گا۔ آپ نے تقریباً دس ناول اور دو سو افسانے لکھے۔ اختر النساء"" آہ مظلومان (۱۹۳۰) جان باز (۱۹۳۵) نجمہ "اور" حرماں نصیب "(۱۹۳۸) ان میں سے زیادہ مقبول شادی سے پہلے بنت نذر الباقر کے نام سے ادبی حلقوں میں ہوئے۔ نذر سجاد حیدر روشناس ہو چکی تھیں۔ "جان باز" کی ہیروئین زبیدہ سیاسی تحریک سے متاثر ہو کر کھدر پہنتی ہے اور غیر ملکی اشیاء کا استعمال ترک کر دیتی ہے۔ جبکہ اس کا منگیتر قمر کپتان پولیس مغربی طور طریق کا شیدا ہے۔ وہ امن بھی قائم کرتا ہے اور ظاہری چمک دمک اسے پسند ہے۔ چنانچہ وہ اپنی منگیتر کو چھوڑ کر ایک خوبرو ماڈرن دوشیزہ نجمہ سے شادی کر لیتا ہے۔ نجمہ شادی کے بعد بھی کمتر درجے کے کلبوں میں جاتی ہے اور غیر مردوں کے ساتھ ڈانس کرتی ہے۔ شوہر اسے منع کرتا ہے مگر وہ پروا نہیں کرتی۔ یہ ناول نذر سجاد حیدر کے سارے ناولوں میں سے زیادہ دلچسپ اور زور دار ہے۔ کہانی کو بڑی مہارت سے گوندھا گیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ پلاٹ تہ در تہ ہونے کے باوجود اپنے اندر کوئی جھول نہیں رکھتا اسے مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ فیروزہ کے دادا نے جاپان سے بغرض تجارت بمبئی میں آکر ایک ایرانی خاتون سے شادی کر لی تھی۔ وہ خود تو ہندوستان ہی میں مقیم رہے البتہ فیروزہ کے والدین جاپان چلے گئے۔ یہ لوگ کروڑپتی سیٹھ تھے۔ "حرماں نصیب" کا انجام برا حقیقت پسندانہ، تنظیمات دلفریب اور اسلوب تمر جاذب نظر ہے۔ منظر نگاری میں تو مصنفہ کو کمال حاصل ہے۔ وہ ذہانت اور قوت مشاہدہ سے ہر منظر کی خوبصورت مصوری کرتی ہیں۔ نذر سجاد حیدر نے "حرماں نصیب" میں جیتے جاگتے زندگی کی لگن سے پڑ کردار پیش کئے ہیں اور ان کے احساسات کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ پورا ناول گویا جذبات کا ایک بہتا ہوا دھارا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے جن ناول نگار خواتین نے لکھنا شروع کیا ان کے مد نظر یقیناً نذیر احمد اور حالی کے لکھے ہوئے ابتدائی قصے تھے جن کا مرکزی کردار ہندوستان کی مسلمان عورت تھی اور جن کا بنیادی خاکہ ہندوستانی عورتوں کے مسائل پر مبنی تھا۔ اختر النساء بیگم "ایک تعلیم یافتہ سگھڑ لڑکی کا قصہ ہے جس نے سوتیلی ماں کی دشمنی سے بڑی جگہ بیاہے جانے پر سخت اذیتیں اٹھائیں اور آخر اپنی روشن خیالی سے ان سب مشکلات پر قابو پایا۔ کہا جاسکتا ہے کہ نذر سجاد حیدر نے اصلاحِ نسواں کے لیے جو ناول لکھے وہ ہندوستانی خواتین کے معاشی، سماجی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے کے لیے مختلف تجاویز پیش کرتے ہیں جس سے نہ صرف ان مسائل میں عورت کی مظلومیت کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ اسے معاشرے مین اپنا مقام حاصل کرنے کی صورت نظر پڑتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس جائزہ کا اختصار یہ ہے کہ گوتم بدھ کی راہبات نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تقریباً چار سو سال پہلے اُتر پردیش کی خانقاہوں اور جنگلوں میں اپنے لافانی نغمے لکھے۔ ان شاعرات کے نام تاریخ کی کتابوں میں آج تک محفوظ ہیں۔ جہاں تک اُردو زبان میں ناول نویسی کا تعلق ہے ایک بات بالکل واضح ہے کہ دنیا تمثیل اور داستان . کے دیگر ممالک کی مانند برصغیر میں بھی ناول کے بعد کی پیداوار ہے۔ اُردو کی پہلی تمثیل بابائے اُردو مولوی عبدالحق کی تحقیق کے مطابق قطب شاہی دربار سے وابستہ ادیب ملا وجہی کی "سب رس" ہے جس کا زمانہ تخلیق ۱۹۳۵ء ہے۔ داستان نویسی کا آغاز اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا۔ اور زیادہ تر داستانیں شمالی ہند میں ہی لکھی گئیں۔ اُردو کی پہلی قابل ذکر داستان میر عطا حسین تحسین کی "نو طرز مرصع" ہے جو ۱۷۷۵ء اور ۱۷۸۱ء کے درمیانی عرصہ میں لکھی گئی۔ حیدر بخش حیدری کی طوطا کہانی" ۱۸۰۱ء اور " آرائش محفل" ۱۸۰۲ء کے علاوہ خلیل خاں اشک کی "داستان امیر حمزہ" ۱۸۰۱ء اور رجب علی بیگ سرور کی "فسانہ عجائب" ۱۸۲۴ء بھی اپنے زمانے کی مقبول ترین داستانیں رہی ہیں۔ ابتدائی دور کے قصہ نماناول یاناول نما قصہ نے انہی داستانوں کے بطن سے جنم لیا۔ چنانچہ میر امن دہلوی کی مشہور داستان باغ و بہار " ۱۸۰۱ء ناول نگاری کی جانب پہلا مستحسن قدم ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بھی داستان ہی کی طرز اور تکنیک پر لکھی گئی تاہم اس میں داستان کی خصوصی فضا بہت دھندلی ہے۔ اس میں فوق فطری عناصر بہت کم ہیں۔ جادو کے کرشمے اور جن و پری کے قصے اس میں قطعی نہیں ہیں۔ اس کا قصہ حقیقی زندگی سے بہت قریب ہے۔ مگر اس میں کردار نگاری قطعی نہیں ہے۔

چاروں درویش سیرت کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ عشق میں ناکام ہو کر درویش بن جاتے ہیں۔ ان کا مجازی عشق روحانی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان چاروں کے قصے الگ الگ ہیں انہیں مربوط کرنے کے لئے آزاد بخت کا قصہ تراشا گیا۔ اردو کے ابتدائی ناول کے کردار نہایت ہی بیجان اور سپاٹ ہوتے ہیں، ان کے اندر زندگی کی کوئی گرمی نہیں ہوتی بلکہ ان کے وجود کا انحصار ناول نگاروں کی مرضی پر ہوتا ہے، ناقدین کے ان خیالات سے کسی حد تک اتفاق تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی باتوں کو کلی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو کے ابتدائی ناول نگاروں کے یہاں کردار نگاری کا فقدان رہا ہے، کیونکہ ان کا اسلوب ہی کچھ ایسا اختیار کیا گیا جس میں بیانیہ انداز زیادہ تھا اور مکالمے کم، اور اگر مکالمے ہیں بھی تو وہ تقریر کے انداز میں بیان کئے گئے ہیں جنہیں پڑھکر ایسا گمان ہوتا ہے کہ مصنف خود ان کرداروں کے اندر چھپا بیٹھا ہے مثلاً مولوی نذیر احمد نے اصغری کے کردار کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ بعض اوقات وہ عام انسانی جبلتوں

سے بالکل عاری نظر آتی ہے جیسے اس کی اپنی کوئی انفرادیت نہ ہو اور نہ ہی کوئی پہچان بلکہ وہ ایک فرشتہ سیرت انسان ہو جس میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، لیکن عام انسان کی خصوصیتوں سے بالکل مملو اصغری کی مثال۔ یہ تمام باتیں بالکل درست ہیں اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جن کی پہلی کتاب مراۃ العروس "١٨٦٩ء میں شائع ہوئی۔ اس لحاظ سے مراۃ العروس اُردو کا پہلا ناول ہے۔ مولوی نذیر احمد نے یہ کتاب قصے کے پیرائے میں اپنی بیٹیوں کو امور خانہ داری اور مذہب واخلاق کی تعلیم دینے کی غرض سے تصنیف کی۔ اکبری اور اصغری دو بہنوں کا یہ قصہ سراسر مقصدیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اکبری کو ماں باپ کے بے جالاڈ پیار نے بگاڑ دیا تھا اس لئے وہ پھوہڑ بیوی ثابت ہوئی۔ غرور اور تنک مزاجی کے سبب اس کا انجام بڑا ہوا۔ جبکہ اصغری اچھی عادات کی مالک ہونے کی وجہ سے اپنے سرال میں پسند کی گئی اور پورے گھر پر چھا گئی۔ نذیر احمد کے دیگر ناول "بنات النعش "توبتہ النصوح "ابن الوقت "اور "فسانہ مبتلا" بھی اسی انداز کے اخلاق آموز ناول ہیں۔

اسی مقصد کے حصول کے لئے نذیر احمد نے "مراۃ العروس" اور حالی نے "مجالس النساء" ایسے قصے تحریر کئے جو اُردو کے اولین ناول سمجھے جاتے ہیں۔۔ اور اصغری یا مریم زمانی جیسے نسائی کرداروں ہی کی بنیاد پر ان کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ نذیر احمد کی کتابوں نے خواتین کی تعلیم وتربیت میں بڑا حصہ لیا۔ ان کو پڑھ کر انہیں پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ ان کی زندگی میں بھی بعض مسائل ہیں جن کا حل ہوئے بغیر ان کی زندگی ادھوری ہے۔ یہی احساس تھا جس نے آگے چل کر اظہار کی مختلف صورتیں اختیار کیں۔ عورت کی وکالت کا جو کام نذیر احمد اور ان سے متاثر ہو کر دوسرے مردوں نے اپنایا تھا اُسے عورتوں نے خود شروع کیا اور اس طرح وہ قصے سامنے آنے شروع ہوئے جنہیں ناول کی ابتدائی اور خام صورت کہنا چاہیے۔ یہ ناول مولوی نذیر احمد کے ناول " مراۃ العروس" سے متاثر ہو کر اسی کی کا انسداد تھا۔ لکھا گیا جیسا کہ خود مصنفہ نے ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ اللہ مولوی نذیر پیروی میں ان کی کتاب پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ احمد کو عاقبت میں بھی بڑا انعام وجہاں تک ان کو معلوم تھا انہوں نے لکھا اور اب جو ہم جانتے ہیں اس کو انشاء اللہ تعالیٰ لکھیں گے۔ جب اس کتاب کو لڑکیاں پڑھیں گی تو مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ سب اصغری ہو جائیں گی۔ شاید سو میں سے ایک اپنی بدقسمتی سے اکبری رہ جائے تو رہ جائے رشیدۃ النساء نے خواتین کے مسائل اور خامیوں پر مبنی ایک قصہ لکھ کر ان کی اصلاح کی کوشش کی۔

گویا نذیر احمد کی طرح انہوں نے بھی مقصدیت کو مد نظر رکھا اور کرداروں کو اپنی منشاء کے مطابق دو حصوں میں بانٹ دیا۔ خیر و شر کے حساب سے ان کی تقسیم کر دی گئی۔ ایک سراسر خوبیوں کے مالک بن گئے اور دوسرے سراسر شیطان صفت۔ ایک گروہ ترقی پسند اور دوسرا رجعت پسند بن کر سامنے آیا۔ مثلاً امتیاز الدین کی والدہ اور گھر والے فرسودہ رسوم کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ بسم اللہ کا خاندان ہر نوع کی بدعت میں مبتلا ہے۔ چونکہ مصنفہ کا مقصد رجعت پسندی کو غلط ثابت کرنا ہے اس لئے بسم اللہ اور اس کی ماں زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور اپنے ہاتھوں پیدا کئے ہوئے ناخوشگوار حالات سے گھبرا کر بالآخر خیر کی جانب مراجعت کرتی ہیں۔ کہانی کہنے کا یہ انداز ہو بہو مولانا نذیر احمد کا سا ہے۔ بلکہ کرداروں تک کے نام مولوی نذیر کے انداز کی غمازی کرتے ہیں مثلاً محمد واعظ اشراف النساء وغیرہ۔ تاہم اس زبردستی کی اخلاقیات کے بنیادی سقم کے باوجود رشیدۃ النساء کا یہ ناول فنی طور پر نذیر احمد کے ناولوں سے کہیں بہتر اور زیادہ معتبر ہے۔

مولوی نذیر احمد نے اصغری اور حسن آرا، جیسے آئیڈیل کرداروں کے ذریعہ تعلیم نسواں کی افادیت اور اس کی برکتوں کا پیغام ہندوستانی مسلم خواتین تک پہنچانے کی کوشش کی، اسی طرح نذر سجاد حیدر کے ناول "اختر النسا بیگم" کی اختر، ناول "نجمہ" کی کردار نجمہ، ناول "ثریا" کی ثریا اور راشد الخیری کے ناول صبحِ زندگی کی نسیمہ، مرزا ہادی رسوا کے ناول "اختری بیگم" کی اختری وغیرہ کرداروں کو بطور آئیڈیل پیش کر کے ہندوستانی مسلم خواتین کے ذہن کو اخلاقی اور مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ کی اہمیت سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔ اس عہد کے نسوانی کرداروں پر مولوی نذیر احمد کا اثر صاف دکھائی دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان تمام کرداروں میں بڑی حد تک یکسانیت نظر آتی ہے، ان میں سے بیشتر نسوانی کردار ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے اعلیٰ متوسط طبقے سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کی بدلتی ہوئی قدروں، جاگیردارانہ ذہنیت، طبقاتی احساس کے ساتھ ساتھ بیگمات کے طور طریقے، رہن سہن، انداز گفتگو، محاورے، رسم و رواج انوک جھونک وغیرہ ان سب کی تفصیلات ہیں ان کرداروں کے ذریعہ معلوم ہوئی ہیں جن سے اس عہد کے مزاج کو آسانی کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ برملا کہا جاسکتا ہے کہ نذیر احمد ناولوں میں سپاٹ قصے اور وعظ کے سوا کوئی تہذیبی منظر کشی یا معاشرتی تصویر نہیں ابھرتی۔

رشیدۃ النساء نے اپنے زمانے کی خصوصاً نسوانی معاشرت کی ایسی بھرپور عکاسی کی ہے کہ اس کے زور بیان اور قوت مشاہدہ کو داد دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔ اسی بنا پر اُردو کے نامور نقاد پروفیسر سید وقار عظیم

نے "اصلاح النساء" کو "مراۃ العروس" پر ترجیح دی ہے۔ اسی طرح ایک اور محقق شعیب معظم نے بھی یہی رائے قائم کی ہے۔ "اصلاح النساء" اس دور کی رسموں اور اوہام کا گنجینہ ہے اور اگر کبھی ہم اپنی معاشرتی تاریخ لکھیں تو اس کتاب سے ہمیں بہت مدد ملے گی۔ رشیدۃ النساء کی گھریلو زندگی پر گہری نگاہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے مشاہدات سے پورا پورا استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنے ناول میں کردار نگاری اور جزیات نویسی کی شاندار مثال پیش کی ہے۔ رشیدۃ النساء کے کردار معاشرے کے جیتے جاگتے افراد ہیں

جب ۱۹۰۹ء میں مولوی سید ممتاز علی نے بچوں کا ہفتہ وار اخبار پھول" جاری کیا تو اس کی اعزازی مدیرہ میں نذر الباقر ہی کو مقرر کیا جو نوشہرہ (کوہاٹ) سے مضامین ایڈٹ کر کے دار الاشاعت پنجاب لاہور بھجواتی تھیں۔ حتی کہ ایک بار بنک سے قمر کے جعلی دستخطوں کے ساتھ کئی ہزار روپے بھی نکوا لیتی ہے۔ بالآخر اس کی روز روز کی بدکاریوں سے تنگ آ کر قمر اسے گھر سے نکال دیتا ہے۔ اور خود کچھ عرصہ کے لئے رخصت لے کر قومی جلسوں میں شرکت کرنے لگتا ہے۔ ایسے ہی ایک جلسہ میں اس کی زبیدہ اور اس کے گھر والوں سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ وہ زبیدہ سے نادم ہوتا ہے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔ زبیدہ چونکہ اب بھی اسی سے پیار کرتی ہے اس لئے معاف کر دیتی ہے۔ نجمہ ایک اور پارسی شخص پیٹن جی کی دولت کے لالچ میں آ کر قمر سے طلاق لے لیتی ہے اور پھر قمر زبیدہ سے شادی کر لیتا ہے۔ حرماں نصیب" ناکام مُحبت فیروزہ کا افسانہ غم ہے۔ ایک مرتبہ دادا اپنی پوتی فیروزہ اور اپنے پوتے فیروز کے ساتھ گرمیوں کا موسم گزارنے موری گئے۔ وہاں ڈیرہ دون کے ایک رئیس زادے ظفر سے فیروزہ کی محبت کا آغاز ہوا۔ پھر فیروزہ اور اس کا اکلوتا بھائی مسوری میں ہی پڑھنے لگے۔ دادا نے انہیں ایک کو بھی خرید دی۔ فیروزہ سکول سے کالج میں پہنچی اور ظفر پانچ سال کے لئے انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے ولایت چلا گیا۔ پھر اچانک بیمار ہو کر فیروز خدا کو پیارا ہو گیا۔ بہن جو اسے بے انتہا چاہتی تھی اس کے صدمے سے نڈھال ہو گئی۔ بے چارے دادا بھی شدت غم سے مر گئے۔ جب ظفر ولایت سے واپس آیا تو اس نے ایک خانقاہ کے پاس کسی جھونپڑی میں فیروزہ کو دیکھا جو بھائی کے سوگ میں تارک الدنیا ہو چکی تھی۔ اس کی مایوسی کی یہ انتہا تھی کہ ایک مرتبہ اگر ظفر عین موقع موقع پر نہ پہنچ جاتا تو وہ انگوٹھی کا نگ نگل کر خودکشی کر چکی ہوتی۔ اب اس کے والدین جاپان چھوڑ کر بمبئی آ چکے تھے۔ اور وہ اسے وہاں بلا رہے تھے لیکن وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔

ظفر کی شادی کی درخواست بھی اس نے رد کر دی۔ اگلے روز ظفر اور اس کے بھائی صفدر نے اسی جھونپڑی میں ایک اور مرد کو دیکھا جو فیروزہ سے بڑا بے تکلف تھا۔ صفدر نے شبہ ظاہر کیا کہ فیروزہ بے وفا ہے

اس لئے اسے بھول جانا چاہیے۔ دوسرے ہی دن فیروزہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ مایوس و نامراد ظفر نے والدین کے اصرار پر شادی کر لی۔ چند برس بعد جب اس کے دو بچے تھے اور اپنے خاندان کے ہمراہ مسوری میں قیام پذیر تھا تو اس کی فیروزہ سے دوبارہ ملاقات ہوئی جو اپنے بھائی کی قبر پر تلاوت کر رہی تھی۔ مسوری ہی میں وہ مسٹر اسحاق ڈپٹی کمشنر سے بھی ملا جو فیروزہ سے شادی کا متمنی تھا۔ فیروزہ نے ظفر کو بتایا کہ اس کے ماں باپ اگرچہ اسحاق کو ہاں کہہ چکے ہیں مگر وہ آج بھی صرف دو ہستیوں سے پیار کرتی ہے۔ ایک اس کا پیارا دوست ظفر جو اب شادی شدہ ہے اور کسی دوسری عورت کی امانت ہے۔ دوسرا اس کا پیارا بھائی فیروز جو مر چکا ہے۔ اسحاق سے جان چھڑانے کے لئے وہ بمبئی سے ڈاکٹری کرنے کے بہانے امریکہ چلی گئی تھی۔ اب پانچ سال بعد واپس آئی ہے اور سیدھے مسوری پہنچی ہے۔ اسحاق کو اس نے صاف صاف جواب دے دیا ہے اور اس کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ بھائی کی آخری آرام گاہ کے قریب ایک ہسپتال تعمیر کر کے غریبوں کا مفت علاج کرے گی تاکہ فیروز کی روح کو ثواب پہنچے۔ ظفر کو انہی ملاقاتوں میں پتہ چلا کہ چند برس پیشتر فیروزہ کی کوٹھڑی میں نظر آنے والا مرد اس کا سگا چاچا تھا جو اسے بمبئی سے لینے وہاں پہنچا تھا۔ ظفر کا دل پچھتاوے اور بیوی بچوں کی زنجیروں کے بوجھ سے تڑپ اٹھا۔ مگر فیروزہ نے اس سے کہا کہ ان دونوں کی قسمت میں یہی لکھا تھا اس لئے اب انہیں حوصلے سے اپنی اپنی زندگی گزارنا چاہیے۔

اس حوالے سے اس تلاطم خیز جذباتی منظر کو دیکھیے جس میں ظفر اور فیروزہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں، ظفر کچھ نہ بولا- فیروزہ نے خود اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبائے۔ پھر آنکھوں سے لگائے اور وہ سوار ہو کر رخصت ہوا۔ دونوں کے سینے وفور رنج و غم سے پھٹ جانا چاہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے سامنے دونوں ضبط کئے رہے۔ مگر رکشہ کا بڑھنا تھا کہ خون دل ظفر کی آنکھوں میں امنڈ آیا۔ ادھر فیروزہ گھر جا کر ایک صو-ن پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ "حرماں نصیب" بیسویں صدی کے ابتدائی ناولوں میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔ اس میں ڈپٹی نذیر احمد جیسے واعظ نظر آتے ہیں نہ شرر کی طرح مصنفہ کرداروں کی انگلی پکڑ کر انہیں کسی خاص سمت میں لے جاتی ہے۔ اور نہ ہی سرشار کی مانند اس میں کہیں ابتذال یا گھٹیا مذاق ہے۔ نذر سجاد حیدر کا پورا گھرانہ علم و ادب کا رسیا تھا۔ ان کے شوہر سید سجاد حیدر یلدرم ایک صاحب طرز افسانہ نویس تھے اور ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر اُردو ادب کی ایک نامور ہستی ہیں۔ نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا بنیادی موضوع نئے رجحانات کو اپنانا تھا کہ زندگی بہتر طریقے پر گزاری جاسکے۔ وہ ذاتی طور پر انگریزی تعلیم کو پسند کرتی تھیں مگر ساتھ ہی ساتھ بے جا آزادی اور بے راہ روی کے خلاف تھیں۔ مغرب کی

اندھا دھند تقلید انہیں پسند نہیں تھی۔ ان کے ناول اس طبقہ کی بہت عمدہ اور حقیقی نمائندگی کرتے ہیں جس نے پچھلی صدی کے آخر اور اس صدی کے شروع میں سلطنت عثمانیہ کے اُوپری طبقے کی طرح یورپی تہذیب اپنانا شروع کر دی تھی۔ انہوں نے اس طبقے کی عکاسی کی جس کی لڑکیاں پردے میں تھیں لیکن یورپین گوریاں انہیں انگریزی پڑھاتی اور پیانو سکھاتی تھیں۔ آج سے نصف صدی قبل نذر سجاد نذر سجاد حیدر جس ہندوستانی مسلم معاشرے کا حصہ تھیں اس میں ان کو جدت پسند عورت سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں میں ان اولین خاتون رہنماؤں میں سے تھیں جنہوں نے لاتعداد بے زبان عورتوں کی حمایت میں آواز اُٹھائی اور انہیں مردوں کے پنجہ استبداد سے رہا کرانے کی جدوجہد کی۔ ان کے متعدد افسانے اور ناول اسی جدوجہد کی غمازی کرتے ہیں۔فاطمہ بیگم منشی فاضل کے تذکرے کے بغیر بھی ابتدائی دور کی ناول نگار خواتین کا بیان نامکمل رہ جائے گا۔

آپ کے ناول "صبر کا پھل" "کرنی کا پھل" لالچ کا شکار "وفائے. مغرب" اور "غیرت کی پتلی" اس عہد کے شاہکار ناولوں میں شمار ہوتے تھے اور قارئین نے انہیں سند قبولیت دی تھی۔ فاطمہ بیگم ادیبہ ہونے کے علاوہ ایک سماجی کارکن بھی تھیں۔ فاطمہ بیگم ناول لکھنے کا فن جانتی تھیں۔ ہر چند کہ اصلاحی پہلو ان کے مد نظر رہتا، تاہم وہ پلاٹ، کلامکس انداز بیان اور حقیقت پسندانہ رویہ سے اپنے قصوں میں جان ڈال دیتیں تھیں۔ ان کا یاد گار ناول "صبر کا پھل" ہے۔ اس ناول کی ہیروین کلثوم ایک آسودہ حال گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی چچیرے بھائی محمد اکرم سے ہوئی جو اسٹنٹ انجینئر تھا۔ اکرم کی بہن جب جوان ہوئی تو اسے کلثوم کے بھائی سے بیاہ دیا گیا۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ جب کلثوم کے سر وفات پا گئے تو اس کے شوہر نے ولایت جا کر انجینئرنگ پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تابناک مستقبل کی اُمید میں کلثوم نے بادل نخواستہ اجازت دے دی۔ زاد راہ کے لئے زیورات بیچ دئے گئے۔ شوہر لندن چلا گیا تو اس نے چھوٹے دیور کی مدد سے اُردو پڑھنا لکھنا سیکھی۔ قرآن شریف تو پہلے ہی سے پڑھی ہوئی تھی۔ دو چار ماہ کی شب و روز محنت سے وہ خط لکھنے لگی۔ ہر ہفتہ شوہر کو ایک چٹھی بھیجتی۔ جس کا جواب تواتر کے ساتھ آتا۔ اسی دوران کلثوم کو اللہ نے ایک بیٹی عطا کی۔ وہ کتابوں کے مطالعے اور بچی کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ یکایک اکرم کے خط آنا بند ہو گئے۔ اس نے ایک فرنگی عورت سے شادی کرلی اور ہندوستان میں اپنے ایک دوست بیرسٹر نار احمد کو لکھ بھیجا کہ وہ اس کا آبائی مکان بیچ کر رقم انگلستان بھجوا دے۔ جب مکان بھی بک گیا تو کلثوم اپنے دیور اور بیٹی کے ہمراہ میکے چلی گئی۔ اس کی نند بھائی اور دیور بھی اس کا بہت خیال رکھتے۔ لیکن اس کا دل

کسی بات میں نہ لگتا۔ جیسے تیسے وقت گزر گیا اور محمد اکرم بڑا انجینئر بن کر وطن واپس لوٹا۔ میم اس کے ہم رکاب تھی۔ اس نے اپنی پہلی بیوی بہن اور چھوٹے بھائی سے لاتعلقی کا اظہار کیا۔ کچھ دنوں بعد بیرسٹر صاحب کی بیوی نے کلثوم اور اکرم کی چائے پر ڈرامائی ملاقات کرائی۔ محمد اکرم نے اپنی بیٹی نجمہ کو پیار کیا اور کلثوم سے معافی کا طلب گار ہوا۔ اس نے بتایا کہ اس کی دوسری بیوی بڑی سخت گیر ہے اور اگر اسے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے تو وہ قیامت برپا کر دے گی۔ کچھ دنوں بعد کلثوم نے بیرے کی مدد سے میم کے ہاں ملازمت کرلی اور اپنی سلیقہ مندی سے اسے گرویدہ کر لیا۔ وہ پردے کے بہانے محمد اکرم سے چھپی رہی لیکن آخر کار اس کا یہ راز کھل گیا۔ میم نے بڑا ہنگامہ کیا۔ اکرم نے مصلحت اس میں سمجھی کہ کلثوم کو چلتا کرے۔

تاہم اس کا ضمیر جاگ اُٹھا اور اسے کلثوم کی اتھاہ محبت کا احساس ہوا ایک روز انجینئر صاحب اپنی فرنگی بیوی کے ساتھ ایک دعوت میں شریک تھے کہ ننھی نجمہ کھیلتی کودتی مردانے میں چلی گئی۔ باپ نے اسے دیکھا تو والہانہ گود میں لے لیا۔ کلثوم ایک کھڑکی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس پر ایسا جذباتی اثر ہوا کہ چکرا کر گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ شور سن کر مردانے کے لوگ بھاگے۔ محمد اکرم نے اپنی وفاشعار بیوی کو پہچان لیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اتنے میں میم بھی آپہنچی۔ اس نے بھری محفل میں انجینئر صاحب کی بے عزتی کی۔ سیدھی گھر پہنچی اور اپنا سامان باندھنے لگی۔ محمد اکرم نے عدالت کے خوف سے اسے بہلا پھلا کر رام کیا۔ کلثوم اس صدمے سے بیمار ہو گئی۔ نیک دل خاتون اختر بیگم کے اصرار پر محمد اکرم اس کی تیمارداری کے لئے پہنچا تو میم کو بھی پتہ چل گیا۔ اس نے اختر بیگم کے گھر چھاپہ مارا۔ سخت تو تو میں میں ہوئیں۔ میم نے دیوانگی میں ننھی نجمہ کو اٹھا کر پتھریلے فرش پر پٹخ دیا۔ اس کے سر سے خون کا فوارا پھوٹ نکلا۔ محمد اکرم یہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے میم کو طمانچہ رسید کیا۔ پھر کیا تھا۔ میم بولی: میں اس شخص کو جب تک جیل خانہ نہ دکھاؤں گی پانی نہ پیوں گی۔" اس نے عدالت میں محمد اکرم کے خلاف دھوکہ دہی کا مقدمہ دائر کیا۔ کئی روز بعد دس ہزار روپے دے کر محمد اکرم نے اس مصیبت سے کی۔ میم نے دو ماہ بعد ہی کسی بیرسٹر سے نکاح کر لیا اور لڑکا باپ کے پاس بھیج دیا۔ کلثوم دوبارہ اپنے گھر آباد ہوئی اور اسے "صبر کا پھل" ملا۔ فاطمہ بیگم کا ناول "صبر کا پھل" ایک تہ در تہ قصہ ہے۔ جس کا ہر کردار زندگی کا حصہ نظر آتا ہے۔ مصنفہ نے کرداروں کے عملی خدوخال کو رفتہ رفتہ نمایاں کیا ہے۔ جزیات نگاری اعلیٰ درجہ کی ہے۔ جذبات کا تلاطم بھی ہے اور اسلوب بیان کی سحر انگیزی بھی۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف صبر کا پھل ہی ایک خوبصورت ناول نہیں بلکہ فاطمہ بیگم کے دیگر ناول بھی اسی معیار کے قصے ہیں۔ وہ اپنے دور کی ایک قد آور قصہ گو تھیں اور ان کی تحریریں آج بھی پڑھنے والوں کے

دل پر اثر کرتی ہیں۔ تقریباً نصف صدی گزر جانے کے باوجود ان کے ناولوں سے دلچسپی اور حسن تحریر کے عناصر مفقود نہیں ہوئے۔ گزشتہ سطور میں چند ابتدائی قصہ گو خواتین کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا گیا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جنہوں نے اس میدان میں خدمات سرانجام دیں۔ احمیدہ سلطان دہلوی (ثروت آرا بیگم) ظفر جہاں بیگم (اختری بیگم) جمیلہ بیگم (فیروزہ) اور صدیقہ بیگم سیوہاروی جنہوں نے اپنے اپنے جداگانہ رنگ میں اُردو ناول لکھے اور ادب کی خدمت سرانجام دی۔ یہ وہ دور تھا جب مولونا نذیر احمد علامہ راشد الخیری عبدالحلیم شرر اور پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے ناول نگار اردو کی ادبی دنیا کے حاکم سمجھے جاتے تھے۔ مسلمان خواتین اپنی سماجی پابندیوں اور مجبوریوں کے باعث ان کے برابر مشاہدہ نہ رکھتی تھیں۔ انہیں تعلیم میں بھی پیچھے رکھا گیا تھا۔ اور سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ یہ مردوں کے مکمل غلبے کا معاشرہ تھا۔ اس کے باوجود خاتون ادیبوں نے جب قلم ہاتھ میں لیا تو مردوں سے کسی طور پر پیچھے نہیں رہیں۔ اور ادب کے طالب علم بخوبی آگاہ ہیں کہ نذیر احمد نہ صرف اپنے پہلے ناول "مراۃ العروس" میں بلکہ بعد کے ناولوں "توبتہ النصوح" "فسانہ مبتلا" وغیرہ میں بھی ایک واعظ اور ناصح ناول نویس کے طور پر سامنے آئے جبکہ بہت ہی ناول نویس خواتین نے اس خامی سے اپنے قصوں کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ مثلاً اصلاح النساء روشک بیگم۔ جہاں نصیب اور صبر کا پھل وغیرہ میں ہمیں یہ ستم کہیں نظر نہیں آتا۔ ان ناولوں میں مقصدیت اور اصلاح اپنی جگہ ہے۔ مگر اسے فن پر یا قصہ کی دلچسپی پر کہیں حاوی ہونے نہیں دیا گیا۔ اسی طرح راشد الخیری جو "مصور غم" کہلاتے تھے اپنی تحریروں میں جابجا جذباتی ہوگئے اور انہوں نے کرداروں کے منہ میں اپنی زبان ٹھونس دی۔ اس کے مقابلہ میں ناول نگار خواتین نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے تقریباً بھی قصے یا ناول طبقہ نسواں ہی کے گرد گھومتے ہیں اور اس طبقہ کی زبان کو ان سے بہتر کوئی مرد ادیب نہیں جانتا۔

سرشار جو اپنی پھبتیوں اور ہنسی ٹھٹھول کی وجہ سے بام شہرت پر پہنچے، ان کا فسانہ آزاد چین کے مشہور اولین ناول نویس سروائٹس (Cervantes) کے ڈون کو ٹکٹ (Don Quixote) کی نقل میں کسی منصوبہ بندی یا واضح ضابطے کے بغیر بالا قساط تحریر ہوا۔ باقی بچے مولانا شرر جنہیں تاریخی ناولوں کی وجہ سے مقبولیت ملی۔ درحقیقت وہ ایک بہتر کردار نگار نہ تھے کیونکہ ایرانی و تورانی کرداروں کو ہندوستانی انداز میں پیش کرنا ان کی غلطی تھی۔ اور پھر وہ اسلامی جذبے کے بہاؤ میں ایسی ایسی باتیں رقم کر گئے جو دراصل غیر یقینی دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے برعکس ان قصہ گو خواتین نے محض یاوہ گوئی اور جگتوں سے اپنے قصوں کو سجایا، نہ عظمت رفتہ کے حوالے سے تاریخ کے حقائق کو مسخ کیا۔ پند و نصائح کے دفتر کھولے اور نہ ہی رونے دھونے پر

اکتفا کیا۔ بلکہ یہ ایک حیرتناک امر واقعہ ہے کہ ان اہل قلم خواتین نے اپنے عہد کے ان چاروں نامور مصنفوں سے کچھ نہ کچھ لے کر اپنے ایک خاص صاف ستھرے انداز میں قصے تحریر کئے۔ نذیر احمد سے انہوں نے مقصدیت راشد الخیری سے درد و گداز، شرر سے اسلامی اخوت اور سرشار سے ظرافت لے کر ان سب چیزوں کو ایک خوبصورت لڑی میں پرو دیا۔ خواتین کے یہ ناول مردوں کے لکھے ہوئے ناولوں سے بہت ممیز ہیں۔ ان کی ایک ۔سب سے بڑی صفت اپنے عہد کی ہو بہو معاشرتی تصویر کشی ہے۔

مردوں کے ناولوں میں ماسوائے سرشار کے جو کہیں کہیں کچھ رسمیں بیان کرتے ہیں یہ تہذیبی نمونے ناپید ہیں۔ رشیدۃ النساء کے ناول "اصلاح النساء" ہی کو لیجئے، اس میں مہد سے لے کر لحد تک کے سارے سماجی رویے موجود ہیں۔ بچے کی پیدائش پر کیا رسمیں ہوتی تھیں۔ شادی بیاہ پر کونسے ہنگامے بپا ہوتے تھے۔ اور پھر وفات کے وقت کیا ہوتا تھا۔ یہ سب کچھ جاننے کے لئے رشیدۃ النساء کا یہی ایک ناول کافی ہے۔ دوسری خواتین نے بھی اپنے قصوں میں رسوم و رواج کی اسی طرح خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ کچھ مثالیں تو گزشتہ صفحات میں پیش کی جاچکی ہیں چند ایک نمونے اور ملاحظہ ہوں: "مسز وقار نے دونوں ہاتھوں میں قرآن شریف اور تلوار دے کر وکیل صاحب کو بیگم صاحبہ کے پیچھے اس طرح کھڑا کیا کہ ان کا سایہ پڑتا رہے اور اپنے اور امائی بیگم کے سہارے آہستہ آہستہ چلاتی مع لڑکی اور اس سامان کے باہر لائیں۔ وکیل صاحب کی آنکھیں شرم سے بند ہوئی جاتی تھیں۔ اور سالی کے حکم سے بیوی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلے آتے تھے۔ باہر لا کر چاروں طرف کے سات سات تارے زچہ سے گنوائے۔ پھر چاروں کونوں کو دم کروایا اور چاروں کونوں میں ایک ایک مٹھی کھیلیں پھینکیں۔" سلام کرو مبارک سلامت کا غل مچ گیا۔ ناک میں نتھ ڈاک دی گئی اور دولہا کا جھوٹا شربت دولہن کو پلایا گیا کھانے کے بعد شاہجہان بیگم دولہن کو گود میں لائیں۔

بیگم صاحبہ اور زیب النساء بیگم نے منہ دیکھا۔ بیگم صاحبہ نے منہ دیکھ کر زمرد و الماس کی جہانگیریاں پہنائیں اور زیب النساء نے بازوبند پہنایا بعد دلہن کو اندر اُٹھالے گئے۔ دولہا اندر آیا۔ پھر آراء بیگم اس رسم کے بعد دلہ نے بلائیں لیں۔ ڈھائی ہزار روپیہ چاندی کی کشتی میں لگا کر سلامی کا دیا اور بیگمات نے حسب توفیق سلامی دی۔ بارہ بجے شب کو بارات رخصت ہوئی۔ "عالیہ بیگم اور رشتہ دار بیگمات نے ہمایوں فر کی بلائیں لی۔ دعائیں دیں۔ بہار النساء بیگم اور مریم بیگم نے سر پر دوپٹہ کے آنچل ڈالے ہوئے دولہا کو منڈے تلے چاندی کی چوکی پر کھڑا کیا۔ ادھر ادھر دونوں بہنیں چو طرف بیاں جیسے شمع پر پتنگوں نے ہجوم کیا۔ ڈومنیاں رسم کرنے

لگیں۔ لال ڈوری لے کر دولہا کے گلے میں ڈال کر گانا شروع کیا۔ ہریالا ڈورے ڈامیاں چھڑائے کوئی آئے چھڑائے تیری میا چھڑائے تیری بہنا۔

ہماری معاشرتی زندگی میں ان رسموں کی جو اہمیت ہے اُسے ان ناول نگار خواتین نے پوری طرح محسوس کیا اور ان کی تفصیلات بیان کرتے وقت پورے فنی خلوص اور انہماک سے کام لیا ہے۔ کبھی کبھی اُن ناولوں میں رسوم کا ذکر اس انداز میں بھی آیا ہے کہ بعض کردار بدلے ہوئے حالات میں ان توہمات سے نجات حاصل کرنے کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ بہر حال ان رسموں کی یا توہمات کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت مسلمہ ہے اور ان کے پیچھے سماج کے جو خیالات، احساسات اور نظریہ حیات کا پرتو ہے، وہ انہیں تاریخ کا ایک بیش قیمت سرمایہ بنا دیتا ہے۔ اور یہ بیش بہا سرمایہ ہمیں عورتوں کے ناولوں کی بدولت ہی ملا ہے۔ دوسری صفت ان ناولوں کی یہ ہے کہ ان کے لکھنے والیاں رجعت پسند نہ تھیں۔ انہوں نے ہندوستان میں آزادی نسواں اور تعلیم نسواں کو اپنا موضوع بنایا۔ یہ بات بھی نہیں کہ انہوں نے اپنی مشرقی تہذیب اور روایات کو چھوڑ کر مغربی تہذیب اپنانے کا درس دیا ہو۔ بلکہ انہوں نے ایک بیچ کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ ان کے قصوں کے کردار مشرق کی اخلاقی قدروں کے پابند بھی ہیں اور نئے زمانے کے تقاضوں کی پکار پر لبیک بھی کہتے ہیں۔

ان ناول نگاروں نے اپنے گردوپیش کی زندگی کا مطالعہ کر کے اپنے قریبی ماحول میں زندگی بسر کرنے والے مردوں اور عورتوں کے دلوں کی دھڑکن سن کے اور تاریخ کے ہاتف کی آواز پر لبیک کہہ کر ایک ایسے ماحول کی تشکیل کی ہے جس میں مشرقی روایات اور مغربی جدت کا بہترین امتزاج ہے۔ انہوں نے اس ماحول میں سے اُبھرنے اور جنم لینے والے جن کرداروں کو اپنے مسلک کا پیرو اور پابند بنایا ہے۔ اُن میں کہانی پڑھنے والوں کے لئے یقیناً ایک کشش ہے۔ ایسی مثالیں تو ناول نگار خواتین کے ہاں کثرت سے ملتی ہیں جن میں ہیرو یا ہیروئن انگلستان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہاں کے اثرات قبول کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مثلاً "روشنک بیگم" کے ہیرو ہمایوں فر اور "حرماں نصیب" کی ہیروئن نیروزہ ہر چند کہ لندن سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن لوٹے ہیں مگر ان کے کردار اور مزاج میں جو مشرقیت رچی بسی ہے وہ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔۔ حتیٰ کہ "صبر کا پھل" کا ہیرو محمد اکرم انجینئر، جو لندن کے قیام میں دوسری شادی کر لیتا ہے اور واپسی پر امیم "کو ساتھ لے آتا ہے۔

آخر کار وہ بھی اپنی وفا شعار بیوی کلثوم کی طرف پلٹ آتا ہے اور گستاخ و بدلحاظ میم کو چھوڑ دیتا ہے۔ جو کردار مغرب کی اندھا دھند تقلید میں سرشار اپنی تہذیبی روایات سے یکسر باغی نظر آتے ہیں ان کا انجام بخیر

نہیں ہوتا۔ مثلاً "جان باز" کی نجمہ۔ جو نیم عریاں لباس پہن کر کلبوں میں ڈانس کرتی ہے اور ہر چھوٹے موٹے انگریز سے ملنے ملانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اپنے شوہر کی نظروں میں گر جاتی ہے۔ اور بالآخر اسے طلاق ہو جاتی ہے۔ ان ناولوں میں مشرقی و مغربی اقدار اور تہذیب کا تصادم بھی نظر آتا ہے اور امتزاج بھی۔ اس کے علاوہ ایک تیسری خصوصیت جو ان ناول نگار خواتین کو مرد ناول نگاروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اُن میں سے اکثر ناولوں کا پس منظر ایک خاص عہد کے امیر مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ہے۔ یہی مسلمان ہیں جو ایک طرف تو مٹتے ہوئے جاگیر دارانہ نظام کی تہذیبی قدروں کے نگہبان ہیں اور دوسری طرف اس کی فرسودگی اور بربادی کے مظہر۔ اس بات کی نامور نقاد سید وقار عظیم کے ان جملوں سے، تائید ہوتی ہے: یہ عکس جس کامیابی اور خوبصورتی سے عورتوں کے لکھے ہوئے ان قصوں اور ناولوں میں نمایاں کیا گیا ہے، اتنا مجموعی حیثیت سے مردوں کے لکھے ہوئے ناولوں میں نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مظاہر بڑی حد تک گھر کی چار دیواریوں میں پروان چڑھے اور زندگی کی آخری سانسیں لے رہے ہیں، ان پر عورتوں کی نظر زیادہ ہے کہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور اس کی اچھائیوں اور برائیوں سے ان ہی کی زندگی متاثر بھی ہوتی ہے۔ ان ناول نگار خواتین نے اپنے ناولوں میں برصغیر کی جاگیر دارانہ مسلم تہذیب کا ایک ایسا عکس کھینچا ہے جس کے رنگوں میں اندرون خانہ مناظر کی کئی جھلکیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ میں ان میں پلاٹ کی حسن ترتیب کردار نگاری کی تعمیر و تشکیل، واقعہ نگاری کی باریک بینی قصہ گوئی کی دلکشی، حقیقت اور تخیل اور مقصد اور صد اور فن کے امتزاج کی ایسی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں جو ناول نگاری کے ایک اچھے آنے والے دور کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اردو زبان کی یہ اولین قصہ گو خواتین سیدھی سادی زندگی کی ترجمان تھیں۔ ہر چند کہ جدید علوم ابھی ان کی دسترس میں نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنے گرد و پیش میں جو کچھ دیکھا اسے بلا کم و کاست ایک صاف ستھرے اور شائستہ اسلوب میں بیان کر دیا۔ ان کے پاس جو بھی جذبات اور احساسات تھے اُنہوں نے اُن کو ہی زیب قرطاس کر دیا۔ ان خواتین کے جذبہ اخلاص کی داد دینے کے لئے بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ آخر کیوں نہ کھلے دل سے یہ اعتراف کیا جائے کہ سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے زیر اثر ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی نے غیر حقیقی اور لا حاصل داستانوں کے بجائے جس حقیقت پسندانہ اور مقصدی قصہ گوئی کا آغاز کیا اسے خواتین نے زیادہ مستحکم اور ٹھوس روایت بخشی اور اُنہی کے گراں قدر تجربوں کی بنیاد پر آج کے جدید ناول کی شاندار اور پر شکوہ عمارت کھڑی ہے۔

اس تمام بحث کا حاصل یہ ہے کہ ہم ایسے نئے معیار اور ادارے کو، قائم کرنے میں ناکام رہے ہیں، جن کی بدولت عورتیں اس قابل ہوسکیں کہ ہندوستانی سماج کی توقع کے مطابق اپنے متعدد رول ادا کرسکیں۔ دستور نے ہندوستانی عورتوں کو جن حقوق اور مواقع کی ضمانت دی ہے ان کی اکثریت اس سے فائدہ نہیں اٹھا رہی ہے عورتوں کو ان کے حقوق و فرائض کے بارے میں بنیادی معلومات بہم پہنچانے کے لیے کچھ نہیں کیا ہے۔ انھیں اس پر آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ اس معاملے میں زیادہ سرگرمی دکھائیں۔ خاص طور پر فلم بنانے والوں در اشتہار دینے والوں کے خلاف ان شکایات پر بھی توجہ دینا چاہیے جو ہمارے سامنے پیش ہوئی ہیں کہ وہ لوگوں کے سامنے عورت کا ذلت آمیز تصور پیش کرتے ہیں، اس طرح کہ وہ عورت کا محض جنسی پہلو دکھاتے ہیں، جس سے جنسی جرائم اور بے راہ روی کو نشہ ملتی ہے اور عورت کی سماجی حیثیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اصلاح نسواں کے لیے تعلیمِ نسواں لازم ہے اور معاشرے میں خواتین کے تمام مسائل کا حل اصلاحِ نسواں ہی سے ممکن ہے۔

ج۔ سفارشات:

اس سے پہلے تعلیم نسواں اور اصلاح نسواں پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی کام کیے گئے ہیں مگر خصوصاً نذر سجاد حیدر اور ان کے معاصرین کے ناولوں میں اصلاحِ نسواں کے تناظر میں تعلیمی، اخلاقی اور سماجی حوالوں سے تحقیقی کام کم ہی سامنے آیا ہے۔ اصلاح نسواں پر کام کے حوالے سے چند سفارشات پیش کی جا رہی ہیں:

۱۔ اصلاحِ نسوں کے لیے الگ رسائل شائع کیے جائیں جن میں چھپنے والی تحریروں میں اصلاحِ نسواں کی فکر ادبی معیارات کے مطابق شامل کی جائے اور ان تحریروں کو ادب کا حصہ بنایا جائے۔

۲۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں بھی اصلاحِ نسواں کے عناصر تلاش کیے جائیں اور نئے عہد کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر تحقیقی کام کیا جائے۔

۳۔ دورِ حاضر میں اصلاحِ نسواں پر لکھے جانے والے ناولوں کی الگ فہرست مرتب کی جائے اور ان کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔

۴۔ اعلی تعلیمی درسگاہوں اور اداروں میں تعلیم نسواں ،اخلاقِ نسواں اور خواتین کی سماجی حیثیت پر مبسوط لیکچر دیے جائیں اور پر مغز مقالے لکھے جائیں۔

۵۔ پرنٹ میڈیا، الیکٹرونک میڈیا اور سوشل میڈیا پر بھی اصلاحِ نسواں کے تصور کا پرچار کیا جائے اور معاشرے میں اس حوالے سے آگاہی بہم پہنچائی جائے۔

۶۔ اصلاح نسواں کے موضوع پر اہم اور کلاسیکی مصنفین کی تحریروں کو تواتر کے ساتھ رسائل میں شائع کرنے کی سفارش کی جاتی ہے تاکہ قارئین ان سے مستفید ہو سکیں۔ اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ رسائل میں نئے لکھنے والوں کے لیے اصلاحِ نسواں جیسے موضوع پر لکھنے کے لیے تربیت گاہیں قائم کی جائیں۔ نسائی ادبی شماروں میں شائع ہونے والی تحریروں کے فکری، فنی، ادب عالیہ ، مقبول عام افسانوی ادب اور پاپ فکشن کے حوالے سے رجحانات کی تربیت کے لیے یونیورسٹی کی سطح پر خصوصی کلاسز کا اہتمام کیا جائے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

پریم چند، منشی، بیوہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۵۵ء

پریم چند، منشی، نرملا، اردو پبلک لائبریری، لاہور، 2006ء

راشد الخیری، علامہ، صبحِ زندگی، درویش پریس، دہلی، ۱۹۲۸ء

راشد الخیری، علامہ، شامِ زندگی، عصمت بک ڈپو، دہلی، ۱۹۳۹ء

محمد سعید، مرزا، خوابِ ہستی، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء

محمد سعید، مرزا، یاسمین، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء

نذر سجاد حیدر، ہوائے چمن میں خیمہءگل، مرتبہ: قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۴ء
(مشمولہ ناول: اختر النسا بیگم، نجمہ، حرماں نصیب، آہِ مظلوماں، جاں باز، ثریا، مذہب و عشق)

ہادی رسوا، مرزا، "اختری بیگم"، کتب خانہ علم و ادب، کراچی ۱۹۵۲ء

ہادی رسوا، مرزا، "ذات شریف" اشرفی بک ڈپو، لکھنو، سن اشاعت ندارد۔

ثانوی ماخذ:

آل احمد سرور، ادب اور نظریہ، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء

ابن حنیف، ہزاروں سال پہلے، مکتبہ کارواں، لاہور، ۱۹۶۰ء

ابن حنیف، دنیا کا قدیم ترین ادب، بیکن پبلی کیشنز۔ ملتان، ۱۹۸۷ء

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اردو ادب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۷۵ء

احتشام حسین، سید، ادب اور سماج، کتب پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی، ۱۹۴۸ء

احتشام حسین، سید، افکار و مسائل، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

اشرف، کنور محمد، ہندوستانی معاشرہ عہدِ وسطیٰ میں، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

اطہر پرویز، ادب کا مطالعہ، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹۶۶ء

افتخار عالم بلگرامی، سید، حیات النذیر، شمسی پریس، دہلی، ۱۹۱۲ء

پریم چند، منشی، مضامین پریم چند، مرتبہ: قمر رئیس، ڈاکٹر، مطبع مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

جہاں، سلطان، خطباتِ سلطانی، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۳ء
حسینی، علی عباس، ناول کی تاریخ و تنقید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۸ء
رجب علی بیگ، سرور، فسانہ عجائب، مرتبہ: رشید حسن خاں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء
رفیع اللہ شہاب، پروفیسر، عورتوں کے بارے میں قرآنی احکام، دوست ایسوسی ایٹس، لاہور، ۱۹۹۶ء
ریحانہ اختر نقوی، ڈاکٹر، اردو کے نمائندہ ناولوں میں نسوانی کردار ۱۸۶۹ سے ۱۹۴۷ تک، بیسویں صدی پبلیکیشنز، دہلی، ۱۹۸۷ء
زینت بشیر، ڈاکٹر، نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، ۱۹۹۱ء
سوزن بیسنٹ، ترجمہ، توحید احمد، تقابلی ادب: تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، جون ۲۰۱۵ء
سیمیں ثمر فضل، ڈاکٹر، ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ، اے ون فوٹو آفسیٹ، دہلی، ۱۹۹۱ء
سیمون ڈی بووا، دی سیکنڈ سیکس، مترجم: یاسر جواد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۳ء
شرافت حسین شفقت، سید، عورت، مذہب اور حکومت، نسیم بک ڈپو، لاہور، ۲۰۱۶ء
شیخ آدم، ڈاکٹر، مرزا رسوا- حیات اور ناول نگاری، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۸ء
صغرا مہدی، اردو ناولوں میں عورتوں کی سماجی حیثیت، سجاد پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
عزیز احمد، ترقی پسند ادب، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد، ۱۹۴۵ء
عظمی فرمان، ڈاکٹر، نسائیت ایک تعارف، مشمولہ: اردو ادب اور تانیثیت، مرتبہ: قاضی عابد، ڈاکٹر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، جولائی ۲۰۰۵ء
غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء
فہمیدہ کبیر، اردو ناول میں عورت کا تصور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، بار اول، ۱۹۹۲ء
قرۃ العین حیدر، کارِ جہاں دراز ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء
قرۃ العین حیدر، سفینۂ غمِ دل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۷۵ء
قمر رئیس، ڈاکٹر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء
کاظم علی جوان، شکنتلا، مجلس ترقی ادب، لاہور، بارِ اول، ۱۹۶۳ء

مبارک علی، ڈاکٹر، قدیم مصری عورت، (سہ ماہی تاریخ) فکشن ہاوس کا کتابی سلسلہ -۳، ۱۹۹۹ء
محسن الملک، نواب، محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس (دسواں اجلاس) شاہجہاں پور، ۱۸۹۵ء
محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی تنقید، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء
ملک حسن اختر، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور: ابلاغ ۱۹۹۶ء
نذیر احمد، ڈپٹی، مراۃ العروس، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
نذیر احمد، ڈپٹی، فسانہ مبتلا، تعریف پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۵ء
نذیر احمد، ڈپٹی، لکچروں کا مجموعہ، ج-دوم، بار دوم، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۸ء
نور الحسن نقوی، ڈاکٹر، سر سید اور ہندوستانی مسلمان، علی گڑھ ایجو کیشنل ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء
نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء
وحید کوثر، ڈاکٹر، اردو ناولوں میں تعلیمی تصورات، اعجاز پریس، حیدر آباد، ۱۹۸۷ء
وسیمہ سلطانہ، ڈاکٹر، نذر سجاد حیدر کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۵ء
وقار عظیم، سید، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، جولائی ۱۹۶۰ء
ہادی رسوا، مرزا، ذات شریف، اشرفی بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۱۲ء
ہادی رسوا، مرزا، شریف زادہ، اردو بورڈ، دہلی، ۱۹۷۷ء
یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، نیشنل بک ڈپو، حیدر آباد، دسمبر ۱۹۷۳ء

انگریزی کتب:

Akhtar, shaista critica; survey of the development of urdu novel and short story ,London,London’s Green,1945
Cowan, minna Education of women of india,New york,1912
Mathur,Y.B Growth of muslim politics in India,Dehli,Pargati publication,1979
Partha chaterji, The Nation and its Women in A Subaltern studies reader 1986-1995, ed.University of Minnesota press,1997
David damrosh,How to study world Literature(second edition) John Wiley & Sons Ltd,Hoboken,2018

رسائل:

خاتون، مطبع فیض عام، علی گڑھ، جون ۱۹۰۵ء

خاتون، مطبع فیض عام، علی گڑھ، اپریل ۱۹۰۸ء

عصمت، سالگرہ نمبر، جولائی ۱۹۶۴ء

عصمت، جولائی ۱۹۳۹ء

تہذیب نسواں، دار الاشاعت پنجاب، لاہور جولائی ۱۹۳۵ء

ویب سائٹس:

https://www.rekhta.org/ebooks
https://daryaft.numl.edu.pk/